اسلامی معاشیات
۱
دارالاشاعت

اسلامی معاشیات

حضرت سید مناظر احسن گیلانیؒ

ناشر

دارالاشاعت

مقابل مولوی مسافرخانہ ○ اُردو بازار، کراچی ۱

طباعت:
ناشر- دارالاشاعت کراچی ۱

ملنے کے پتے:
دارالاشاعت اردو بازار کراچی ۱
مکتبہ دارالعلوم - کورنگی - کراچی ۱۴
ادارۃ المعارف کورنگی - کراچی ۱۴
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور ۲
مکتبہ برہان اردو بازار کراچی ۱

فہرست

باب اول

اسلامی معاشیات

باب دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فاتحۃ الکتاب

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

"اسلامی معاشیات" کے نام سے یہ کتاب آپ کے سامنے پیش ہو رہی ہے جس کے متفرق ابواب مختلف مقالوں کی شکل میں ہندوستان کے بعض علمی مجلات (معارف اعظم گڑھ، سیاست حیدرآباد دکن وغیرہ) میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ہر چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر رسالے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اردو ہی نہیں بلکہ عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی تھی، گویا ایک بالکل نئی راہ تھی جس پر چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ بظاہر مضمون کی ندرت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ عموماً اہل علم ونظر کی طرف سے مقالات کے اس سلسلہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ قدیم وجدید دونوں حلقوں سے مصنف کی کافی ہمت افزائیاں ہوئیں۔ بلکہ ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی ہمت انہی غیر معمولی قدر فرمائیوں نے پیدا کی۔

جن مسائل ومباحث کو اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہی تو صدیوں بکھری چیزیں کتابوں ہی میں ہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات کے بحر محیط سے ان ہی موتیوں کا چننا اور چن کر اس طریقہ سے ان کو مرتب کرنا کہ انسانی معاشیات کے دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اسلام کا بھی ایک مستقل معاشی نظام لوگوں کے سامنے آجائے یہ ظاہر ہے آسان نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ باوجود اس کوشش کے جو اس راہ کی پہلی اور ابتدائی کوشش ہے۔ مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ ابھی اس کی دشواریاں باقی ہیں اور بہت زیادہ باقی ہیں۔ صحیح معنوں میں وہی آدمی اس راہ میں کامیاب ہو سکتا ہے جو ایک طرف فنی طور پر عصر حاضر کے جدید علم (معاشیات) کا ماہر ہو اور دوسری طرف اسلامی حقائق ومسائل کے حقیقی سرچشموں تک اس کی رسائی ہو۔ قرآن وسنت اور ان کی روشنی میں ائمہ اسلام نے "اسلامی آئین" کو جس شکل میں مرتب کیا ہے، براہ راست ان کے مطالعہ کا اس کو موقع ملا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ تعلیمی نظام کی خرابی اب تک اس قسم کی جامع قابلیت رکھنے والوں کی پیدائش میں خدید رکاوٹ کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات پہلا تعلیمی ادارہ ہے جس میں ان تعلیمی مافات کی تلافی کی کوشش ایک حد تک کی گئی ہے اور جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کی طرف قدم اٹھایا جا رہا ہے

اگرچہ رفتار ویسی کہ چاہیئے بوجوہ مختلف تیز نہیں ہے۔
تاہم مستقبل میں اگر کچھ توقع کی جاسکتی ہے تو اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد ہی سے کی جاسکتی ہے۔

سچ پوچھیئے تو جیسی بُری بھلی ناقص اور ادھوری شکل میں یہ کتاب بھی جو مرتب ہوسکی ہے وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبۂ دینیات کے تعلیمی ماحول ہی کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے متفرق ابواب جس وقت شائع ہونے کے لئے پریس میں دیئے گئے تھے اسی وقت بھی میں نے اس کا اظہار کیا تھا کہ شعبۂ دینیات کے ایم۔اے میں ایک امیدوار عزیزی مولوی محمد یوسف الدین ایم۔اے سلمہٗ نے اپنے امتحانی مقالہ کا عنوان اسی مضمون کو قرار دیا تھا۔ اور ان کے اصرار سے خاکسار نے ان کی اس مہم کی نگرانی کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ میری یہی نگرانی بنی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ برادر موصوف نے نہ صرف ایم۔اے کے امتحانی مقالہ کے تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی، بلکہ ایم۔اے پاس ہوجانے کے بعد سے باقاعدہ مجلس تحقیقات علمیہ (ریسرچ بورڈ) کی زیر نگرانی اسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے بھی مقالہ تیار کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔ شعبۂ معاشیات کے صدر استاد جلیل ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب پی۔ایچ۔ڈی کی خصوصی امداد اور تھوڑی بہت خاکسار کی رہنمائی میں انہوں نے "اسلام کے معاشی نظریئے" کے عنوان سے دو ضخیم جلدوں میں ڈاکٹریٹ کے اس مقالے کو مرتب کرکے مجلس کے سامنے پیش بھی کردیا ہے۔ عنقریب اس کا نتیجہ بھی شائع ہوجائے گا۔ ایک طرف تو اس سلسلہ میں ان کا یہ کام مکمل ہوگیا اور دوسری طرف خاکسار کو بھی اس راہ میں جو چیزیں ملیں وہ اس کتاب کی شکل میں پیش ہو رہی ہیں۔ پس ڈاکٹریٹ کا وہ مقالہ جو برادر موصوف نے مرتب کیا ہے اور خاکسار کی یہ کتاب ہر دونوں کے دونوں کام شعبۂ دینیات ہی کے خصوصی نظام تعلیم ہی کے ثمرات قرار پاسکتے ہیں گویا ان دونوں کاموں کی راہ سے اردو زبان میں ایک قطعی جدید علم جدید سرمایہ اور اس سرمایہ کا کافی ذخیرہ انشاء اللہ مہیا ہوجائے گا۔ اور یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ آئندہ اس راہ پر کام کرنے والوں کے لئے شعبۂ دینیات اور اس کے ماحول کی یہ خدمت ایک اچھے مقدمہ کا کام دے گی۔

اس موقعہ پر اس کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ گو کہنے کی حد تک تو یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع پر ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ افادہ کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کام بجائے خود اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔
ہم کہہ سکتے ہیں کہ "اسلامی معاشیات" کے مطالعہ کرنے والے ان میں سے کسی ایک کتاب کو دیکھ کر دوسرے کے مطالعہ سے بے نیاز اور مستغنی نہیں ہوسکتے۔ برادر موصوف کے

سامنے قرآن کے متعین ہیں، لیکن خاکسار نے کن لوگوں کو پیش نظر رکھ کر کام کیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کچھ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اس کتاب کے جن ابواب کو مقالوں کی شکل میں اب تک شائع نہیں کرایا گیا تھا اور ان کی ضخامت بھی کافی ہے۔ ان ابواب میں نہ صرف اسلام کے معاشی نظام کے بعض اساسی کلیات ہی ملیں گے بلکہ قرآنی آیتوں کے ایک بڑے حصے کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی دفعہ اس کی تفسیر اور ان کے مطالب کے متعین کرنے کی اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ روزمرہ ہم قرآن کی جن آیتوں کی سرسری طور پر تلاوت کرتے ہیں غور کرنے کے بعد ان میں کیسے عجیب و غریب حقائق و اسرار پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ فقیر کے نزدیک کتاب کا یہ حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ناظرین سے امید ہے کہ ذرا اہتمام کر توجہ کے ساتھ کتاب کے اس حصہ کا مطالعہ فرمائیں گے۔ گویا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فنی حیثیت سے علمائے معاشیات کی نگاہوں میں خواہ یہ کتاب اہمیت حاصل کرے یا نہ کرے، لیکن قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کو انشاءاللہ اس کتاب کے ذریعہ سے بعض ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جو اس کے سوا شاید اور کہیں نہیں ملیں گی اور قرآن کے ایک خادم سے سچ پوچھیئے تو اسی قسم کی خدمات کی صحیح توقع کرنی چاہیئے معاشیات نہ میرا تعلیمی مضمون ہے اور مجھے اقرار کرنا چاہیئے کہ اس فن کے مطالعہ کا بھی تھوڑا بہت موقعہ اگر مجھے کچھ ملا ہے تو اس کی حیثیت بالکل ایک سرسری اور ابتدائی مطالعہ کی ہے اور وہ بھی دارالترجمہ سرکار عالی کا صدقہ ہے[1] کہ اس کی بعض ترجمہ کرائی ہوئی کتابوں تک میری رسائی ہوسکی تھی۔ اور اب اس کا افسوس ہوتا ہے کہ بجائے قدیم طریقہ تعلیم کے اپنی تعلیمی زندگی میں کاش! مجھے بھی کسی ایسے ادارے میں پڑھنے کا موقعہ ملتا جیسا کہ جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات ہے، تو غالباً اس ناقص کام کو زیادہ بہتر اور مکمل شکل میں پیش کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہوتا۔ لیکن بالکلیہ ہمارے قدیم نظامی درس کے ایک مستفید کی طرف سے جو کچھ بھی جس صورت میں یہ ہدیہ پیش ہو رہا ہے۔ میری معذوریوں کو سامنے رکھ کر کوتاہیوں سے لوگ چشم پوشی کریں گے۔ یہ ایک رُخ کی بات ہے جو ایک رُخی تعلیم کے ایک طالب العلم کی طرف سے پیش ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ اسی کو سامنے رکھ کر کام کرنے والے اس کام کو تدریجاً مکمل کریں گے۔ تاآنکہ "معاشیات" کی دنیا میں "اسلامی معاشیات" بھی اپنی ایک مستقل جگہ اور

---

[1] علاوہ دارالترجمہ سرکاری کی کتابوں کے پروفیسر الیاس برنی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی بعض کتابوں اور مقالات کے پڑھنے کا بھی موقعہ اس سلسلہ میں مجھے ملا ہے۔ اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ اپنے برادر عزیز مولوی سید [illegible] گیلانی ایم۔اے [illegible] کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان ہی کے [illegible] کے بعد مجھے بعض ضروری معلومات کے اظہار کی جرأت ہوئی۔ [illegible]

وغیرہ حیوانی، بحری و بری سواریوں کے ذریعہ مواصلات و حمل و نقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت و حرفت کے اس کے مختلف بسیط و مرکب سادہ اور پیچیدہ شعبے مثلاً آہن گری، نجاری، زرگری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معماری، سنگ تراشی، کان کنی، غواصی، مزدوری، مزدوری کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمت، کاروباری تنظیم وغیرہ وغیرہ تقریباً وہ ساری چیزیں جن سے بعض معاشی علماء نے معاشی نقشے مرتب کر کے اہل علم سے داد حاصل کی ہے، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان نقشوں کی خانہ پری صرف قرآنی آیات سے اگر کوئی کرنا چاہے تو مشکل ہی سے کوئی خانہ خالی رہ سکتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان امور کی طرف بجائے وحی اور نبوت کے آدمی کی رہنمائی عقل و حواس سے کی گئی ہے، اسی لئے قرآنی آیات میں ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے ضمناً ہی آیا ہے۔ تاہم اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاشی امور سے قرآن تعلق کو کتنا قریب رکھنا چاہتا ہے۔

زراعت و باغبانی کے ساتھ قرآن کا خصوصی تعلق

علی الخصوص زراعت و باغبانی کے متعلق تو قرآنی اشارات کی نوعیت ضمنی مباحث سے بھی زیادہ نظر آتی ہے۔ حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا ہے، خصوصاً قریش تک، ظاہر ہے کہ ان کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا لیکن باوجود اس کے بار بار مختلف پیرایوں میں قرآن ابر و باد، برق و رعد، لواقح (حاملہ یا بار دار بنانے والی ہوائیں) بارش اور ان کے ساتھ کسانوں کے جذبات، خوف و طمع کا جو تعلق ہوتا ہے مسلسل ذکر کرتا چلا جاتا ہے، لہلہاتی کھیتیوں، ہرے بھرے باغوں، ان کے مختلف موسمی حالات کا تذکرہ اس کتاب میں دہرا دہرا کر اس طرح کیا گیا ہے کہ بسا اوقات خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کتاب کا خطاب زیادہ تر ان ہی لوگوں سے ہے جو کاشتکاری اور باغبانی کے پیشوں میں مشغول ہیں۔ لوگوں کا قرآن کے متعلق خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن میرا ذاتی رجحان تو یہی ہے کہ گویا اس راہ سے مسلمانوں میں انسانی معاش کے اس اہم باب سے گونہ زیادہ مناسبت[1] پیدا کرانا شاید یہ بھی مقصود ہے۔

معاش گریز رجحانات کے متعلق قرآن کا ایک تاریخی بیان

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی خطاب کا جو دائرہ ہے، رہبانیت

[1] بخاری میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس میں ہے کہ آلات کشاورزی کو دیکھ کر حضور نے فرمایا کہ جس گھر میں یہ داخل ہوتے ہیں، وہاں ذلت داخل ہوتی ہے۔ [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا [illegible] ظاہر ہے کہ گھروں میں آلات کشاورزی یا مواشی وغیرہ جیسے گندگی و عفونت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے داخل کرنے [illegible] ہے۔ اسی زمانے میں یہودیوں [illegible] کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ [illegible] ہندوستان کے ہندوؤں کا قاعدہ ہے [illegible] کھیتوں کی ساری [illegible] گھروں [illegible] زمین تک کو [illegible] سے فرمایا [illegible] ہے۔ ۱۲

جیسی معاش گریز زندگی والے میں نہیں سمجھتا کہ اپنے لئے اس دائرے میں وہ کہاں گنجائش نکال سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ معاشی زندگی کا جو نقشہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس میں ان کے لئے گنجائش نہیں ہے، بلکہ خود قرآن نے اس غیر فطری مسلک کے متعلق جس تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی جس قوم کو جس زمانہ میں جو دین بھی دیا گیا، کسی دین میں رہبانیت کے معاش گریز مسلک کا مطالبہ خدا کی طرف سے کبھی نہیں کیا گیا۔ گویا تو رہبانیت کی مذمت صرف اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بنی آدم کو خدا کی طرف سے جو دین بھی ملا ہے کسی میں اس کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ قرآن میں اس مسلک کے متعلق جو مشہور الفاظ پائے جاتے ہیں

ورهبانية ابتدعوها ما كتبناها	رہبانیت جسے انھوں نے خود تراش لیا
عليهم فما رعوها حق رعايتها	نہیں فرض کیا ہم نے اس کو ان پر، پھر
فآتينا الذين آمنوا منهم أجرهم	نگرانی نہ کی انھوں نے رہبانیت کی ویسی
وكثير منهم فاسقون (الحدید ۳/۲۷)	کی جیسی نگرانی انھیں کرنی چاہئے تھی پھر

دیا ہم نے ان کے ایمانداروں کو ان کی مزدوری۔ اور بہتیرے ان کے فاسق ہیں۔

رہبانیت کے تاریخی عمل کا تجزیہ

دیکھنے میں تو بظاہر گنے چنے چند الفاظ ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس آیت کا ایک ایک ٹکڑا "رہبانیت" کی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ مثلاً پہلا جزء "ابتدعوها" (ان لوگوں نے خود تراش لیا) ظاہر ہے کہ رہبانیت کو بجائے کسی دین اور مذہب کے ان نظریات میں شامل کر دیتا ہے جو براہ راست انسانی غور و فکر کے مرہون منت ہیں، گویا یہ ایک قسم کا فلسفہ ہے، مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف حالات و مؤثرات سے متاثر ہو کر کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گذارنی چاہی ہے۔ تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ یونانیوں اور رومانیوں کے رواقیین و اشراقیین، اسکندریہ کے فلاطونیین، ہندوستان کے جوگی وغیرہ نے فلسفہ کے ایک مکتب خیال کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔

دوسرا جزء "ما كتبناها عليهم" (یعنی ہم نے اس نظریہ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہیں کیا) جس کا یہی مطلب ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین، دھرم وغیرہ کے ناموں سے عطا ہوا ہے ان میں اس غیر فطری نظریہ حیات کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا، اس جزء سے صرف اسلام ہی کی براءت رہبانیت سے ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی دین، براہمی مذہب ہو یا بدھ کی دعوت۔ کسی کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ قرآن کے اس تاریخی بیان کو پڑھنے اور ماننے کے بعد مجھے ان بزرگوں پر تعجب ہوتا ہے جو کبھی عیسائی یا کسی اور دین کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ شاید ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے گویا کسی دین میں کبھی اس قسم کی راہبانہ زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کے نص صریح کے خلاف یہ دعویٰ نہیں ہے؟

تیسرا جزء "فما رعوها حق رعايتها" یعنی جن لوگوں نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصول حیات تسلیم کر کے

اسی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے، قرآن کا یہ تاریخی بیان ہے کہ اس میں بھی جیسا کہ چاہیے تھا کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا، جس کی وجہ ظاہر ہے، بعض خاص حالات مثلاً شدید ناکامی یا کسی سخت شخصی یا اجتماعی حادثہ سے متاثر ہو کر بعض زہاد (شدید الانفعال نفوس) دنیا اور دنیاوی تعلقات سے دل کو سرد کر کے اس قسم کی خیالی اور صرف خیالی زندگی کا نقشہ لے کر ایک حد تک (عملاً) کر لیتے ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو جن فطری قوانین میں آدمی کی جبلت جکڑی ہوئی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ان قوانین سے مسلسل جنگ میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت اور قوانین قدرت سے جنگ چھیڑ دینے کے بعد کسی انسان کامیابی کی جاہلی توقع کر سکتا ہے؟ کامل استقلال اور غیر معمولی ضبط سے بھی اگر کام لیا جائے پھر بھی پوری کامیابی قطعاً ناممکن ہے، اور یہی خبر قرآن ان کے متعلق دیتا ہے۔

پس عطا کیا فآتینا الذین آمنوا منہم اجرہم "یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں۔ ان کو اپنی مزدوری مل جاتی ہے۔" لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا جن غیر فطری مشقتوں کو وہ برداشت کرتے ہیں، ان میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے، اس کی مزدوری ان کو مل جاتی ہے؟ بظاہر یہی خیال گزرتا ہے لیکن اگر واقعی قرآن کا یہی مطلب ہوتا تو چاہیے تھا کہ الذین آمنوا (یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں) کی جگہ کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی کہ ان میں جن لوگوں نے اس اصول کی نگرانی کی یعنی (الذین رعوہا) انھیں ان کا اجر دے دیا گیا، مگر جب یہ اسلوب بیان نہیں اختیار کیا گیا، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو صرف اپنے ایمان کا معاوضہ ملتا ہے۔ باقی جن غیر فطری مشاغل اور حالات میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے جو دکھ اور مصیبت وہ اٹھاتے ہیں، چونکہ وہ خدا کی مرضی اور مطالبے کے تحت نہیں، بلکہ اپنی خواہش اور اپنی مرضی یا اپنے خود تراشیدہ فلسفہ کے زیر اثر اٹھاتے ہیں، اس لئے خدا کے پاس اگر اس کا کچھ اجر ہو، تو عقلاً و دیناً اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، پس اس کو جو کچھ ملے گا ایمان کے تحت ملے گا۔ اور یہ حال تو ان کا ہے جو اپنی زندگی میں ایمان اور ایمانی تقاضوں پر قائم بھی رہے ہوں، ورنہ اس کے بعد آیت کا آخری جز "کثیر منہم فاسقون" (یعنی ان میں اکثر و بیشتر فاسق ہو جاتے ہیں) یہ تو پورے ملک کی شرافت اور رہبانیت کے آخری انجام کی ایسی رپورٹ ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے خانقاہ و خرکے دفتر درکار ہیں، کلیسا اور یورپ کی تاریخ کا پورا نامہ، نیز ہندوستان کے جوگیوں، بیراگیوں، بھکشوؤں، ملنگوں، اگھوریوں وغیرہ کے ہزار ہا ہزار سال کے ناگفتہ بہ حوادث و واقعات دہرانے پڑیں گے۔

معاش گریز رجحانات کا آخری انجام فسق ہے

کہا ہے کہ قدرتی قوانین سے جنگ کرنے کا آخری انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے قرآن کی ترتیب کا بھی یہی اقتضا ہے کہ ابتداء میں جو اپنے آپ کو اس زندگی میں ڈالتے ہیں [illegible] کے تحت ایک حد تک وہ تو نباہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انھی بے چاروں کی ظاہری شکل و صورت اختیار کر کے جو ان کے جانشین بنتے ہیں، چونکہ ان تاثرات سے وہ قطعاً خالی ہوتے ہیں، بلکہ عام طور پر عوام میں اس عجیب و غریب زندگی رکھنے والوں کے متعلق جو حسن ظن پایا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اس گروہ میں وہ شریک ہو جاتے ہیں، اس لئے ظاہری اور بناوٹی شکل و صورت جس سے بظاہر ترک دنیا کا یہ اعلان کرتے ہیں، اسی کو پوری

طاقت کے ساتھ حصول دنیا کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، جس کے یہ جانشین ہوتے ہیں، عوام کا ان کے ساتھ جو دینی حسن ظن باقی رہتا ہے، اس کے پردے میں یہ جو کچھ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا نمایاں جرم چونکہ ان کا معاشی جرم ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کے اکتسابی مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر ایک طرف تو توانائیوں کے اس سارے سرمائے کو جو قدرت انھیں عطا کرتی ہے، ساکن اور ضائع کر دیتے ہیں، اور ٹھیک کسی عضو کے ناسور کا جو حال ہوتا ہے کہ خون حیات کو پیپ اور ریم بنا بنا کر ضائع کرتا رہتا ہے، اور دوسری طرف ایسے اعضا جو اس کے قریب ہوتے ہیں، ان کی غذا بھی کھینچتا رہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے بے چارے عوام کے گاڑھے پسینوں کی کمائی کو مختلف حیلوں سے چوستے رہتے ہیں کہ ان سے یہ جو کچھ لیتے ہیں، اس کے معاوضے میں ان کو کچھ نہیں دیتے، جنتر منتر ڈھکوسلے جن سے ان کا ضمیر خود بھی واقف ہوتا ہے، ان بے چاروں کی تسلی کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ اکتسابی جرم ہے کہ ان کے دوسرے بعض بدترین فاسقانہ جرائم سے خاموشی اختیار کرنے کے باوجود قرآن نے نہایت تیز و تند لہجے میں ان کے اس جرم کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے۔

ان کثیرا من الاحبار والرہبان	بہت سے احبار (یہودی علماء) اور رہبان
لیأکلون اموال الناس بالباطل	(عیسائی مشائخ) کھاتے ہیں لوگوں کا مال بیجا
ویصدون عن سبیل اللہ والذین	باطل (طریقوں) سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ
یکنزون الذہب والفضۃ	سے، اور جو جمع کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی
ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ	نہیں خرچ کرتے اس کو اللہ کی راہ میں تو تم
فبشرہم بعذاب الیم۔	خوشخبری سنا دو دکھ دینے والے عذاب کی اس دن
یوم یحمی علیہا فی نار جہنم	تپایا جائے گا اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ
فتکوی بہا جباہہم وجنوبہم	میں پھر داغا جائے گا اس سے ان کی پیشانیاں
وظہورہم ہذا ما کنزتم	اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں، یہ ہے
لانفسکم فذوقوا ما	جو تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے، پس چکھو مزا اس کا
کنتم تکنزون۔ (التوبہ ع ۵)	جو کہ تم نے جمع کیا تھا

"آکلِ اموال الناس بالباطل" جس کا عام مطلب یہی ہے کہ کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال کھا جانا، اس الزام کو قرآن ان پر عائد کر کے ایک اہم معاشی اصول کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جس کا ذکر دوسرے مقامات میں متعدد بار کیا گیا ہے۔ یعنی بظاہر قرآن کا یہ نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی اپنی جگہ نظام جسدی کی خدمت انجام دیتا ہے، اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو کاٹ کر جسم سے الگ کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعتی جسم کا جزء بن کر فرد کو جینے کا حق عمومی طور پر اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح وہ دوسرے فرد سے نفع اٹھاتا ہے۔ اسی طرح چاہئے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق یہ بھی دوسروں کو خواہ کسی شکل میں ہو نفع پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ عام معاشی نظام کی بنیاد اسی داد و ستد پر رہتی ہے

زمانہ تھا خصوصاً یورپ اور ہندوستان کا یہ وہ عہد تھا جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں اس طرح دبوچ لیا تھا کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ یورپ میں تو "اعترافِ جرم" کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشواؤں کو مل گیا تھا کہ ہر عامی اپنے جرائم کا پادری کے سامنے اقرار کرکے بظاہر خدا کی گرفت سے تو سمجھتا تھا کہ اسے نجات مل گئی لیکن درحقیقت وہ پادریوں کی گرفت میں آجاتا تھا۔

پھر سلاطین کا کلیسا کے نیچے اس طرح دب جاتا کہ گویا پوپ کے فرمان کی خلاف ورزی قریب قریب حکومت سے دست برداری کے مترادف بن چکی تھی، نیز خدا کی رحمت کا عام بیوپار کلیسائی نظام میں عام طور سے جو جو کچھ ہوتا تھا اور اس میں آئے روز خدا کی رحمت کو پادری عام طور سے بیچ رہے تھے۔ آسمان پر وہی کھولا جاتا تھا جسے زمین پر پادری کھولتے تھے۔ اور وہی آسمان پر باندھا جاتا تھا جسے پادری زمین پر باندھتے تھے، یہ اور اسی قسم کی بیسیوں ترکیبیں تھیں جن کے ذریعے عوام کی کمائی پر کلیسا اور کلیسا کے خاندانوں کا پورا اقتدار قائم تھا جس طرح جس کسی سے جس قدر جس وقت چاہتے تھے، عیسائی مذہب کے یہ احبار (علماء) اور رہبان ومشائخ وصول کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ دبیز ہو چکے تھے، معمولی معمولی گرجے میں لاکھوں کی دولت بصورت کنز جمع رہتی تھی، مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلے میں فوجی مصارف کی جب ضرورت ہوئی، اور شاہی خزانہ ان مصارف کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو روم کے اس قیصر کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد چرچوں اور گرجوں ہی سے ملی، تقریباً یہی حال ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں نے پیدا کر رکھا تھا، خود محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ہاتھ آیا تھا، وہ ہندو مذہب کے احبار و رہبان کی کنز کی ہوئی دولت ہی تھی۔ اس زمانے میں بھی زار کی حکومت پر انقلاب برپا کرکے جب اشتراکیوں نے اقتدار حاصل کیا تو کون نہیں جانتا کہ شاہی خزانوں اور امراء کے اندوختہ دولت کے ساتھ بالشویک حکومت کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روسی گرجوں ہی سے ملی۔ والقصہ بطولہا۔

بہرحال تاریخ کے ان واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور مل سکتا ہے۔

"ترکِ دنیا" اور "حصولِ دنیا" کا آلہ بنا کر زندگی گذارنے والوں کا زور اگرچہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر ملت و مذہب میں ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والوں کا تقریباً دنیا کے ہر خطوں اور ملکوں میں موجود ہے اور گو اب المذہب والفضل کی ریل پیل کا حال ان کے یہاں اس پیمانہ پر تو نہیں ہے، جو کبھی تھا، تاہم ان کے بعض مریدوں اور ورثوں میں عہد ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہیں۔ سب کی لمبی بحثوں کا پسینہ بنا کر کیا ہیں۔ اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لیے دیئے لوگ دھرے بیٹھے وصول کرتے رہیں، اس سے مراد یہی نہیں کہ ان کی اکتسابی قوتیں اپنے افرادی اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسل قبروں میں دفن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے اس عجیب

غریب پیشے اور آسمان روزگار کو دیکھ کر کتنے دلوں میں ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہے خدا ہی جانتا ہے کہ اس میں کتنے جلتے ہیں کہ دو فریب خدع اور دجل کے جالوں میں کتنے غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنس کر اپنی محنت کی پونجی کے منہ سے نوالوں کو چھین چھین کر ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا اور ہو رہا ہے، چونکہ خدا اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے کیا تعجب ہے کہ جن سزاؤں کا ذکر قرآن میں ان کے متعلق کیا گیا ہے اگر آخرت میں ان کے یہ مستحق ہوں تو خدایہ ان کے حق میں یہ زیادتی نہ ہوگی، آخر کچھ تو مصلحت ہے کہ احبار و رہبان کی اکثریت جس "اکل بالباطل" کی مرتکب ہے۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان سزاؤں کا حق تعالیٰ نے یہاں کیوں "تذکرہ فرمایا"۔

اسلام کے مذہبی خدام کی خصوصیت

شاید قرآن کے اسی طرز عمل کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقہ کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت و امانت سے صرف کرتا تھا، اور اس لئے جوامراء اسلامی حکومت یا عام مسلمانوں سے ان کو ملتی تھی یہ "اکل بالباطل" (یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال کھانا) نہ تھا، لیکن قرآن کی انہی دھمکیوں سے غالباً وہ اتنے متاثر تھے کہ اس اندوختہ کا لینا بھی انھوں نے پسند نہیں فرمایا۔ اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لئے وہ دوسرے دھندے اختیار کرتے۔ اکبر کے دربار میں جب مقامات اسلام پر تنقید شروع ہوئی۔ تو صفت خود برہمنوں اور سادھوؤں کو جس دربار میں ہر قسم کے انعام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اسی دربار کا مشہور وزیر ابوالفضل اسلامی فقہاء کے متعلق کہا کرتا کہ "بوریے کا ٹکڑے دینے والے، مشائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا"۔ اشارہ اسلام کے ان علماء اور فقہاء کی طرف تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابوالفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب بن کے جمع رہا تھا فیا للعجب!!

بہرحال احبار و رہبان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گندے و ناگفتہ بہ حالات اور عادات میں مبتلا تھی لیکن سب کی طرف رو (کثیر منہم فاسقون) کے اجمالی اشارے پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اسی ہی معاشی جرم یعنی "اکل اموال الناس بالباطل" کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی مہمات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے، حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں، اس طبقہ کے دوسرے جرائم کچھ کم ہولناک اور خطرناک نہ تھے۔

معاشی مسائل کی اہمیت حدیثوں میں

یہ تو معاشی مسائل کے ساتھ قرآن کے تعلق کا حال ہے۔ داعیٔ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات اس باب میں آپ کے جس طرز عمل کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے اس کا ذخیرہ تو اتنا زیادہ ہے کہ سب کا ذکر کیا جائے تو وہی ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مذہب کے غلط نمائندوں نے مذہب کے متعلق یہ عام کیفیت جو پیدا کر دی ہے کہ ادھر مذہب کا نام آیا اور دنیا کی نفرت، دنیاوی چیزوں کی عداوت میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہوا۔ خیال یہی پھیلا ہوا ہے کہ دنیا اور دنیاوی امور سے اپنے

ماننے والوں کو جو مذہب جس حد تک عقیدۃً رکھتے ہیں کامیاب ہو وہی مذہب کا کمال ہے۔ لیکن آج یہ کون باور کرنے کے لئے تیار ہوگا کہ کوئی سیاسی لیڈر یا معاشی ریفارمر نہیں، بلکہ جو اپنے آپ کو انسانی تاریخ کے تمام دینی داعیوں اور رسولوں کا خاتم اور اپنی تعلیم کو سارے جہان کے مذہبی ذخیروں کے صحیح عناصر کا خلاصہ اور سب کی تکمیل کرنے والا قرار دیتا تھا، دنیا کی یہی سب سے بڑی اور دینی ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے اپنی امت کو پیش کرتے ہوئے التجا کرتا ہے۔

امت کی معاشی خوشحالی کے لئے پیغمبر کی دعا

اللھم انھم حفاۃ فاحملھم اللھم انھم عراۃ فاکسھم اللھم انھم جیاع فاشبعھم۔

پروردگار! یہ لوگ پیادہ ہیں (یعنی سواری نہیں رکھتے) انہیں سوار کیجئے، پروردگار یہ ننگے ہیں، انہیں پہنائیے، پروردگار! یہ لوگ بھوکے ہیں، انہیں سیر کیجئے۔

مسلمانوں کی معاشی پریشانی کو دیکھ کر پیغمبر کا پریشان ہو جانا

اس کے سامنے کچھ لوگ اسی لباس میں جس میں بعض مذاہب کے ماننے والے رہبانہ مذہبی بزرگی کی دلیل ہے یعنی کمبل بدن پر ڈالے ننگے پاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ صحابیؓ سے مروی ہے کہ ان کمبل پوشوں پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مبارک کا پڑنا تھا کہ

فتمعر وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم (مسلم)

اُداس پڑ گیا چہرۂ اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ معاً ان لوگوں کے اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندرون خانہ میں تشریف لے گئے (شاید کوئی چیز ڈھونڈنے) پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو جمع کرو، لوگ جمع ہوئے۔ ان غریبوں کی امداد پر لوگوں کو آمادہ فرمایا گیا، اور کافی امدادی سرمایہ جمع ہو گیا، جو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ حضرت جابرؓ ہی راوی ہیں کہ وہی چہرۂ مبارک جو ابتک ان غریبوں کے دیکھنے کے بعد اداس پڑ گیا تھا۔

فرأيت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتهلل كانه مذهبة۔

پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کو دیکھا کہ سونے کی طرح دمک رہا ہے۔

خوشحالی کو دیکھ کر پیغمبر کے چہرے کا دمک اٹھنا

چہرۂ مبارک سونے کی طرح دمکنے لگا! محض اس لئے کہ کچھ لوگ معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے، ان کی یہ پریشانیاں اس تدبیر سے دور ہو گئیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ پہلو جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، نبی الانبیاء خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احساسات طیبہ اسی پہلو کے متعلق کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

اپنی آپ مدد پر لوگوں کو آمادہ کرنا

اور یہ طریقہ کہ اس قسم کے لوگوں کی امداد دوسروں سے کرائی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں خاص فوری ضرورتوں کے موقعہ پر کبھی کبھی یہ تدبیر بھی اختیار کی جاتی تھی، ورنہ اس احساس کے ساتھ ساتھ جس کا سراغ مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری خصوصیت

یعنی کو بجائے دوسروں کے خود صاحب ضرورت کو آپ آمادہ فرماتے کہ اپنی دشواریوں کو وہ اپنی ہی توانائیوں کے ذریعے سے حل کرے، جو قدرت نے آدمی میں اسی لئے پیدا فرمائی ہیں، حدیثوں میں اس مشہور واقعہ کا ذکر آتا ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کچھ امداد کے طالب ہوئے، وہی جو ابھی ایک جماعت کو کافی امداد دوسروں سے دلا چکا تھا، ایک شخصی ضرورت کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار فرمایا جاتا ہے دیکھنے کے قابل ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نہ خود اپنے پاس سے کچھ دینے کی کوشش کی نہ دوسروں سے دلوایا، بلکہ ضرورت مند صاحب کو فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ تمہارے پاس آخر کوئی چیز ہے؟ وہ بیچارے اتنے غریب اور نادار تھے کہ جواب میں انہوں نے عرض کیا، میرے پاس صرف ایک ٹاٹ ہے جس کے ایک حصہ کو اوڑھتا ہوں، اور دوسرے کو بچھاتا ہوں اور اس کے سوا ایک پیالہ بھی ہے جس میں پانی پیتا ہوں، ظاہر ہے کہ افلاس اور ناداری کی یہ انتہا ہے۔ لیکن جو معاشی قوتوں کو ابھارنے اور ان کی قیمت پیدا کرنے کے لئے ہی مبعوث ہوا تھا، دنیا کے وہی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس صاحب کو حکم دیتے ہیں کہ جاؤ اسی پیالے اور ٹاٹ کو لے آؤ، جو دنیا کو اس کی آخری کتاب دینے آیا تھا، اگر ایک دن اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی، تو اسی دستِ مبارک میں آنکھوں نے دیکھا کہ غریب صاحب کا ٹاٹ اور پیالہ ہے اور ٹھیک جیسے ہراج (نیلام) کرنے والے پکارتے ہیں،

من يشتري هذين[1]

ان دونوں کو کون مول لیتا ہے۔

کی صدا کانوں میں اسی دہن اطہر سے آ رہی تھی۔ جو قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو بانی ام الجنۃ کی بشارت سنا رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا۔

انا آخذهما بدرهم

میں لیتا ہوں ایک درہم میں۔

نیلام کرنے والے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے۔

من يزيد على درهم

ایک درہم پر اضافہ کون کرتا ہے۔

کے فقرے کے ساتھ قیمت کے اضافہ پر توجہ دلائی، بالآخر دو درہم پر بولی ختم ہوئی، خریدار کو ٹاٹ اور پیالہ دے کر اور دو درہم جو قیمت میں وصول ہوئے تھے، دونوں کو صاحب حاجت انصاری کے حوالے کر کے ارشاد ہوا،

اشتر بأحدهما طعاما فانبذه الى اهلك واشتر بالآخر قدوما فأتني به۔

ان میں سے ایک سے غلہ خرید کر تو اپنے گھر والوں کے پاس ڈال دیجئو، اور دوسرے سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔

حضرت انسؓ جو اس روایت کے راوی ہیں، ان کا بیان ہے کہ صاحب حاجت انصاری نے یہی کیا، اور کلہاڑی خرید کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، سب دیکھ رہے تھے جو بکھری ہوئی انسانیت کو سمیٹنے کے لئے آیا تھا، خود (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

---

[1] [illegible]

ہم یا سمجھاؤ جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن ان کے متعلق صرف یہی علم نہیں عطا کر رہا ہے کہ ان سب کی تخلیق اور ان سب کے عمل پیدائش کا تعلق حق تعالیٰ کی تنہا ذاتِ مبارک اور صرف اسی کے ارادہ قاہرہ سے ہے، بلکہ اس نے تو بار بار اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ اس تحقیقی توحید کے علم و یقین کا نقش ہر اس فطرت پر کندہ اور کھدا ہوا ملے گا جس سے یہ پوچھا جائے کہ ان سب کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ قرآن کبھی اسی سوال کو یوں دریافت کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ولئن سألتهم من خلق السماوات — اگر ان سے پوچھو گے کس نے پیدا کیا آسمانوں
والأرض ليقولن خلقهن — اور زمین کو۔

یعنی آسمان و زمین کے نظام کے متعلق اگر پوچھو گے کہ اس کو کس نے پیدا کیا، پھر خود خبر دیتا ہے۔

لیقولن اللّٰہ۔ — (ترجمہ) یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ اللہ

پھر اسی سوال کو ذرا وسعت دے کر یوں دریافت کرایا جاتا ہے۔

ولئن سألتهم من خلق السماوات والأرض — اور اگر پوچھو گے کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو
وسخر الشمس والقمر (عنکبوت) — اور مسخر کیا آفتاب و ماہتاب کو۔

یعنی اس نظام کی تخلیق ہی نہیں، بلکہ آفتاب اور اس کی روشنی و حرارت سے اسی طرح ماہتاب اور اس کی روشنی سے جو فائدے پہنچائے جا رہے ہیں یہ کون کر رہا ہے، خبر دیتا ہے کہ جواب میں دیں۔

لیقولن اللّٰہ۔ — تو شاید وہی کہیں گے کہ اللہ۔

اسی دعوے کو ذرا کشادہ کر کے سوال کی صورت یوں قائم کی گئی ہے

ولئن سألتهم من نزل من السماء ماء — اور اگر پوچھو گے تم ان سے کس نے اتارا آسمان
فأحيا به الأرض بعد موتها — سے پانی اور جلایا اس سے زمین کو اس کے
(عنکبوت ۶) — مر جانے کے بعد۔

یعنی صرف علوی اجرام کے منافع ہی نہیں بلکہ سمندروں سے بخارات بنا کر پانی کا ذخیرہ منجمد کر کے پھر اسی کو بارش کی شکل میں کھیتوں اور باغوں میں پہنچانا، مردہ زمین کو اس ذریعہ سے ہر سال نئی زندگی بخشنی، یہ سارا معاشی کاروبار کون انجام دے رہا ہے، قرآن یقین دلاتا ہے کہ اس سوال کے جواب میں بھی دیں

لیقولن اللّٰہ — تو وہی کہیں گے کہ اللہ۔

اور آخر میں تو صاف صاف الرزق جو معاشی فوائد کی گویا قرآنی تعبیر ہے اس کو بھی سوال کا جز بنا کر یوں پوچھا جاتا ہے۔

قل من یرزقکم من السماء والأرض — پوچھو کون روزی پہنچاتا ہے تم کو آسمان سے
أمن یملک السمع والأبصار ومن — اور زمین سے اور کون مالک ہے شنوائی اور بینائی کا
یخرج الحی من المیت ومن یخرج — اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا
المیت من الحی ومن یدبر الأمر — مردہ کو زندہ سے۔ اور کون بندوبست
(یونس ۴) — کرتا ہے کام کو

آسمان و زمین کے موجودہ نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے، اور یہ تو سوال ہوا۔ پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی و شنوائی، دانائی کی اعانت سے آدمی ان چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر خود حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ اور منشاء ہے، دونوں کو ملا کر یہ سوال جس کا نتیجہ ہے کہ وہ ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کر کے کون درست کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اندرونی قوتوں سے یا باہری طاقتوں سے ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کر کے قرآن دریافت کرتا ہے کہ یہ سب کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے جواب کے متعلق پھر وہی ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

لیقولن اللّٰہ — (ان سارے سوالات کے جواب میں بھی)

وہ فوراً یہی کہیں گے کہ اللہ۔

قرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کیے ہوئے ہے، قرآن ہم کو اس ایمان و ایقان پر مجبور کرتا ہے کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ صرف یہی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ اور سرشتہ ہے۔ پھر اسباب اور قدرت کے جن قوانین و ضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے ان کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹفک) طریقہ عمل قرار دیا گیا ہے تو جو پیدا کر رہا ہے، اسی سے پیداواروں کو حاصل کرنے کے لئے اس کی باتوں کا ماننا کہ ہماری مرضی پوری ہو، اس کی خلاف مرضی باتوں سے بچ کر ہی اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر چل کر اپنی غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹ اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے، گڑگڑا کر اس سے مانگنا جس کی دوسری تعبیر ایمان، عمل صالح، تقویٰ، توبہ و استغفار، دعا، التجا وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصول معاش کی اس تدبیر کو حکیمانہ تدبیر نہیں ہے، اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ، تحقیق و تجربہ کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں تو کیا دوسرے طریقے پر بھی وہی یقین وہی علم ہم کو نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا کہ قرآن انسانی جبلت کا اسے لازوال علم قرار دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

قل اللهم مالک الملک تؤتی الملک من — کہہ اے اللہ آپ ہی مالک ہیں ملک کے، دیتے ہیں
تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من — جسے چاہتے ہیں اور چھین لیتے ہیں جس سے چاہتے
تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر — ہیں اور عزت دیتے ہیں جسے چاہتے ہیں اور ذلیل کرتے
إنک علی کل شیء قدیر تولج اللیل فی — ہیں جسے چاہتے ہیں، آپ ہی کے ہاتھ میں بھلائیاں ہیں
النهار وتولج النهار فی اللیل وتخرج — آپ ہی کے ہاتھ میں ہیں، بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر
الحی من المیت وتخرج المیت من — ہیں۔ آپ ہی رات کو دن میں گم کرتے ہیں اور دن کو
الحی وترزق من تشاء بغیر حساب — رات میں گم کرتے ہیں، نکالتے ہیں آپ ہی
(آل عمران ۳) — زندہ کو مردے سے اور نکالتے ہیں مردے کو

زندے سے اور روزی پہنچاتے ہیں جسے چاہتے ہیں حساب کے بغیر۔

حیثیت بگڑنے لگتی ہے۔ بسا اوقات دیکھنے والوں میں گھن پیدا ہوتی ہے۔ شکستگی اور پژمردگی کی کیفیت قویٰ میں
میں طاری ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے، باطنی قوتوں کی ساری آبادیاں جس طرح تباہ و
برباد ہوتی ہیں قرآن ہی نے

ثم نردّہ الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا۔	پھر پلٹا دیتے ہیں ہم اس کو بدترین سن کی طرف تاکہ اس کے ہم کرتے ہیں انکار نہ جانے
جاننے کے بعد کسی چیز کا۔	

کے الفاظ میں اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ دراصل اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام ایسے ہوتے ہیں جسے وہ اپنے سامنے مکمل کرکے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں وہی ہے کہ کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ اور اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرہ پر آدم کی نسل زندگی کے جن جن شعبوں کے متعلق سہولتوں کے پیدا کرنے کی دھن میں مشغول ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار ترقی کی سست ہے لیکن عموماً پچھلی نسلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگلی نسلوں کے حساب سے بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے لیکن جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں مصروف ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس راہ میں اس نے بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ خصوصاً جب سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے آدمی قابو یافتہ ہو گیا ہے کہ پہاڑوں، دریاؤں، ندیوں، نالوں اور نشیب و فراز کے جھگڑوں سے گویا آزادی مل گئی ہے، سڑکوں، بندوں کی جھنجھٹوں کی ضرورت مسافت طے کرنے کے لئے باقی نہیں رہی بلاشبہ یہ ہوا ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ مقابلہ کرکے جب ہم دیکھتے ہیں تو سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان چڑیوں، طوطوں، میناؤں، گدھوں، چیلوں اور کوؤں کے برابر بھی تو نسل انسانی زمین کی اس انتہائی ترقی یافتہ شعبہ میں نہیں پہنچی ہے۔ اسی نقل مکانی کے مسئلہ میں پایا جاتا ہے ذرائع حرکت کے ذرائع میں وہ اونٹ کے محتاج ہیں نہ لکڑیوں کے نہ پٹرول کے اور نہ اسی قسم کی دوسری گیسوں کے جن کے بل بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے۔ اب بھی ان اجزا میں سے کوئی چیز اگر غائب ہو جائے جو ہوائی جہازوں کو اڑانے کے لئے ضروری ہیں تو آدمی کا زور ختم ہو جائے گا۔ مگر اسی کے مقابلے میں ایک معمولی مکھی، مچھر بھی جب اس کا جی چاہتا ہے صرف پروں کے کھولنے کی دیر ہے۔ یہ گیا، وہ گیا، فضا اسلامی میں گم ہو گیا۔ اف! خلق الانسان ضعیفا کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی جو معذور ہو اور ان تجربوں اور ترقیوں کے دعووں کے بعد بھی معذور ہو اس کی ناتوانیوں اور بے چارگی کا کوئی ٹھکانا ہے۔ اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس سے بن آیا وہ تنہا نہیں بلکہ ایک ایک کام کے لئے ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول شخصے کہ آدمی کے منہ میں روٹی کا ایک لقمہ بھی جو جاتا ہے تو سینکڑوں ہاتھوں سے گزرنے کے بعد جاتا ہے۔ گیہوں کے بونے والے، جوتنے والے، پانی دینے والے، کاٹنے والے، صاف کرنے والے، بیچنے والے، تولنے والے، بازار میں لانے والے، دکانوں میں

بیچنے والے، خریدنے والے، پیسنے والے، آٹا گوندھنے والے، پکانے والے، روٹی کو بنانے والے، ایندھن کی لکڑیوں کو کاٹنے والے، دسترخوان پر بیٹھنے والے۔ جب ان سب ہاتھوں کے کام ختم ہو جاتے ہیں، تب لقمہ توڑ کر منہ تک پہنچنے کا یا اس لقمہ کو منہ تک پہنچاتا ہے۔ ادھر تو ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ہر سلسلہ کے ساتھ جو دوسرے سلسلے ہیں مثلاً ہل کی کڑیوں کے کاٹنے والے، ہل میں لوہے کو ٹھونکنے والے، لوہے کو کان سے کھود کر بازار میں لانے والے مگر یوں سوچا جائے تو روٹی کے اس ایک ٹکڑے میں کام کرنے والے ہاتھوں کی تعداد گنا ہی جاتا ہے کہ کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اسی بے زور بے سروسامان غریب انسان کے مقابلہ میں دیکھئے، ان کو دیکھئے جو کسی قسم کی جان رکھتے ہیں جیسی یہ رکھتا ہے۔ انہیں بھی چونکہ جسموں میں تحلیل یافتہ اجزا کی جگہ بدن میں بدل پہنچنے یا کھانے کی سامان کی مسلسل ضرورت رہتی ہے، جنگلوں میں گھومتے ہیں جو دن بھر بھی پھرتے نہیں، سنو ان کی بھوک کے محتاج ہیں۔ آخر ان ہی میں ہاتھی بھی تو ہے، وھیل مچھلی بھی ہے، اژدہے ہیں اور گینڈے بھی ہیں اور کیا کیا بتایا جائے کہ کیا کیا ہیں۔ لیکن ان میں جو بھی ہیں، اپنی ساری ضرورتوں کو صرف اپنی قوت بازو سے مہیا کرتے ہیں۔ حاتم طائیوں کی منت سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں بعضوں کو اس مدت کی دگنی اور چوگنی مدت کسی زمین میں گزارنی پڑتی ہے۔ جتنی انسان گزارتا ہے۔ بلکہ گرگس (گدھ) وغیرہ کی طول عمری کا افسانہ صرف افسانہ نہیں ہے۔ ان کی معاشی زندگی کی مدت کی طوالت کا مقابلہ انسانی افراد کیا، ان کی نسلیں اور پشتیں بھی تو نہیں کر سکتیں۔ مگر باوجود اس کے ان میں ہر ایک کی زندگی خود کفیل زندگی ہے۔ وہی خود کفیل زندگی جس کے لئے آدم کی اولاد تڑپ رہی ہے، لاکھوں برس سے تڑپ رہی ہے۔ انفرادی طور پر جب اس کا حصول ناممکن نظر آتا ہے تو کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں ویسی ہی فرضی حدود پیدا کرکے ان فرضی حدود کے باشندوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ہر ایک سے ممکن نہ ہو تو کم از کم جتنے ان فرضی حدود میں رہتے ہیں، وہ تو اپنی زندگی کو خود کفیل زندگی بنائیں، یعنی ان فرضی حدود کے باہر بسنے والوں کی امداد سے تو مستغنی ہو جائیں حیوانوں کے ہر ہر فرد کو خود مکتفیت کا جو مقام عالی حاصل ہے۔ اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمی کی ٹولیوں کو تو خود کفیل ہونے میں کامیاب بنایا جائے لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت و طاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی نہیں حاصل ہو رہی ہے کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے سوا ان جیسے جانوروں میں جتنے ہیں سب ہی کامیاب ہیں، اور کیوں کامیاب نہیں۔ آدم کے بچوں کا ضعف اور ان کی ناتوانی خواہ سابق ہو یا لاحق، یعنی پیدائش کے بعد والی کمزوری ہو یا آخر قوت کے بعد جو ضعف لاحق ہوتا ہے وہ ہو، کہ وہ آخر ضعف ہی ہے۔ لیکن زندگی کا جو حصہ آدمیوں میں قوت اور زور کا عہد سمجھا جاتا ہے ایک قرآن ہی دو ضعفوں میں گھرا ہوا ہے کہتے ہیں کہ دو نیستیوں کے بیچ والی ہستی بھی ایک قسم کی نیستی ہی ہوتی ہے، عربی کا مشہور مقولہ ہے

الوجود بین العدمین عدم	دو نیستیوں کے درمیان والی ہستی بھی
نیستی ہی ہوتی ہے۔	

لیکن اسے صوفیانہ غلو بھی اگر قرار دیا جائے، جب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت، توانائی

اور تو اور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں، عَلم بلند کرنے والے، مونچھوں پر
تاؤ دینے والے اپنے متعلق اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر جتنی تعلیوں اور لن ترانیوں سے بھی کام لیتے ہوں
مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلے سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں صرف غریب چیونٹیوں کو بھی لا کر مقابلہ کے اس
میدان میں کھڑا کر دیجئے، اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھئے کہ قوت و طاقت کے اس عہد میں نفسِ قوت کا
جو حصہ آدمی میں پایا جاتا ہے، اس کو ان غریب چیونٹیوں کی قوت سے کیا نسبت ہے۔ جواب میں
ارباب تجربہ و مشاہدہ کا یہ بیان سنئے۔

چیونٹی اپنے وزن سے بیس سو گنا بوجھ کھینچ سکتی ہے۔[1]

کیا معنی کہ چیونٹی کے مختصر قد میں قدرت جتنی قوت بھرتی ہے، اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا تو کھنچے ہوئے
اُس قوت سے سات ہزار من وزنی چیز کو وہ اٹھا سکتا تھا۔ یعنی کچھ نہیں صرف ایک چیونٹی کو قوت کا
جو حصہ ملا ہے، اگر آدمی کو حصہ ملتا تو سو ایکڑ کی پیداوار کو (ایک ایک کوڑی) ایک ہی دفعہ میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا
ایک شہر سے دوسرے شہر تک جس مال کو منتقل کرنے کے لئے پوری ایک مال گاڑی کی ضرورت ہوتی ہے، ایک مرد
خود ہی تنہا اسے کھینچ کر لا سکتا تھا اور یہ اس زور بازو کا حال ہے۔ جسے اپنے غلط محسوس کر کے آدم زاد
کیا کیا دعوے نہیں کرتا۔ لیکن مقابلے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آدم کے بچوں کو اتنا بھی تو نہیں ملا ہے جس کی غریب
مور ضعیف حصہ دار ہے۔ ایک چیونٹی ہی کیا لکھنے والوں نے تو اسی سلسلہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ

> پسّوں اور پروانوں میں اچھلنے اور کودنے کی جتنی قوت ہوتی ہے، اگر آدمی میں بھی
> قوت اسی نوعیت کی ہوتی تو زمین سے سو فٹ بلندی تک ایک چھلانگ میں وہ پہنچ سکتا تھا۔

بہر حال کتابوں میں پڑھئے، زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد میں قوت و طاقت کا وہی معیار آپ کو نظر آئے گا،
جس کے سامنے غریب انسان کی اٹھی ہوئی گردن انتہائی شرمندگی سے جھک جاتی ہے اور شائی بات خلق
الانسان ضعیفا کے ملنے پر اپنے آپ کو وہ مجبور پاتا ہے۔

اور سچی بات یہ ہے کہ نوع انسان کی وہ پہلی خصوصیت جس کا قرآن کے حوالے سے میں یہاں ذکر کرنا چاہتا
تھا میرے نزدیک منشاء کے جس معاشی نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے
فطرت انسانی کی اس خصوصیت کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔

دوسری خصوصیت

(۲) دوسری خصوصیت اسی سلسلہ کی وہ ہے جس کی طرف قرآن ہی میں بار بار مختلف
تعبیروں سے تنبیہ کی گئی ہے۔

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض (بنی اسرائیل)	دیکھو! کس طرح ان میں بعض کو بعض پر ہم نے برتری عطا کی ہے۔

[1] بعضوں کا بیان ہے کہ چیونٹی اپنے دانت سے اس چیز کو کھینچ لیتی ہے جو اس کے وزن سے بیس ہزار گنا زیادہ وزنی ہو۔ یہ معلومات رسالہ سائنس اردو حیدرآباد میں شائع ہوئے ہیں۔ دیکھئے اگست ۱۹۲۶ء کی اشاعت ۱۲

اسی حقیقت کی دوسری قرآنی تعبیر یہ

ورفع بعضکم فوق بعض درجات (الانعام)	اور برتری بخشی خدا نے تم میں بعض کو بعض پر۔
یا	
ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات (زخرف)	اور ہم ہی نے اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر مدارج کے لحاظ سے۔

کے الفاظ میں آپ پڑھیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو نظامِ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جمادات
میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن
سے حیوانات سرفراز ہیں، حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم
ہے۔ اور صفات و کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ لکھنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب
کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتیں، تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ بایں ہمہ
یک رنگی ایک پنکھڑی کچھ نہ کچھ خصوصیت اپنے اندر ایسی ضرور رکھتی ہے۔ جو دوسری پنکھڑی میں نہیں پائی جاتی۔
"تجلیات میں تکرار نہیں ہے۔" تفاوتِ صفات ہی کے مسئلہ کی یہ صوفیانہ تعبیر ہے۔ غالب مرحوم نے جو اوپر
یہاں پر حرف مکرر نہیں جس میں جو شعر کے مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔ بلکہ اس واقعہ کی واقعیت پر اتنا
بھروسہ کیا گیا ہے کہ اسی پر اعتماد کر کے حکومت والوں نے ہر شخص کے ابہام (ہاتھ کے انگوٹھے) کے نشان کو
دستخط کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسرے
شخص کے انگوٹھے کی لکیروں سے کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھتی ہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صفات
کے تفاوت کا اگر یہ تماشا دنیا میں نہ پیش ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی رنگ برنگی ہستیوں سے یہ عالم
جو بھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کا
دوسری چیز سے امتیاز کی صورت ہی اس کے سوا کیا تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا
کر دیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ اختلافات و تباینات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف
قسموں میں جو صف بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلہ کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان
جو ہم کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر یکسانی و مجانست و
مشابہت بھی یقیناً پائی جاتی ہے۔ اسی قدر زیادہ مجانست و مشابہت کی اسی بنیاد پر ان کو کسی نہ کسی ایک
نوع یا صنف کے نیچے ہم داخل کرتے ہیں۔ یہ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی اختلافات
کے وحدت کے مشترک جہات بلاشبہ اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بجائے دو کے ان کو ایک جنس یا ایک
نوع کے نیچے اگر مندرج کیا گیا ہے تو تقاضائے غلط اندراج یا غلط صف بندی نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں
گدھوں، بیلوں کے افراد کو الگ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان تمام

انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انسان کے سوا حیوانات
کی جتنی دوسری نوعیں ہیں، مثلاً گھوڑا، ہاتھی، بیل وغیرہ، گو ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت
ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد نہیں تو ایک نوع کے جو مختلف اصناف ہیں مثلاً گروہی
کی ایک ایک صنف کے افراد پر اگر غور کیجئے تو باوجود صفاتی تفاوت کے اس صنف خاص کے افراد میں اتنی یکسانیت
پائی جاتی ہے کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں، وہی کمالات اس صنف کے قریب قریب دوسرے
فرد میں بھی آپ پائیں گے۔ مثلاً پرندوں کی سیکڑوں نسلیں ہیں۔ ہر نسل چند خاص خصوصیتوں کی حامل ہوتی
ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے کہ ان نسلی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس نسل کے افراد میں بھی گو کچھ نہ کچھ تفاوت
ضرور ہوتا ہے، لیکن اتنا کم کہ اس کا ہونا نہ ہونا دونوں گویا کچھ برابر ہی برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
ان جانوروں کی ہر نسل کے افراد کی معاشی ضرورتیں تقریباً یکساں ہوتی ہیں۔ کھانے میں، پینے
میں، رہنے سہنے کی ضرورتوں میں، سب کی معاشی سطح قریب قریب برابر برابر ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن
اس کے مقابلے میں آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے، جس کا نام انسان ہے
اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں آدمی بھی بٹا ہوا ہے۔ لیکن حال یہ ہے
کہ دو نسلوں یا دو قسموں کو تو جانے دیجئے، ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں۔
لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت
ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ دیکھا گیا ہے اور روز دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان
کہا جا سکتا ہے تو دوسرے پر شاید حیوان کے لفظ کا اطلاق بھی مشکل ہی سے صحیح ہو سکتا ہے
بظاہر دونوں ہی پر انسانوں ہی کی کھال چڑھی رہتی ہے۔ دونوں پر انسانی ہی چہرے مہرے
ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی و دماغی، جسمانی، اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات
کے اعتبار سے آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا شاید اس
کے بالمقابل تحت الثریٰ یا پاتال میں ہے۔ ایک خوب صورت ہے، اتنا خوب صورت کہ
دیکھنے والوں کی عقل دنگ ہو جائے۔ دوسرا اتنا زشت رو، کریہ المنظر، بھدی شکل کا پیدا ہوتا
ہے کہ دیکھ کر جی متلانے لگے، ایک غبی ہے، دوسرا ذہین۔ ایک چست و چالاک ہے۔ دوسرا پیدائشی
کاہل و سست، ایک فرشتہ خصلت ہے۔ دوسرا شیطان سیرت، کسی کو خاموشی سے لگاؤ ہے تو
دوسرے کو زباں دانی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ تو دوسرا کتابوں کا کیڑا نظر
آتا ہے۔ اور شک جیسے حیوانی اصناف میں سے ہر صنف اور ہر ہر قسم کے افراد میں صفاتی تفاوت
کی کمی نے ان کی زندگیوں کی سطح میں ایسا محسوس تفاوت پیدا ہونے نہیں دیا۔ جسے
قابل لحاظ سمجھا جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسی وجہ سے ہر ایک کی معاشی
ضرورتوں کی نوعیت کماً و کیفاً تقریباً ایک ہی طرز کی ہوتی ہے، اسی کے مقابلے میں افراد
انسانی میں اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات و صفات اور ان کی

نوعیت میں جو تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے مدارج کا اتنا اختلاف پیدا کر دیا
ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر مشکل ہی سے کسی دوسری حیوانی نوع یا صنف
نسل میں مل سکتی ہے۔ بہرحال مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افراد انسانی میں ان کمالات و صفات ہی کے
تفاوت کا نتیجہ ہے۔ جو اکتسابی نہیں، بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کسب و اکتساب سے بھی
کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات اور ان ہی مناسبتوں اور صلاحیتوں کے تابع
ہوتی ہے، جنہیں ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو مشق و کوشش
تعلیم و تربیت، اصلاح و نگرانی سے آدمی ترقی دے سکتا ہے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ شاعری سے جسے قدرتی
مناسبت فطرتاً نہ ہو، زور و ظلم سے کوئی اسے شاعر بنا دے۔ حالانکہ اسی کا دوسرا جانبی پہلو ہے کیسے کیسے
بیہودوں پر قصیدے اور غزلوں پر غزلیں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ آج تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچوں کی طبعی
مناسبتوں اور خیالی رجحانوں کو سب سے زیادہ اہمیت جو دی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا
اور کیا ہے کہ اکتسابی نشوونما، ترقی و بالیدگی کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جا سکتی ہے جنہیں بالقوہ
بچہ اپنے ساتھ لایا ہے اور یوں بھی تو سوچئے ایک ہی استاد سے ایک ہی کمرے میں ایک ہی نصاب کی تعلیم
جماعت کے طلبہ کو دی جاتی ہے، لیکن سب پر اس تعلیم کا نتیجہ ایک ہی کیوں مرتب نہیں ہوتا۔ بہرحال صفات
کمالات کے اسی تفاوت اور اسی تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف نسل انسانی کے افراد میں جو
پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن نے مذکورہ بالا آیتوں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہی وہ دوسری خصوصیت
نوع انسانی کی ہے جس سے انسانی زندگی کا نظام متاثر ہوا ہے۔ معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گھوڑوں
اور کتوں، بھیڑوں اور بکریوں اور ان جیسے مختلف حیوانی انواع اور نسلوں میں پائی جاتی ہے۔ بنی آدم کی
زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے اور اسی اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ
سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے، کوئی اونچا نظر آتا ہے اور کوئی نیچا۔ اس فرق کے ختم
کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت کوئی تبدیلی پیدا کی جائے
جب رحم مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو وہ فراہم کرتے ہیں۔ اوروں کا تو
میں نہیں کہہ سکتا لیکن قرآن میں کائناتی حوادث کے اساسی کلیات میں جن چند چیزوں کو داخل کیا گیا ہے ان میں

ؔ مطلب یہ ہے کہ افراد انسانی میں کمالات و صفات ہی کا فرق تفاوت نہیں پایا جاتا۔ بلکہ تمکن کے لحاظ سے مختلف
صفات و کمالات میں خود قیمت کا بھی تفاوت متعلق ہے۔ آخر یہ بات کہ کسی قوم میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ اور بہت دنوں
تک غلط کے بعد کام کرتا ہے کہ لوگوں کو ہر جی بنا کر دیتا ہے۔ یعنی پیچھے بیٹھا بیٹھا اسی قوم میں ایک اور فرد پیدا ہوتا ہے جو اپنی کرتب
شکستوں اور ناکامیوں کا اپنی قوم کو ملک بنا دیتا ہے۔ یا اپنی قوم کو دوسری صاحب قوموں سے بہت ممتاز کر دیتا ہے۔ کیا تاریخ ان افراد
کی صلاحیت جو قیمت رکھتی ہے، معمولی فرد کا کمال بھی کیا اسی قدر اس قیمت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کمالات و صفات میں بھی
بلحاظ قیمت کا تفاوت ہوتا ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔

اور یہی اسلام کے معاشی نظام کی میرے خیال میں پہلی بنیاد ہے لیکن ہو تو معاشی پیداواروں سے استفادہ کرنے والے یعنی نوعِ انسانی کی فطری خصوصیات کے متعلق قرآن کے وہ اشارے تھے، جن سے آدمی کی اس جد و جہد کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ جسے حصولِ رزق اور کسبِ معیشت کی راہوں میں وہ اختیار کرتا ہے۔

معاشی ذخیرے کی نوعیت: مگر اب سوال استفادہ کرنے والے سے نہیں، بلکہ ان پیداواروں سے ہے جن سے اس جد و جہد میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہم یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے ان پیداواروں کی معاشی نوعیت کیا ہے۔ قرآن میں اس کے متعلق جو علم عطا کیا گیا ہے، اسی کو اب پیش کروں گا۔ اور یہی وہ دوسری بنیاد ہے جس پر اسلام کا معاشی نظام میرے خیال میں مبنی ہے۔

کچھ دیر پہلے قرآن ہی کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے، اور یہی مشاہدہ بھی ہے کہ قدرتی پیداواروں پر قبضہ کر کے بعض لوگ تو ہم میں رزقی حیثیت سے بسطی حالت میں ہیں اور بعض قدری زندگی میں مبتلا ہیں۔ لیکن بسط و قدر کی یہ حالت تو افراد کے حساب سے ہے۔ مگر اسی سوال کو اگر اس طریقہ سے اٹھایا جائے یعنی پوچھا جائے کہ ان قدرتی پیداواروں کی نوعیت افرادِ انسانی کی مجموعی حیثیت کی نسبت سے کیا ہے؟ تو قرآن کی مشہور آیت

ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ — اگر پھیلا دے اللہ روزی کو اپنے بندوں
لبغوا فی الارض۔ — کے لئے تو بغاوت اختیار کر لیتے زمین پر۔

کا جو فقرہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان پیداواروں کو جس پیمانہ پر قدرت پیدا کر رہی ہے، قرآن کا بیان ہے کہ یہ پیمانہ ہے جس سے بہ حیثیت مجموعی العباد (یعنی خدا کے بندے) بسطی حالت میں نہیں آ سکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں ہر ایک شخص اگر یہ چاہے کہ موجود زندگی میں ایسی آمدنی پر اسے اقتدار حاصل ہو کہ خرچ کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے پاس کچھ پس ماندہ بھی رہ جائے تو مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم حیات کے جس دور سے آدمی اس وقت گزر رہا ہے اس میں تو اس کا امکان نہیں ہے۔ معاشی پیداواروں کو جو پیدا کر رہا ہے۔ قصداً و ارادۃً اس نے یہی چاہا کہ اس قسم کا بسط نہ پیدا ہو، ایسا کیوں چاہا گیا؟ گو اس کا جواب اسی آیت میں مذکور ہے، لیکن اس وقت میری بحث کے دائرے سے یہ سوال خارج ہے کہ اس وقت تو صرف مجموعی حیثیت سے معاشی پیداواروں کے متعلق اس پیمانہ کو صرف دریافت کرنا ہے، جس پیمانہ پر یہ چیزیں اس دنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیت سے اس پیمانہ کی یہ نوعیت سلبی صفت معلوم ہوئی، یعنی مجموعی طور پر بسطی حالت ان سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں

ولکن ینزل بقدر ما یشاء — لیکن نازل کرتے ہیں ہم (اس رزق کو)
اسی پیمانے پر جس پر چاہتے ہیں۔

گویا سلبی صفت کے بعد پیدائش کے اسی پیمانہ کی ایک ایجابی و اثباتی صفت کی طرف اشارہ ہے یعنی قدرت کے نزدیک کوئی خاص پیمانہ مقرر ہے۔ اسی مقررہ پیمانہ کے مطابق پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ الرزق یعنی معاشی پیداواروں کے متعلق بظاہر کسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب پیدا ہو رہی ہیں اور کسی

[کو] محسوس ہوتا ہے کہ پیداوار میں کمی ہو رہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی پیدائش کا کوئی قانون نہیں ہے یوں ہی جزافی طور پر کام چل رہا ہے۔ یہ نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے کے سامنے کوئی خاص پیمانہ اور معیار ہے کہ نامعلوم زمانہ سے وہ اسی مقررہ پیمانہ پر ان کو پیدا کرتے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ باقی [سوال] کہ قدرت کے اس مقررہ چاہے ہوئے پیمانے کی نوعیت کیا ہے؟ اس منفی صفت کے سوا یعنی مجموعی حیثیت سے بسطی حالت کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی۔ سورۂ حجر میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

وان من شیء الا عندنا خزائنہ — نہیں ہے کوئی چیز مگر اس کے خزانے ہمارے
وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ — پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے
ہیں ہم ان کو لیکن ایک مقررہ معلوم پیمانے پر۔

[یہاں] گویا اسی مضمون کا اعادہ فرمایا گیا ہے، اور

ولکن ننزلہ بقدر ما یشاء — مگر ہم نازل کرتے رہتے ہیں اس کو اس
پیمانے پر جس پر ہم چاہتے ہیں۔

[ارش]اد ہے۔ یعنی وہی بات کہ پیدائش کا پیمانہ جانا بوجھا مقرر کیا ہوا ہے، بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کے [بعد] جو اعلان کیا ہے

وجعلنا لکم فیہا معایش — اور زمین میں ہم نے تمہارے جینے کا سامان
ومن لستم لہ برازقین۔ — کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں کے جینے کا بھی
جن کے روزی پہنچانے والے تم نہیں ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اسی "مقررہ" اور "معلوم پیمانے" کی ایک مزید ایجابی صفت [کی ط]رف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ "معایش" کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہاں بھی [ان] وسائل کی تعبیر ہے، جن کے بل بوتے پر موجودہ زندگی گزر رہی ہے۔ گویا "معایش" "الرزق" ہی کی [ایک] قرآنی تعبیر ہے۔ حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ صرف ہمارے ہی لئے یعنی صرف نوعِ انسانی ہی کے لئے بلکہ [ان] کے لئے بھی جن کی روزی کا متکفل انسان نہیں ہے، سب ہی کے لئے اسی پیمانہ پر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں جس سے آدمی کی بھی زندگی گزر رہی ہے، اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں، ان کی بھی۔ یہی معاشی پیداواروں کے معلوم و مقررہ پیمانے کی میرے نزدیک دوسری ایجابی صفت ہے جس کا سراغ قرآن سے ملتا ہے۔

اب خلاصہ یہ ہوا کہ جن معاشی پیداواروں سے آدمی استفادہ کر رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا [ہے] کہ مجموعی حیثیت سے ان میں بسط کی کیفیت کو قصداً و عمداً قدرت چاہتی ہے کہ نہ پیدا ہو، لیکن باایں ہمہ [ایک] مقررہ و معلوم پیمانہ پر ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے کہ آدمی اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں [ان] کے لئے معائش (یعنی وہ وسائل جن پر زندگی موقوف ہے) مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اس پیمانے کی [ایجابی] صفت ہے۔ ایسی صفت کہ خشکی و تری بحر و بر جہاں کہیں بھی جو جی رہا ہے۔ اس کے لئے اسی کے مطابق [معائش] کا یا معاشی سامان مہیا ہو رہے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے، جب تک "معائش" اور "رزق" کے

تجری من تحتها الانهار خالدین فیها وازواج مطهرة ورضوان من الله والله بصیر بالعباد۔ (آل عمران ع ۲ پارہ ۳)

جنھوں نے پارسائی اختیار کی ان کے مالک کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہیں (وہ ان میں) اور (انعام) یہ ہے نقائص سے صاف و پاک ہونے سے اور سب سے بڑی چیز اللہ کی خوشنودی کا پیمانہ ہے۔

انسانی فطرت کے لئے حقیقی تجزیہ دراصل وہی "رضوان من اللہ" یا "اللہ کی رضامندی" ہے یعنی لامحدود قدرت و طاقت والے کا انسانی فطرت کے لامحدود احساسات اور خواہشوں کے ساتھ کامل موافقت و تطابق تام، اسی کا نام "رضوان من اللہ" یا خدا کا راضی ہو جانا ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یوں بھی کی گئی ہے۔

لکم فیها ما تشتهی انفسکم و لکم فیها ما تدعون۔

(اخروی اس زندگی میں) تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو گے اور سب کچھ جو تم مانگو گے۔ (کیونکہ لامحدود قوت و قدرت والا، لامحدود طلب رکھنے والے سے راضی ہو چکا ہے، پس اب جو چاہے گا وہ اس کو پورا کرے گا)

الغرض اللہ "جنت" یا اسی قسم کی اور چیزیں دراصل اسی اجمال کی بعض تفصیلی و تمثیلی شکلیں ہیں، بلکہ حب الشہوات والی آیت کے بعد آخرت کی جن جن شکلوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر لامحدود تمناؤں کی جو جوتی جوڑی گئی ہے، ان لامحدود شکلوں میں بعض آرزوئیں یہاں آدمی کی جو پوری ہو جاتی ہیں تو غرض اس سے یہی ہے کہ آئندہ کی لامحدود طلب کا جذبہ آدمی میں پیدا ہو، پیاس بھی ہے اور پیاسے کو پانی کے چند گھونٹ پلا بھی دیئے گئے ہیں، پینے کی اس لذت سے ناواقف ہونے، بلکہ پیاس کے بھڑک اٹھنے کے بعد اس وقت تک جب تک اس پیاس کی کامل تسکین کا سامان نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پیاسے کو نہ قرار مل سکتا ہے اور نہ اسے مٹ جانا چاہئے۔ پس آرزوؤں اور تمناؤں کے ان گھونٹوں کی راہ بند ہو گیا، نہ مٹ سکا، فطرت کے قانون سے جیسا کہ گذر چکا کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ صحیح راہ یہی ہے کہ بھڑکائے جانے اور بھڑکانے کے ان آرزوؤں کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کی جائے، جس کی عملی صورت یہی ہے، اور یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوؤں کے متعلق ایک طرف تو یہ قطعی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ متاع الدنیا کے محدود سرمایہ سے ان کی تسکین ناممکن ہے، اور دوسری طرف نکل جانا چاہئے۔ آدمی کو اس قوت و قدرت کے لازوال سرچشمہ کی تلاش میں جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرہ ذرہ اپنے لامحدود کمالات کے مظاہرہ سے ادا کر رہا ہے۔

دل من مسافر من گر خواہش یار بادا

قرآن ہی میں ایک موقع پر الآخرۃ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو یہ فرمایا گیا کہ

لا یبغون عنها حولا۔

یعنی (الآخرۃ کی بہشتی اور فردوسی زندگی) سے وہ لوگ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

اس کے بعد متصلاً آیت ہے

قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثله مددا

بتادو کہ اگر سمندر بھی روشنائی ہو جائے میرے رب کے کمالات کے لکھنے کے لئے، تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کمالات ختم ہوں اگرچہ اس سمندر کے مانند دوسرے سمندر کو بھی لائیں۔

پڑھنے والے پڑھتے ہیں، لیکن مقدم الذکر اور مؤخر الذکر دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے، شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، حالانکہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے میں بیان کر رہا ہوں، مطلب یہ ہے کہ فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اسی لئے ہونا نہیں چاہیں گے کہ اس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات[1] کے ذریعہ سے ظاہر کرتی رہے گی، انسانی احساسات اپنے اردگرد یعنی اپنے پیش، اندر و باہر ہر لحظہ، ہر لمحہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل پیہم انکشاف کے پاتے چلے جائیں گے، جس کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا، اور یوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے تمتع اور لذت گیر ہونے کا موقع ابدالآباد تک ملتا جائے گا، اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے، اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی جدت پسند فطرت تو بہ تو شکلوں میں اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان حاصل کرتی چلی جائے گی، گویا

ہر لحظہ جمال خود و فرخ دگر آرائی
شور دگر انگیزی و شوق دگر افزائی

کا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہوگا، عجیب تماشا!! اور یہ سب دراصل "رضوان من اللہ" کے حصول میں کامیابی ہی کی تفصیلات ہوں گی جو "مفلحون" (کامیاب ہونے والوں) کے سامنے لامحدود شکلوں میں پیش ہوتے رہیں گے۔ پس یہ ہے وہ حقیقت یا اس جذبہ کی شدت کے ازالہ کی صحیح تدبیر جو تجسس و طلب کے متعلق آدم زادوں کی فطرت میں قصداً وارادۃً ان ہی اغراض کی تکمیل کے لئے ودیعت کی گئی ہے، یہی اس کی صحیح قیمت، اور یہی اس جذبہ کا صحیح استعمال ہے واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

معاشی مشکلات کے بنیادی اسباب کی آخری چیز ترقی مدارج و مراتب کا وہ اختلاف رہ جاتا ہے، جو افراد انسانی کے کمالاتی و صفاتی تفاوت کا قدرتی نتیجہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے

[1] کلمات کی تعبیر یہ قرآن کی اصطلاح ہے تخلیق کا کاروبار جس ذریعے سے انجام پا رہا ہے، اسی کا نام کلمات یا تجلیات بھی ہے اور اسی کاروبار کو قرآن نے "کن" کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے۔

مختلف طریقوں سے یہ جو بتاتا آرہا ہوں کہ انسانی معاشرہ میں مدارج و مراتب کا مستقل وجود فطرت کے معانی و مطالب کے تفاوت کا ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے۔ ضمناً پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ مدارج و مراتب کے اس اختلاف کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جس کا تعلق زندگی کے غیر معاشی شعبوں سے ہے۔ مثلاً ہم میں کوئی حسین ہوتا، کسی کا نقشہ برا یا بد شکل ہوتا، کسی کی طبیعت کا لگاؤ شعر و شاعری سے ہے، اور دوسرا ریاضی و حساب کی پیچیدگیوں سے دلچسپی رکھتا ہے، کوئی ہم میں صنعت و حرفت کا دلدادہ ہے، اسی میں اس کا جی لگتا ہے، اور کسی کو ابعد الطبیعیاتی مسائل و کلیات کے سلجھانے میں مزہ آتا ہے، ترجیح و تفضیل یا قرآنی الفاظ میں فضلنا بعضهم علی بعض کے اس سلسلہ کے تفصیلات لاتعداد ہیں۔

اسی کے مقابلہ میں ترجیح و تفضیل، برتری و کمتری، بلندی و پستی کا دوسرا مستقل سلسلہ وہ ہے جس کا تعلق زندگی کے خاص معاشی حالات سے ہے، قرآنی اصطلاح میں یوں کہئے کہ الرزق کے لحاظ سے انسانوں کے جن افراد کو بعض پر برتری و فضیلت بخشی گئی ہے، تعبیر جس کی وجہ سے ہم میں بعض فراخی و فراغت کی حالت میں نظر آتے ہیں، قرآن میں جس کی تعبیر بسط سے کی گئی ہے، اور بعض رزق کی تنگی معاشی اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، قرآن نے رزق کی اسی حالت اور کیفیت کا نام قدر رکھا ہے۔

بسط و قدر کی قرآنی اصطلاح کی تشریح

بات یہ ہے کہ الرزق یا روزی بعضوں کو تو بقدر ضرورت ملتی ہے، بالفاظ دیگر جن کا دخل یہ مقدار خرچ اور آمدنی بالکل ٹھیک ضرورت کے مطابق نپی تلی حالت میں اس طور پر ہوتی ہے کہ ضرورت میں خرچ ہونے کے بعد کچھ کمی بیشی انداز یا اضافہ نہیں آتا۔ لغت میں قدر کا یہی مفہوم ہے، یعنی واقع میں جو چیز جیسی ہو، ٹھیک اسی کے مطابق اندازہ قائم کرنا یہی قدر کے لغوی معنی ہیں، اور اسی لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسی آمدنی جو بالکل خرچ کے برابر برابر ایک دم یا جس کے مطابق ہو اسی کا نام رزق مقدور ہے، یعنی ضرورت کے مطابق نپی تلی روزی اور اسی رزق مقدور کے مقابلہ میں بعضوں کی آمدنی کا پیمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچا رہتا ہے، رزق کے اسی پیمانے کا نام بسط یعنی پھیلاؤ ہے۔ اور جو رزق اس پیمانے پر ملتا ہے اسی کا نام رزق مبسوط ہے، کیونکہ بسط کے معنی پھیلاؤ کے ہیں، گویا آمدنی کی ایک ایسی شکل ہے جس کا دامن خرچ کے حدود سے وسیع اور آگے نکل کر پھیلا ہوا ہے۔

بہرحال مدارج و مراتب کے اعتبار سے ترجیح و تفضیل کی یہ دو مستقل صورتیں ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کم و بیش ہر دو حالات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنہیں برتری عطا کی جاتی ہے ان کو دیکھ دیکھ کر نہ پانے والوں اور محروم رہ جانے والوں میں ترجیح و تفضیل کی ان دونوں صورتوں میں کسی نہ کسی حد تک اپنی محرومی کا احساس عموماً پیدا ہوتا ہے، اور یہی احساس سوز اور کوفت کی شکل بھی بسا اوقات اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے خاص معاشی شعبہ میں بعضوں کی بلندی و برتری یعنی الرزق کے لحاظ سے کسی کو اعلیٰ حالت میں پاکر کسی کو ادنیٰ حالت میں ہم دیکھتے ہیں، اور یہ دوسروں کیلئے زیادہ جانگداز

مراتب کے ان اختلافات سے جس اندرونی کوفت کو آدمی محسوس کرتا ہے، مان لیا جائے کہ واقعی تفاوت سے اس کی تہہ میں کچھ نہ ہو، لیکن اتنا تو بہرحال تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اپنے ابنائے جنس کی بلندیوں اور برتریوں کو دیکھ دیکھ کر پستیوں میں زندگی گزارنے والوں کے دلوں میں بیجا جیسے بے جا، بلاوجہ ہو، یا باوجہ لیکن کوفت اور خلش پیدا ضرور ہوتی ہے، کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اسے جانے دیجئے، لیکن جب پیدا ہوتی ہے، ہوتی رہتی ہے، تو ایسی صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ بنانے والے نے انسان کی فطرت کو بنایا ہی ہے اس نہج اور اس ڈھب پر، کہ غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی اپنے ابنائے جنس کی برتریاں اس سے دیکھی نہیں جاتیں، اپنائیت کا رشتہ جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے، کوفت کے اس احساس کی شدت بھی اسی نسبت سے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے جس بنا ہوتی ہے، وہ واقعہ نہ ہو لیکن بجائے خود یہ کوفت انسانی فطرت کا تو ایک واقعہ نا قابل انکار ہے۔ منطق لاکھ ثابت کرتی رہے کہ تڑپنے والوں کی یہ تڑپ بے معنی ہے، غیروں کی نہیں بلکہ اپنوں کی خوش حالیوں کو دیکھ دیکھ کر بجائے مسرور ہونے کے بدحال ہونا بد عقلی کی بات ہی سفیہانہ فعل ہے محرومی ہی اور انتہائی کمینہ حرکت ہے، یہ حسد ہے، حسد کا وہ پتھر ہے جو بجائے محسود کے پلٹ کر حاسد ہی کے سر کو لہولہان اور اسی کی کھوپڑی کو چکنا چور کرتا ہے، اپنی سلگائی ہوئی آگ میں حاسد کو خود ہی جھلسنا اور جلنا پڑتا ہے۔

مگر سب کچھ سن لینے، سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی دیکھا یہی جاتا ہے کہ پستی و بلندی و فراز و نشیب کے اس تماشے سے آدمی کی فطرت عموماً وہی اثر لیتی ہے جسے عقلاً و اخلاقاً نہ لینا چاہئے تھا، فطری جذبے کا زور عقل پند ناموں کے اوراق کو اڑا اڑا کر تتر بتر کر کے رکھ دیتا ہے سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی پانے والے اپنے اندر جب پاتے ہیں تو کوفت کی اسی کیفیت کو پاتے ہیں، جیسے چاہئے تھا کہ وہی پاتے جنہوں نے نہیں سمجھا ہے۔

یقیناً یہ سوال ہے، ایسا سوال ہے جو توجہ کا مستحق ہے۔ اس سے بے اعتنائی درحقیقت انسانی فطرت کے ایک واقعہ سے بے اعتنائی ہوگی، کم از کم قرآن کا جو طرز عمل اس باب میں ہے اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے، بلاشبہ اس نے ان ترچھی سوچوں کے متعلق تنبیہ باری کی بدولت ہے جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے، لیکن دوسروں کی بلندیوں کو دیکھ کر پستی میں رہنے والوں کے اندر ان بلندیوں کی آرزو کا پیدا ہونا، اس آرزو کی نہ پوری ہونے کی صورت میں آدمی کا جھنجھلانا اور کڑھنا، قلق اور بے چینی میں مبتلا ہو جانا، یہی انسانی جبلت کا اقتضا ہے، ایسا اقتضا جسے جبلت سے نکالا نہیں جا سکتا، بعض پیغمبر کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے لیکن جبلت میں جو کچھ ہے اسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اور یہی بات ہے کہ بجائے ازالہ کی فضول کوشش کے امالہ کی اسی پرانی ترکیب سے اسلام نے اس مسئلہ میں بھی کام لیا ہے اور اسی کا ذکر اس مقام پر میرا اصل مقصود ہے۔

جی رہے ہیں، یہی حال انسانی افراد کا بھی ہو جاتا۔

یہی مقام ہے اس فطرت کے متعلق غور و خوض کا جس کو سب سے زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے کہ وہ مدنی الطبع ہے یعنی باہمی میل جول، اتحاد و اتفاق، ہمدردی و غم خواری، مواسات و مؤانست، جس کی زندگی کا سب سے قیمتی ترین سرمایہ ہے۔ اسی سرمایہ کی حفاظت و نگرانی کے لئے کانفرنسوں کے پنڈالوں، مجالس کے اسٹیجوں، مساجد کے منبروں سے مواعظ و نصائح کا ایک طوفان جاری ہے۔ "اتفاق" "اتحاد" "ہمدردی" "یک جہتی" "یک دلی" کی آوازوں سے دنیا گونج رہی ہے۔ اب یہی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں کیا زندگی کا وہ منحوس نقشہ جس میں بجائے جوڑنے کے آدمی کو آدمی سے توڑا جائے، افتراق و انشقاق، بے تعلقی و جدائی، علیحدگی و بے نیازی کا یہ وحشت ناک منظر کیا انسانی فطرت کے لئے قابل برداشت ہوگا؟

رزقی و معاشی حیثیت سے مراتب و مدارج کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پایا جاتا ہے قرآن میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیوٰة الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا۔

ہم ہی نے بانٹ دی ہے حیوٰۃ الدنیا (دنیاوی زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ سے وہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔

اس کا مطلب آج ہی نہیں صدیوں پہلے مشہور مفسر قرآن القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ای یستعمل بعضهم بعضا فی حوائجهم فیحصل بینهم تآلف وتضام ینتظم بذلک نظام العالم (ص ۱۸۱ ج ۲)

یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی ضرورتوں میں کام لیں اور اسی ذریعہ سے ان میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض کے ساتھ مل جاتے ہیں، عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔

حاصل اس کا یہی ہوا کہ نوع انسانی جس کے افراد فطرۃً و طبعاً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں ان ہی کو بجائے توڑنے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کے قضاءً و ارادۃً خود پیدا کرنے والے نے مدارج و مراتب کا یہ اختلاف پیدا کر کے یعنی معاشی لحاظ سے بعضوں کو بعض پر برتری عطا کر کے وحدت و وفاق کا ایسا انتظام قائم فرما دیا ہے کہ ساری انسانی برادری گویا زنجیر کی کڑیوں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مراتب و مدارج کا یہی معاشی نشیب و فراز ان کی وہی رزقی، منزلی و معیشی جسے گرہ گیر کر آج اچھالا جا رہا ہے خود اسی اختلاف کو دکھا دکھا کر فساد و جدال، فتنہ و فساد کی جہنم انسانی بستیوں میں بھڑکانے والے بھڑکا رہے ہیں۔

آپ نے دیکھا اللہ کی ایک ہلکی سی تدبیر سے اسی اختلاف کو قرآن نے اتحاد و اتفاق کا کتنا مستحکم و استوار ذریعہ بنا دیا۔ دوسرے جس سے جدائی اور فصل کی فصل کاشت کرنا چاہتے ہیں، بلکہ کاشت کر رہے ہیں، اسلام نے اسی کو میل ملاپ اور وصل کے سدا بہار پھول پیدا کرنے کی تدبیر سے بدل دیا۔ ایسی تدبیر کہ صرف ذہنی تصورات کے رخ کی ہلکی سی تبدیلی اس کے لئے کافی و وافی ہے، اختلاف نظر قائم کر کے جس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اور اپنے بعد ساری انسانیت کے دکھ کا ذریعہ بنا لیا تھا اب اسی میں راحت و آسائش کی ضمانت بلا شبہ نظر آ رہی ہے۔

اب کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اور بات ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ احتیاجی تعلقات (جو قانون تفضیل بعض علی بعض کا قدرتی نتیجہ ہے) ان ہی تعلقات کی بنیاد پر کسی آبادی کے افراد میں اس قسم کی وابستگیوں اور پیوستگیوں کا جو تماشا نظر آتا ہے کہ دھوبی کمہار کا برتنوں میں محتاج ہے اور کمہار اپنے کپڑوں کے دھلنے میں دھوبی کا، حجام زرگر کا، زرگر حجام کا، عالم طبیب کا، طبیب عالم کا، کیمیا والے طبیبات والوں کے، طبیبات والے کیمیا والوں کے، اور اس طویل زنجیرے کی تفصیل کا بجائے کتابوں کے ہر ملک اور ہر ملک کی ہر آبادی کے اوراق پر جیتی جاگتی تصویروں کی شکل میں ہر جگہ آپ بآسانی مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سارا تماشا اسی تقسیم معیشت اور رفعنا بعضهم علی بعض کے اسی شجرۂ طیبہ یا مقدس درخت ہی کا تو ثمرہ ہے، جس کی مختلف شاخوں پر ہر آبادی کے مختلف افراد بیٹھے ہوئے ہیں، یا انسانیت کی زنجیر کے حلقوں کی شکل پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

الحاصل سب کو سب کچھ دے دیا جاتا، بجائے اس کے قدرت نے یہ طریقہ بنی نوع انسانی کے ساتھ جو اختیار کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سب کو دے کر ہر ایک کو دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے، اگرچہ قدر و قیمت کے اعتبار سے باہمی احتیاج کی یہ کیفیتیں بیسیوں شکلوں میں منقسم ہیں لیکن افراد کی باہمی پیوستگی کا یہ نظام ہے تو اسی تفضیل بعض علی بعض کے قانون کا نتیجہ یعنی بعض کو بعض پر صفات و کمالات و مواہب و رجحانات کے حساب سے جو برتری عطا کی گئی ہے اسی نے ہماری آبادی کو گویا اینٹوں کی اس دیوار کی شکل میں ڈھال دیا ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ پر قائم اور اسی سے سہارا لئے ہوئے ہے۔ انسانیت کا یہی ناز افتخار کرے

چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

اگر سوچا جائے تو اس میں فطری انجذاب کے ساتھ ساتھ احتیاجی تعلقات کے ان مادی اسباب کا ہاتھ بھی یقیناً نظر آئے گا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ باہم اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ کبھی الجھ بھی جاتے ہیں، تو یا تو خوش طبیعت غالب آ کر اس غیر طبعی کیفیت کا ازالہ کر کے تعلقات کو پھر سلجھا دیتی ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف پیداواروں کی پیدا کرنے کی صلاحیت جو قدرت نے پیدا کی ہے، اگر نظری وسعت و کشادگی سے اگر کچھ کام لیا جائے تو خود یہ اسی قرآنی آیت

لیکن غیر دوسرے ملکوں کا رنگ تو ابھی ہلکا ہے صنعت کے دائرے سے جاپان کی بی بی کو باہر
نکلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہے۔ چاہنے والے اگر چاہتے بھی ہیں، تو جو نہیں چاہتے ہیں وہ ان کی
چاہ کو کب پوری ہونے دیتے ہیں۔ لیکن وطنیت اور وہنیت کے ساتھ ساتھ خود اکتفائیت کے شعلہ اول
حرب یورپ ہی کو اپنے ہاتھوں کی اس جلائی جہنم میں خود کو دنا پڑا ہے، بے کاری نے عداوت کی آگ
سلگائی ہے اب اسی آگ میں ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے خود یورپ کو بھی جلنا پڑتا ہے۔ اور یورپ کے
ساتھ ان مسکینوں کو بھی بالآخر اس جلن میں حصہ لینا ہی پڑا جنہیں مختلف ترکیبوں سے یورپ والوں نے
اپنا طفیلی بنا لیا ہے۔

اب سوچنے والوں کی آنکھیں کھلی ہیں، چاہا جا رہا ہے کہ اس ٹوٹی ہوئی دُنیا کو اور ٹلی جلی
تو غلط تعبیر ہے، وہ تو جلی ہوئی تھی بلکہ کہا یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھوں کی توڑی ہوئی اس دُنیا کو پھر جوڑا
جائے، تب عصبۃ الاقوام (لیگ آف نیشنز) یا جمعیت اسلام اور اسی قبیل بیسیوں ناموں سے
بیسیوں تجویزیں بچاری جاری ہیں، تاکہ جو الگ کئے گئے ہیں، باہم انہیں پھر ملا دیا جائے۔ حالاں کہ
دور کی ان کوڑیوں کے لانے میں وقت ضائع کرنے سے کتنا آسان علاج یہی ہے ہمیشہ سے کا کہ خود اکتفائیت
کے اس جنون زدہ ہاتھوں سے نکال کر پھر بنی آدم کے گروہوں کو لیتخذ بعضھم بعضا سخریا
کے اسی قدرتی قانون کے ماتحت چھوڑ دیا جائے، آزاد چھوڑ دیا جائے، تاکہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ
سے جس حال پر ان کے احتیاجی و معاشی تعلقات قائم تھے، اسی حال پر پھر وہ واپس ہو جائیں۔

الغرض سب کو سب کچھ پیدا کرنے کی تلقین کی جگہ ہر ملک کو ان ہی چیزوں کے پیدا کرنے کا
مشورہ دیتے ہوئے جنہیں اپنے اپنے ماحول اور موسمی و مقامی خصوصیات کے لحاظ سے بآسانی بہتر
شکلوں میں وہاں کے باشندے پیدا کر سکتے ہیں، اگر ایک ملک کی آبادیوں کو دوسرے ممالک کی آبادیوں
سے پیوستہ وابستہ کر دیا جائے تو یوں بھی یہ بات خود اکتفائیت کے جنونی اصول کے مقابلہ میں زیادہ
مفید ہو سکتی ہے کیوں کہ [illegible] بقول شخصے

کھلا جیا پورے احوال

کی شکل میں مثلاً صنعتی ممالک کو جبراً و قہراً کسی نہ کسی طرح مصنوعی ذرائع سے کام لے کر غیر فطری طور پر اگر ہم
زرعی ملک میں بدل بھی سکتے ہیں، یوں ہی زرعی علاقوں میں بھی صنعتی کاروبار پھیلایا جا سکتا ہے لیکن کچھ
یہ ہے کہ واقع میں جو زرعی علاقے ہیں، زرعی پیداواریں جتنی عمدہ شکلوں میں وہاں مہیا ہو سکتی ہیں یا جو
زرعی بنائے ہوئے خطوں کی پیداواریں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں یہی حال مصنوعات اور ضروریات حیات
کی دوسری چیزوں کا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر چاہا جائے تو انگور یا انار نہیں پیدا
ہو سکتے یقیناً ہو سکتے ہیں اور جب کوشش کی گئی تو سب نے دیکھا کہ یہاں انگور پیدا ہوئے، لیکن کابل یا کشمیر کے
انگوروں یا اناروں کا مقابلہ کیا وہ کر سکتے ہیں، جب ہندوستان کے آموں کو کیا کریم کابل کے انگور
کھا سکتے ہیں، قندھار کے انار سے کام و دہن کو لذت پہنچا سکتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے ملک کی قدرتی

پیداواروں کو دوسرے ممالک کی قدرتی پیداواروں سے جب بآسانی تبادلہ کر سکتے ہیں، تو خواہ مخواہ ایک غیر فطری
خیال کر کے ہندوستان ہی کا پیدا کیا ہوا انگور چوں کہ ہے، اس لئے بدمزہ ہی کیوں نہ ہو کابل و کشمیر کے انگوروں پر
بھی اسے ترجیح دینا چاہیے، وہ حواس اور ذہنی احساس کے سوا یہ چیزیں اور کیا ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مختلف اقوام
کی ان معاشی وابستگیوں سے چاہنے والے اگر چاہیں تو لیگ آف نیشنز (جنیوا والی) یا مجلس اقوام (جنگ
والی) وغیرہ کے مقاصد کو ایک حد تک اس ذریعہ سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، یہی پچھلی جنگ جو ابھی ٹل گئی
خود اسی کے تجربہ بات بتا رہے ہیں کہ زندگی کی معمولی معمولی سہولتوں مثلاً مٹی کے تیل جیسی
چیزوں تک نے جنگ سے لوگوں کو بے زار بنا رکھا ہے، اُف! کوئی کیا یوں نے یورپ کے مرغیوں کو
جتنا پریشان کیا ہے، کیا ان لوگوں میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ جس ملک سے کوئی بڑا مد بھڑی تھی اس
سے جنگ کا اعلان کریں، اب آپ اقوام کی مجلس میں اسی جنگ کو روکنے کے لئے قوموں کو اس پر تو مجبور کرنا
عقل کا اقتضاء سمجھتے ہیں کہ باوجود استطاعت کے آئندہ وہ جنگی جہازوں کی تعداد معینہ مقدار سے نہ بڑھائیں
یا سرے سے حربی آلات و اسلحے کے کارخانے ہی بند کر دیئے جائیں۔ کیا جنگ کے ان ہی خطرات کے انسداد
کی ایک صورت یہ بھی نہیں ہو سکتی ہے کہ زندگی کی ضرورتوں میں ایک ملک کو دوسرے ملک کا کچھ اس طرح محتاج
بنا دیا جائے کہ ایک کا کام دوسرے کے بغیر چل ہی نہ سکے یعنی وہی قدرت کا جو قانون ہے اسی پر دُنیا کو
واپس ہو جانے کی اجازت دی جائے۔ تو یا کچھ نہیں، ایک بڑا سبب قوموں کی باہم آنا ہیوں کے ٹوٹنے کا
کیا یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا ہے کہ لڑائی کی صورت میں ان چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا جن کی برآمد کا
دارومدار اسی قوم پر ہے جس سے ہم لڑنا چاہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو انسداد جنگ کے اسباب میں ایک مؤثر
سبب کی حیثیت سے یقیناً یہ ایک بڑی بات ہو سکتی ہے، بشرطیکہ قومیت کا آسیب قوموں کے سروں پر جو
کھیل رہا ہے اس بھوت کے اتارنے میں پہلے کامیابی حاصل ہو جائے۔

اور یوں بھی تجربہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے جس ملک میں جن پیداواروں
کی تیاری کا دستور اس ملک کی خصوصیات کی بنیاد پر جو چلا آ رہا تھا، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک
کے باشندوں کو گویا ایک فطری مناسبت ان ہی چیزوں سے ہو جاتی تھی۔ مہارت و کاریگری میں دوسرے
ممالک ان کا مقابلہ مشکل ہی سے کر سکتے تھے۔ یہ تجربہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ ہر ملک میں ہر قسم کی چیزوں
کی پیدا کرنے کی کوشش پر خود اکتفائیت کے نظریہ کے زیر اثر جو تیاریاں بھی چنداں مفید نہیں،
اسی طرح مفید نہیں ہیں جیسے اس زمانے میں دُنیا کے اس قدیم اصول کو جو توڑا گیا ہے۔ یعنی عموماً قاعدہ
تھا کہ حصول معاش کا جس خاندان میں جو ذریعہ پشتینی طور پر چلا آ رہا تھا، لوگ ادھر ادھر دیکھے بغیر
اسی پیشہ کو اختیار کرتے ہوئے نسلاً بعد نسل چلے آ رہے تھے، جس کا اس فائدہ کے سوا کہ نسبتاً معاشی
افکار میں لوگ اس سے کم مبتلا ہوتے تھے کہ اپنی معاش کا ذریعہ ان کے نزدیک متعین ہوتا تھا۔ ایک معمولی
لڑکا پیدا ہونے کے بعد مطمئن رہتا تھا، سمجھتا تھا کہ روزی کمانے کے لئے مجھے وہی کرنا ہے جو میرا باپ کرتا
ہے دھوبیوں کی اولاد اگر چھوڑ رہی تھی، تو ظاہر ہے کہ دھلانے والوں کی نسلوں میں بھی اسی نسبت سے

قانونِ بسط کے تحت رزق حاصل کرنے کا ذریعہ قسمت جن کے لئے فراہم کرتی ہے، درحقیقت ان کی برتری کا راز یہی واقعہ ہے، یعنی ہونے کو تو وہ بھی دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن جن کے یہ محتاج ہوتے ہیں، ان بیچاروں کا بدل تو انہیں باسانی مل سکتا ہے اور مل جاتا ہے، بخلاف ان کے جو ان کے محتاج ہوتے ہیں کہ ان کو عموماً ایسے افراد کے پانے میں دشواری پیش آتی ہے جو ان کا اور ان کے کام کا محتاج ہو۔

یہی مقصود بحث ہے، جہاں پر اس معاشی زنجیرے کے ان حلقوں کو جو اپنے آپ کو رزقی حیثیت سے پستی میں پاتے ہیں، یعنی وہی لوگ جو بجائے بسط کے قانونِ قدر کے تحت روزی پاتے ہیں، ان کے دلوں میں بسطی رزق والوں سے اگر شکایت نہیں پیدا ہو، لیکن خود پیدا کرنے والے کی طرف سے ان کے قلوب میں اگر یہ سوال اٹھے کہ بجائے دوسروں کے زنجیر کے اس حصے میں ہمیں ایسی جگہ کیوں دی گئی جہاں پر رہنے والوں کو قدری معیشت گذارنی پڑتی ہے، آخر قانونِ قدر کے نشانہ ہم ہی کیوں بنے۔ بسطیوں کا جو پیدا کرنے والا ہے، خالق میرا بھی تو وہی ہے، پھر ان کو اتنا دیا گیا، دیا جا رہا ہے کہ خرچ کرنے، خوب اچھی طرح دل کھول کر بھی خرچ کرنے کے بعد بھی پس انداز کرنے کا ان کو موقعہ مل جاتا ہے، اور ہمارا حال یہ ہے کہ آج کمانے کو اگر مل گیا تو

یہ خورد با مداد نشسرہ ندم

کی فکر اسی وقت اندر اندر ہماری جان کھائے جاتی ہے، سر چھپاتے ہیں تو پاؤں کھلتا ہے اور پاؤں کو چھپا لیتے ہیں تو سر ننگا رہ جاتا ہے۔

قدری پیمانے پر رزق پانے والوں کے دلوں کا یہی احساس (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس مسئلہ کا منشا ہے جس کا تعلق بجائے مخلوقات یا اپنے ابنائے جنس کے خالق تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے۔ اس سوال کا یہ جواب کہ یہی نوعِ انسانی کے بکھرے ہوئے افراد کی تنظیم اور باہم ان میں پیوستگی و وابستگی کے تعلق کو پیدا کرنے کے لئے کسی کا اوپر اور کسی کا نیچے ہونا ضروری تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ سب ہی اگر انجن ہی بنا جائیں گے تو ڈبہ اور بوگی آخر گاڑی کا کون حصہ بنے گا، اور گاڑی میں جب ڈبے یا بوگی ہی نہ ہوں گے تو کیا صرف انجن سے کیا کام چلے گا۔ خواہ ساری گاڑی کی روح رواں انجن ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح جسدِ انسانی میں ہر ہر عضو کو دل و دماغ ہی کا مقام اگر عطا کیا جائے گا، تو پھر ہاتھوں، ٹانگوں، انگلیوں کے وظائف کون ادا کرے گا۔ واقعات کی حد تک بلاشبہ یہ ایک معقول جواب ہے، یوں بھی اگر سوچا جائے کہ جمادات کی طرف سے اگر یہ مطالبہ پیش ہو کہ نباتات کی صفات سے ان کو کیوں محروم رکھا گیا، یا نباتات کی جانب سے احتجاج کی یہ آواز بلند ہو کہ حیوانی کمالات سے محروم کر کے سلسلہ وجود میں ان کا درجہ پست کیوں کر دیا گیا، اسی طرح حیوانات اگر چلانے لگیں کہ آدم کی اولاد جن صوری و معنوی قوتوں سے سرفراز ہے، وہی قوتیں جن کی بدولت ساری کائنات پر انسان کی حکومت قائم ہے سب پر وہ مالکانہ اقتدار جتاتے ہوئے جس قسم کا تصرف چاہتا ہے کرتا ہے، ان سے وہ کیوں محروم ہیں

الغرض متفاوت صفات و کمالات رکھنے والی اس دنیا کے ہر طبقہ کی طرف سے پستی و بلندی، فراز و نشیب کے اسی سوال کو اگر اٹھایا جائے تو بتایا جائے کہ مذکورہ بالا جواب کے سوا کہنے والے اور کیا کہہ سکتے ہیں مثلاً کی مخلوق ہونے میں (جمادات و نباتات، حیوانات و انسان) جب سب برابر ہیں، تو کسی کو کم کسی کو زیادہ جو دیا گیا ہے، اس کی توجیہ میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مطالبے کے معنی تو یہی ہوئے کہ گوناگوں بوقلموں موجودات سے بھری ہوئی دنیا کو یا صرف ایک ہی ہستی کی شکل میں بدل دی جائے یعنی وہی بات کہ سب کو انجن ہی انجن بنا دیا جائے جس کا دوسرا مطلب یہی ہوگا کہ ریل گاڑی اور اس کے منافع و فوائد کے سارے قصے ہی کو ختم کر دیا جائے۔ مگر بایں ہمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ انسان کی اجتماعی عقل اس جواب سے اطمینان حاصل کرنے کے باوجود جب انفرادی طور پر قدری زندگی کی کشمکشوں میں مبتلا ہوتی ہے، تو اس وقت تفاوتِ صفات کا یہ فلسفہ اور اس فلسفہ کے مصالح و مواقع سے عقل غائب ہو جاتے ہیں، سب جانتے ہیں، روز مرہ کے ان تجربات کو سب جانتے ہیں کہ انسانی معاشرہ کا سارا دار و مدار صفات و کمالات اور ان سے پیدا ہونے والے مدارج و مراتب کے اسی اختلاف و تفاوت ہی پر قائم ہے۔ اس کو ختم کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ احتیاجی تعلقات کا وہ رشتہ جو اس وقت ہم میں ایک کو دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے، اسی وقت ختم ہو جائے گا، اسی طرح ختم ہو جائے گا جیسے جو رابطہ تعلقات زندگی رکھنے والے حیوانات میں ان روابط کے فقدان کی وجہ اختلاف و تفاوت کا یہی فقدان بنا ہوا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بیلوں کی قطار سے کوئی بیل، یا گھوڑوں کے اصطبل سے کوئی گھوڑا، بکریوں کے ضمدوں سے کوئی بکری اگر غائب ہو جاتی ہے۔ تو ان میں کسی کو ذرا ذرا سی دیر کے لئے اس فقدان کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بڑی تو بڑی "انسانی آبادی" کا کوئی معمولی رکن، مثلاً کوئی حجام، کوئی دھوبی، یہی کچھ دن کے لئے اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھروں میں کھلبلی مچ جاتی ہے، حد تو یہ ہے کہ حلال خوروں یا جمعداروں تک کی اسٹرائک بڑے بڑے شہروں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔

سوال یہی ہے کہ ان بین مشاہدات و کھلے کھلے تجربات کے باوجود قدری پیمانے پر رزق پانے والوں میں شکایت کا یہ احساس آخر کیوں پایا جاتا ہے؟

عام طور پر "تقدیر" کے مسئلہ کو بھی چاہا جاتا ہے کہ اس شکایت کے ازالہ کا ذریعہ بنایا جائے پڑھنے والے ان ہی مواقع پر پڑھتے ہیں۔

کوئی بادشاہ و امیر ہے کوئی بینوا فقیر   جیسا جیسا بنا دیا تیری مشیت جل جلالہ

آخر سب کچھ نشیب و فراز یا بسط و قدر کا یہ قصہ ان صفات و کمالات، فطری ملکات و رجحانات ہی کے ساتھ جب وابستہ ہے، جن کے نتائج قدر و قیمت کے اعتبار سے قدرتاً مختلف ہیں تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسانی فطرت کا جو پیدا کرنے والا ہے وہی فطرت کے ان جبلی لوازم و نتائج کا بھی خالق ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کل شیء من القدر حتی العجز والکیس   ہر چیز تقدیر ہی سے ہے حتیٰ کہ زندگی کے

کو خواہی خواہش اور رضامندی سے وہ ان ذمہ داریوں کو لینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ آخر بسیلی پیمانے پر رزق پانے والوں میں ایسا کون ہے جو خود تو قدری رزق کا طالب تھا۔ لیکن قدرت نے اس پر بسیلی رزق کا بوجھ لاد دیا ہو۔ عام طور پر دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ بسیلی رزق کے حاصل کرنے میں ہر ایک کوشش کی انتہائی شکلوں کو ختم کر دیتا ہے۔ بلکہ حاصل کر لینے کے بعد بھی اس کی بقا بلکہ استقرار کی ممکنہ صورتوں کے مہیا کرنے میں غفلت کسی قسم کی کوتاہی کو کسی حال میں روا نہیں رکھتا۔ ان میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو اپنے رزق کے اس بسیلی پیمانے کو قدری پیمانے سے بدلنے پر دل سے راضی ہو سکتا ہو۔ پس یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ خود لادنے والے کی خواہش اور مرضی سے ہوتا ہے اور یہ بات کہ ان ہی سے زیادہ مانگا جاتا ہے جنہیں زیادہ دیا جاتا ہے یہ بھی ایک ایسا فطری مطالبہ ہے کہ مذہب تو خیر مذہب ہی ہے بغیر کسی استثناء کے دنیا کے تمام حلقوں میں بسیلیوں کی ذمہ داریوں کی فہرست طویل ہوتی ہے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ غیر مذہبی دائروں میں بھی مطالبوں کا سارا زور اسی طبقہ پر نازل ہوتا ہے جو نسبتاً بسیلی پیمانہ پر رزق پاتے ہیں۔ مذہب میں خیر و خیرات، صدقات و زکوٰۃ، صلۂ رحمی و مواسات وغیرہ وغیرہ مختلف ناموں سے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں تو ٹیکس، ریونیو، سس، باج، خراج اور کیا کیا جائے کن کن ناموں سے حکومتیں بھی انہی کی محتاج ہیں تو ان ہی سے مانگتی ہیں۔ اسی طرح چندے، عطیے، جبری امداد وغیرہ اسماء متعددہ سے قومی کارکنوں کا مدار اگر ہوتا ہے تو ان ہی پر ہوتا ہے اور یہ بھی بات کہ اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرنے کے بعد جس کے پاس کچھ پس انداز رہ جاتا ہو، ظاہر ہے کہ مانگا اگر جائے گا تو اسی سے مانگا جائے گا، اور یہ بات جیسا کہ گزر چکی ان ہی لوگوں کو میسر آسکتی ہے۔ جنہیں قانون بسیلی پیمانے پر روزی مل رہی ہے، باقی جن لوگوں کی آمدنی خرچ کے ساتھ ٹپ ٹپ کر ملتی ہو یعنی قدر کے پیمانے پر رزق جو پا رہے ہیں، ان سے مانگنے والے آخر کیا مانگیں گے، ان کے پاس باقی ہی کیا بچتا ہے جس کے لئے کھانے والوں کو ڈھونڈھنے کی ضرورت محسوس ہو اور سچ تو یہ ہے کہ فطری تقاضے سے بچے ہوئے ایسے اکرام و اعزاز قلوب کا ذکر قرآن میں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمہیں جو روزی عطا کی ہے اس سے خرچ کرو، تو انکار کرنے والے ماننے والوں سے کہتے ہیں، کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں خدا چاہتا تو کھلا سکتا تھا، نہیں ہو لوگ

(یعنی یہ لوگ غریبوں کی امداد کا مطالبہ امیروں سے کرتے ہیں، یہ کھلی گمراہی میں ہیں۔)

فطرت کے ان مطالبوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو عام حالات میں خود بسیلیوں کا طبقہ خود بھی اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے جن کا مطالبہ کی حالت میں مطالبہ کیا جاتا ہے، اور اسی لئے رزق کے بسیلی پیمانے کے متعلق قرآن نے ابتلائی و امتحانی ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے میرے نزدیک تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے

جس کی تصدیق ہر اس شخص کی فطرت کرتی ہے جو جبلۃً مزاجاً کسی شدید غیر فطری عارضہ کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ لیکن بسیلی پیمانے کے ساتھ ساتھ رزق کے قدری پیمانے کو بھی ابتلائی و امتحانی قرار دیتے ہوئے قرآن میں جو یہ ارشاد ہے کہ

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ

لیکن انسان کو جب جانچا ہے اور اس جانچنے کے سلسلہ میں تنگ کر دیتا ہے اس کی روزی کو۔

یعنی قدری پیمانے پر بھی رزق جنہیں دیا جاتا ہے۔ ان کا بھی ابتلاء ہی مقصود ہے، دوسرے الفاظ میں اس کا یہی مطلب ہوا کہ ان کو بھی جو کچھ دیا جاتا ہے جانچنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ معلوم ہے عام احساس اس مسئلہ میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ قدر کے پیمانے پر جو لوگ روزی پاتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ روزی کے حساب سے ان کا قدر اور تنگی کی حالت میں ہونا، یہی کافی ہے، اب مزید ذمہ داری ان پر کیا عائد ہوگی؟

لیکن دوسرے مذاہب والے ان کے متعلق تو میں نہیں کہتا، قرآن میں ایک طرف ذمہ داریوں کا ایک سلسلہ اگر ایسا پایا جاتا ہے جن کا تعلق بسیلیوں سے ہے تو دوسری طرف ذمہ داریوں ہی کی ایک فہرست ایسی بھی ہے، جن کے متعلق لوگوں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو لیکن میرے نزدیک براہ راست ان کا تعلق ان ہی لوگوں کی طرف ہے جو قدری پیمانے پر یہاں رزق پا رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جیسے مکلف بسیلیوں کا طبقہ ہے، ٹھیک اسی طرح قدریوں کے گروہ کو بھی قرآن نے ذمہ دار بنایا ہے۔ اور اب میں چاہتا ہوں کہ دونوں طبقات کی قرآنی ذمہ داریوں کو الگ الگ درج کروں۔

بسیلی رزق کی ذمہ داریاں

جیسا کہ ابھی یہ بات گذری کہ بسیلی پیمانے پر رزق پانے والوں کی ذمہ داریاں تو تنہا یہی نہیں کہ نہ صرف دوسرے بلکہ خود بھی اپنے آپ کو یہ طبقہ ذمہ دار محسوس کرتا ہے۔ اسلام کے مطالبات بھی ان سے وہی ہیں، جن کا عام نام خیر و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ ہے، اسی عام مطالبہ کا منظم قانونی شکل الزکوٰۃ ہے جس کی تفصیل قانونی ابواب کے ذیل میں کی جائے گی۔ قرآن میں اسی مطالبہ کا ذکر اجمالاً و تفصیلاً کیا گیا ہے۔ خود اسی موقعہ پر یعنی سورۃ الفجر کی اسی آیت میں جس میں بسیلی رزق کے متعلق اکرام کے نظریہ کی تردید کلّا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے فرمانے کے بعد جو ارشاد ہوا ہے

بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور مسکینوں کو کھانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے۔

اس میں بھی بسیلیوں ہی کی ذمہ داریوں کا اظہار اجمالی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ قرآن اپنے مطالبات کو عائد کرتے ہوئے کتنی نازک منتظمانہ تعبیریں ان کی پیش کرتا ہے۔ بطور نمونے کے ان الفاظ کی کچھ تشریح اگر کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا، مطلب یہ ہے کہ نعمت و دولت پانے کے بعد پانے والوں پر

جو خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اکرام کیا گیا ہے، اور مجھے عزت بخشی گئی ہے، قرآن نے کلا کے لفظ سے توڑنا چاہا ہے
کہ لوگ اس خیال کو اپنے اندر سے نکال دیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ثروت و عزت پانے والا تو خیر اپنے
اندر سے اس خیال کو نکال بھی دے سکتا ہے، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ثروت و دولت عزت و ثروت
سے جو یہاں سرفراز ہوتے ہیں، جنہیں یہ دولت ملتی ہے ان کو لوگ معزز اور بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، کسی کے پاس کچھ
نہ ہو، علم نہ ہو، فضل نہ ہو، فضائل و کمالات کے جتنے سلسلے ہیں سب ہی سے خالی ہو، لیکن اگر کسی جاگیر پر
وہ قابض ہے، کسی رقم کا وہ مالک ہے، تو لوگ باوجود کچھ نہ ہونے کے محض اسی دولت و ثروت کی وجہ
سے اسے اپنوں میں بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، عموماً آبادیوں کے بڑے آدمی کا مطلب یہی ہوتا ہے
کہ کسی بھی درجہ میں الرزق اسے بسطی پیمانہ پر میسر آرہا ہے۔ پھر قرآن کلا یعنی ہرگز نہیں کے لفظ سے تردید
جو کرتا ہے، جو غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثروت و عزت کو عزت اپنے اعزاز اور اپنے بڑا پا کا ذریعہ
بنا لینا، قرآن کا ماحصل لوگوں کو اس سے روکنا ہے، روک کر پھر اسی عزت و فخر سے جو فخر تا دولت و
ثروت رکھنے والوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اس کے استعمال کے صحیح ذریعہ کی طرف ان آیتوں میں راہنمائی
فرمائی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ جو عزت دولتمندوں کو حاصل ہوتی ہے، چاہا یہ جاتا ہے کہ اس عزت اور
بڑائی کو ان لوگوں کی عزت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا جائے، جنہیں دنیا بلاوجہ اپنی آنکھوں سے گرا دیتی ہے
اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے باپ کے سایہ سے محروم
ہو جاتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ تقریبوں میں شادیوں میں، تہواروں اور عیدوں کے مواقع پر کہ باپ
رکھنے والے بچے اچھے اچھے کپڑوں میں اپنے باپوں کے ساتھ خوش خوش اچھلتے کودتے نازنخرے
کرتے آرہے ہیں، دل میں جس چیز کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، ابا جی کہہ کر باپ کی فطری محبت کو
ابھار ابھار کر کام نکال رہے ہیں، لیکن ان ہی مجلسوں میں وہ بچے بھی ہوتے ہیں جن کے باپ مر چکے ہیں
وہ اپنے دل کی مراد کس سے کہیں، ابا جی فلاں چیز کیسی اچھی ہے مجھے دیجئے، کس سے کہیں، ان کے ننھے ننھے
اٹھنے والے اس پورے مجمع میں کوئی نہیں ہوتا، جو ان کی طاقت تھی وہ سپرد خاک ہو چکی، ان کے دل پر جو
دلی کیفیت ہوتی ہے، جب مجمع میں کوئی بچہ اس شان کے ساتھ شریک ہوتا ہے، یہی وقت ہے ان لوگوں
کی آزمائش کا جنہیں بڑائی بخشی گئی ہے، اور عزت عطا کی گئی ہے کہ اپنی بڑائی اور اپنی عزت سے کام لیتے ہوئے
سوسائٹی کے اس معصوم کس مپرس کو بڑائی عطا کریں، ایک ایسا تعلق اس کے ساتھ پیدا کریں کہ ان
کی بڑائی کی وجہ سے ان بچوں کی بھی عام نگاہوں میں بڑائی پیدا ہو جائے، گویا ان کی عزت کی وجہ سے
لوگ ان بچوں کی بھی عزت کرنے لگیں، اکرام یتیم کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ حال تو ان بچوں کا ہے جن میں انسانی کمالات و قویٰ کی ابھی نشوونما نہیں ہوئی ہے۔
لیکن ان ہی کے ساتھ ہر مجمع، ہر آبادی میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ وہ بھی پایا جاتا ہے، جن کی عمریں
ارتقائی مدارج کو طے کرنے کے بعد کسی وجہ سے ساکن اور معطل ہو گئیں، اور اسی وجہ سے بسا اوقات معمولی
کمانے کی ضرورت بھی وہ اپنے دست و بازو سے پوری نہیں کر سکتے، ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں

المسکین کہا گیا ہے، ان لوگوں کو جنہیں بسطی پیمانہ پر روزی ملتی ہے، بعض ضروریات زندگی میں خرچ
کرنے کے بعد جن کے پاس پس انداز ہو جاتا ہے، ان ہی لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ
پس انداز دولت اس لئے تمہیں نہیں دی گئی ہے کہ صرف اپنے ہم جنسوں، ہم چشموں میں اپنی
بڑائی کا آلہ اس کو بنا لو، بلکہ تم اپنے ابنائے جنس میں کسب و سعی کی قوتیں جن کی ٹھنڈی
پڑ گئی ہیں، عزت یہی نہیں کہ ان کو کھلاؤ، بلکہ مذکورہ بالا آیت میں تحاضون کا لفظ فرمایا گیا
ہے جس کا مصدر تحاض ہے، تحاض کے معنی ہیں ابھار کر لوگوں کو آمادہ کرنا، تو اب مطلب یہ
ہوا کہ ارباب ثروت کو ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے جس کی وجہ سے نہ صرف خود بلکہ دوسرے
دولتمندوں میں بھی مسکینوں کی امداد و اعانت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے
کہ لوگ امداد مساکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں، اور یہ تعلیم اس عام قاعدے پر
مبنی ہے کہ عموماً ہر سوسائٹی اور ہر سماج زیادہ تر اپنے طریقہ کار میں دولتمندوں ہی کو
نمونہ بناتی ہے، جس ملک کے دولتمند اپنی دولت کو کھیلوں، تماشوں، عیاشیوں، فضول
خرچیوں میں صرف کرتے ہیں، دیکھا دیکھی دوسرے بھی ان ہی بیہودہ مشاغل میں مبتلا ہو جاتے
ہیں، اور جہاں دولتمندوں میں یتیموں، غرباء، بیواؤں، مساکین نوازیوں کی رسم جاری
ہو جاتی ہے، تو دوسرے بھی ان کو دیکھ کر خیر کے ان ہی ابواب میں اپنی پس انداز
دولت کو صرف کرتے ہیں۔

الحاصل قرآن کے اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت و ثروت عزت و آبرو
جنہیں دی جاتی ہے، اسی لئے دی جاتی ہے۔ اور یہی اس بڑائی اور اکرام کا صحیح استعمال ہے جو ثروت
و عزت کی وجہ سے آدمی کو حاصل ہوتا ہے، قرآنی آیت

احسن کما احسن اللہ الیک — نیکی کر جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ نیکی کی۔

میں بھی اسی حسن سلوک کا جو قدرت کسی کے ساتھ کرتی ہے، یہی صحیح استعمال بتایا گیا ہے اور
میرا تو خیال ہے کہ "الشکر" کے لفظ سے مذہب میں جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کا ایک
بڑا دوامی پہلو خدا داد نعمتوں کا یہی استعمال ہے، بلکہ اس عام قاعدے کی بنیاد پر جس پر عموماً
اسلامی تعلیمات مبنی ہیں، یعنی عمل کی تصحیح کا طریقہ اسلام میں یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے لوگوں کے
علم کی تصحیح کر دی جائے، علم جب درست ہو جاتا ہے تو قدرتی طور پر عمل اصلاح پذیری خود
بخود آمادہ ہو جاتا ہے، بلکہ صحیح علم سے خود بخود صحیح عمل پیدا ہونے لگتا ہے، آپ قرآن میں
عملی اصطلاحات سے پہلے عموماً آمنوا کا لفظ جو پاتے ہیں تو اس کا منشاء یہی ہے، ایمان در اصل
علمی تصحیح ہی کا دوسرا اصطلاحی نام ہے، جس چیز کے توسط سے ہم ایمان حاصل کرتے ہیں۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً سورہ کہف میں باغ اور
کاشت رکھنے والے آدمی کو یعنی بسطی پیمانے پر جسے رزق دی گئی تھی، اسی کے متعلق کہا گیا

زبان سے یہ فقرہ جو کہلوایا گیا ہے

ولولا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ — اور کیوں نہ ہوا ایسا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو کہا ہوتا کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے۔ نہیں ہے قوت لیکن اللہ ہی سے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ نعمتوں کو پانے کے بعد آدمی کو چاہیے کہ واقعہ کے مطابق ان کے متعلق صحیح [illegible] اور علم ہو، اس کو اپنے سامنے سے اوجھل ہونے نہ دے۔ خصوصاً باغ والے کے سامنے اس کا یہ حاصل پیش کیا [illegible] دیا گیا کہ اس باغ میں جب جایا کرو تو دو باتیں سوچا کرو، ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور دوسری بات یہ کہ قوت اور طاقت جو کچھ بھی جس کسی میں ہے اس کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات مبارک ہے، ظاہر ہے کہ پہلی بات کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جن شکلوں میں نعمتوں کا ظہور ہوا ہے ان کو دیکھ کر چاہیے کہ اس واقعہ کے احساس کو ہم اپنے اندر پیدا کرتے رہیں کہ ان کی آفرینش اور پیدائش سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ سب کچھ قدرت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ واقعہ ہے، باغ ہی کو دیکھئے، باغ کی زمین، باغ کے درخت، درختوں کی شاخیں، پتے، پھول، پھل اسی طرح وہ سارے اسباب جنہیں باغ کی نشوونما بار آوری میں دخل ہے، ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے آدمی پیدا کرتا ہے باغ تو خیر باغ ہی ہے۔ ایسی چیزیں جنہیں ہم انسانی مصنوعات خیال کرتے ہیں بلکہ جن مصنوعات کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلاں کی ایجاد ہے، مثلاً ریل گاڑی اور اس کے انجن ہی کو لیجئے انجن کے اجزاء لوہا، تانبا، پیتل، انجن کے فولادی و چوبی عناصر اور اس کے سوا جو چیزیں اس کے بنانے میں استعمال ہوتی ہیں کیا ان میں سے کسی ایک چیز کے پیدا کرنے والے ہم ہیں، اسی طرح انجن جن چیزوں سے چلتا ہے، یعنی آگ ہو یا پانی، کیا آدمی ان کا پیدا کرنے والا ہے، پانی کو آگ پر چڑھانے سے اسٹیم پیدا ہوتی ہے، کیا پانی اور آگ میں یہ خاصیت آدمی کی رکھی ہوئی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ بھی قدرت ہی کا ایک بنایا ہوا قانون ہے، اسٹیم میں حرکت پیدا کرنے کی قوت ہے کیا اس قوت کو آدمی نے پیدا کیا ہے؟ سوچتے چلے جائیے، اگر آپ حقیقت پر نظر جماتے ہوئے سوچیں گے، تو بالآخر ہر سوال کے جواب میں آپ کو یہی ماشاء اللہ کہنا پڑے گا، یعنی سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اور یہی قدرت کی یہ کرشمہ پردازیاں ہیں[1]، تو پہلے فقرے ماشاء اللہ کا مطلب ہوا، رہی دوسری بات یعنی

---

[1] یہ ذہن میں اگر سما جائے کہ جن ایجادات و اکتشافات کو ہم اپنی ذہنی و دماغی قابلیتوں، فکر و خوض کی محنتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں کیا واقعی وہ ہمارے فکری نتائج ہوتے ہیں، میں آپ کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہوں، ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جدید مصنوعات وایجادات یا اکتشافات جن لوگوں کی طرف منسوب ہیں، زیادہ تر میرا خیال ہے کہ اگر صد فی صد نہیں تو ۹۰ فی صد کے قریب وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں باضابطہ تعلیم کا یا تو سرے سے موقع ہی نہیں ملا، یا کچھ تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم کسی نے حاصل بھی کی ہے یا تو عام طور پر علمی تعلیم یا خطبات کے متعلق ان کی تعلیم صفر کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

"لا قوۃ الا باللہ" اس وسوسہ کے ازالہ کی طرف اشارہ ہے جو عموماً ایسے موقع پر دلوں میں پیدا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، خیال یہ گزرتا ہے کہ یہ تو سب کچھ قدرتی پیداوار ہیں، اور قدرتی قوانین ہی کے نتائج، لیکن انسان جب تک ان قوانین کا علم نہ حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے بعد اپنی محنت و توجہ کو ان پر صرف نہ کرے، عقل کی ترکیبوں اور ذہن کی تجویزوں کو ان میں نہ لگائے، انجن کا وجود نہیں ہو سکتا، اور انجن ہی کیا، باغ میں جب تک باغبانی کے قواعد و قوانین کی پابندی نہ کی جائے گی اس وقت تک [illegible] اس کے پھلنے پھولنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، اور اتنا حصہ ان چیزوں میں یقیناً آدمی کا ہے، اسی وجہ سے ان چیزوں کو انسانی مصنوعات وایجادات میں لوگ شمار کرتے ہیں، ورنہ اتنا احمق کون ہو گا جو یہ کہتا ہو کہ انجن کے لوہے یا اس میں جو آگ جلتی ہے، جو پانی خرچ ہوتا ہے، ان چیزوں کا پیدا کرنے والا یا مہیا کرنے والا آدمی ہے۔

دراصل اسی کے متعلق اس دوسرے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ ٹھیک ٹھیک حقیقت اور واقعہ کے بالکل مطابق اپنے علم کو کر لیا جائے، یعنی یہ سوچنا چاہیے کہ بلا شبہ ان باغوں کے ظہور میں انسانی ترکیبوں اور تدبیروں کو دخل ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ ان ترکیبوں اور تدبیروں کا تعلق انسان کی جن علمی و عملی قوتوں سے ہے، خود ان قوتوں کا پیدا کرنے والا کون ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم جب خود اپنے پیدا کرنے والے نہیں ہیں تو ان قوتوں کے پیدا کرنے والے ہم کیسے ہو سکتے ہیں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہیں، بلکہ جو ہمارا پیدا کرنے والا ہے، ظاہر ہے کہ اسی کے ارادہ و مشیت سے ہماری ان قوتوں کا بھی تعلق ہے "لا قوۃ الا باللہ" دراصل اسی واقعہ کی یافت کا نام ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

حیثیت رکھتی ہے، ہماری بیسویں صدی کے [illegible] اس پر یہ [illegible] سے کہ وہ واقف نہیں، سوال یہی ہے کہ اگر آدمی کی فکری و عقلی قوتوں کے نتائج یہ ایجادات ہیں تو چاہیے کہ عقلی قوتوں کی تربیت کا جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم [illegible] ملتا ہے، ان کا دماغ ایجاد کرنے میں سبقت کرتا۔ لیکن جب واقعہ نہیں ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ ان اکتشافات وایجادات کو ہم کس چیز کا نتیجہ قرار دیں، دوسری بات جس کے سامنے میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، شاید دوسرے بھی جانتے ہوں کہ ان ایجادات و اکتشافات کے متعلق ایک عجیب بات دیکھی گئی ہے کہ عموماً کسی ایک ایجاد کا خیال کسی ملک میں کسی شخص کے دماغ میں جب آیا تو ٹھیک ان ہی دنوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بالکل دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں سے بھی کسی کے دماغ میں بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں اس ایجاد کا خیال آیا، دہلی کے مشہور رسالہ [illegible] کی اشاعت [illegible] میں ایک مضمون میں اسی توارد کے متعلق شائع ہوا ہے، [illegible] سے مقالہ نگار نے [illegible] (۲۰۰) ایجادوں کے متعلق ثابت کیا ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو مختلف ملکوں کے باشندوں کو ان کا توارد ہوتا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک بات کسی کو کچھ سوجھائی، ٹھیک اسی ہفتہ میں دیکھا گیا کہ انگلستان کا ایک آدمی بھی اپنے دماغ میں یہی خیال کر رہا ہے، غور کیا جائے کہ اس توارد کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شکر کے سلسلے میں بھی حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کر لی جائے
اور اس سلسلہ میں واقعہ جب یہ ہے کہ ان نعمتوں کی شکل میں جو کچھ ہم سے باہر ہے وہ تو "ما شاء اللہ" کا اور جو
کچھ ہمارے اندر ہے وہ "لا قوۃ الا باللہ" کا مظاہرہ ہے، اور سچ یہی ہے، یوں بھی ہر شخص کے لحاظ سے
یہ سارا عالم بجز "ما شاء اللہ" کے یعنی جو کچھ ہے سب اللہ کا چاہا ہوا ہے، اس کے سوا اور کیا ہے، یہ تو باہر کا
حال ہے، اسی طرح ہر شخص کے اندر جس قسم کی قوتیں، طاقتیں، کمالات و صفات پائے جاتے ہیں ظاہر
ہے کہ سب کچھ "لا قوۃ الا باللہ" ہی کی ترجمانی ہے، گویا ان ہی دو فقروں میں سارا عالم آفاقی ہو یا انفسی
یعنی آدمی کے باہر ہو یا اندر دونوں کا کامل علم سمٹ کر آ گیا ہے، اسے سمجھنے والے جتنا زیادہ سوچتے چلے
جائیں گے، اسی حد تک اس علم کی واقعیت ان پر واضح ہوتی چلی جائے گی، اور جو اپنے علم کو اس طریقہ
سے واقعات کے مطابق کرے گا، ظاہر ہے کہ اب اس کے بعد جس صحیح راہ عمل کا مطالبہ بخشنے والے نے
رزق پانے والوں سے کیا ہے، وہ خود بخود ان کے علم کا ایک منطقی نتیجہ کی حیثیت اختیار کر لے گا
یعنی یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ جن راہوں اور جن ذریعوں سے ان نعمتوں کو آدمی حاصل کرتا ہے، وہ دونوں
میری نہیں، بلکہ براہ راست حق تعالیٰ ہی کی ہیں، تو خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقہ
عمل اختیار کرنے میں اسے کیا دشواری پیش آئے گی، ہاں جنہوں نے اپنے علم کو واقعات کے مطابق
کرنے کی کوشش نہ کی ہو، یا علم تو ان کا درست ہو چکا ہو، مگر یقین کی کیفیت جیسی کہ چاہیے ان میں حاصل
نہ ہوئی ہو، وقت اگر کچھ بھول چوک ہو سکتی ہے تو انہی سے ہو سکتی ہے۔ بلکہ اسی علم کو مستحکم اور قلوب میں پوری قوت
کے ساتھ جاگزیں کرنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابی رسول کے سوال میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے، ظاہری اعضاء سے
بھی شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے جیسا معلوم ہے۔ بخاری کی روایت ہے
[illegible]
نیز کھانے پینے الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن
دعائیہ فقروں کو مسلمانوں کے لئے چھوڑا ہے، سب کا مطلب وہی ہے کہ جس طرح بھی ہو مسلمان
اپنے خدا کی نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے، اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے
رہیں، اور عمل کو اسی کے مطابق کرنے کی یہی تجربی و نفسیاتی راہ ہے، اور صرف زبان ہی نہیں بلکہ روایتوں میں جو یہ آتا ہے
کہ تمام نعمتوں میں جو سب سے بڑی نعمت خدا کے کسی بندے کو مل سکتی ہے یعنی "مغفرت" جب
قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بشارت حق تعالیٰ کی طرف سے سنائی گئی تو نمازوں کے
متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتغال اور زیادہ بڑھ گیا۔ پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو فرمایا

افلا اکون عبداً شکوراً — کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہی نہیں بلکہ دوسرے اعضاء و جوارح سے بھی شکر کی مشق کر کے اپنے
باطنی احساس کو جگائے رکھنا چاہیے۔
بہر حال مقصود اصلی سب کا آخر میں وہی عمل کی تصحیح ہے جس کے لئے علم کی تصحیح کرائی جاتی ہے

اسی باطنی احساس کو مسلسل زندہ و بیدار رکھنے کے لئے مذہب نے علاوہ دل کے چاہا ہے کہ لوگ زبان سے بھی
اعضاء سے بھی الغرض ہر اس ذریعہ سے جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد ملے کام لینا چاہیے تاکہ بسیطی رزق کی
صورت میں ضروریات میں صرف ہونے کے بعد آدمی کا جو حصہ لوگوں کے پاس پس ماندہ رہ جاتا ہے۔
اس کے صحیح استعمال میں آسانی ہو، یہی رزق مسعود کی ذمہ داری ہے، اور اس کا وہ ابتلاء و امتحان ہے
جس سے بسیطیوں کو دوچار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے، اجمالاً اس سارے کاروبار کا نام خواہ عملی
شکل میں ہو یا علمی، پھر زبان سے ہو یا جوارح سے اس کا تعلق ہو سب کا نام "شکر" ہے۔ قرآن میں
بسیطیوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اس کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے کہ
پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام جنہیں حق تعالیٰ نے بسیطی زندگی عطا فرمائی تھی، بارگاہ الٰہی میں
التجا فرماتے کہ

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک — میرے پروردگار! میرے دل میں یہ بات
التی انعمت علیّ — ڈال دے کہ جس نعمت سے آپ نے مجھے
سرفراز فرمایا ہے، اس کا شکر ادا کروں۔

قرآن میں اس کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے، خصوصیت کے ساتھ تاذن کا لفظ اعلان کرتے ہوئے
استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ منادی کر دی گئی ہے، یعنی اسی شکر کے متعلق فرمایا گیا ہے،

واذ تاذن ربکم لئن شکرتم — اور جب منادی کی تمہارے مالک نے
لازیدنکم — کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو
بڑھاتا ہی چلا جاؤں گا۔

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ دینے والے کی مرضی کے مطابق جو طریقۂ عمل اس کی دی ہوئی چیز کے متعلق آدمی
اختیار کرتا ہے اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے، جتنا زیادہ اس عمل میں وہ امانت داری کا اظہار کرے گا،
اسی قدر زیادہ اس کے سپرد بھی کیا جائے گا، لیکن بجائے اس کے اگر دینے والے کی مرضی کے خلاف
خیانت سے کام لے گا تو قرآن میں اسی مطالبہ شکر کے بعد دھمکی دی گئی ہے۔

ولئن کفرتم ان عذابی — اور اگر تم ناشکری کرو گے تو یاد رکھو کہ
لشدید — میرا عذاب بہت سخت ہے۔

جس کا تفصیلی قصہ ان شاء اللہ عنقریب سنایا جائے گا!
بہر حال بسیطی رزق کی حقیقی ذمہ داری درحقیقت یہی فریضۂ شکر ہے۔ اس کے سوا اور جو کچھ بھی ہو
وہ اسی فریضۂ شکر کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے اب ان ذمہ داریوں
کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق قدری رزق سے ہے۔
قدری رزق کی ذمہ داریاں: جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اور پھر کہتا ہوں کہ "قدری رزق"
کے متعلق عام خیال لوگوں کا کچھ ایسا ہے کہ رزق کی تنگی یا معاشی ضیق، بالفاظ دیگر جس کی تعبیر غربت و

فلاکت سے کی جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رزق کا یہ حال بجائے خود ایک ابتلاء اور ایسا ابتلاء ہے جس میں مبتلا ہونے والے کے لئے یہی ابتلاء کافی رسوائی ہے، ایسی حالت میں ان پر مزید ذمہ داریوں کے اضافہ کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ مشہور ہے کہ

خداوند روزی بحق مشتغل

یعنی روزی میں جو کشائش و وسعت رکھتے ہیں، ان کو تو خدا اور خدا کے احکام کی تعمیل کا موقعہ حاصل ہے، اسی لئے مذہب نے ان پر اگر ذمہ داریاں عائد کی ہیں تو وہ اس کے مستحق ہیں، لیکن غریب قدری رزق رکھنے والا جس کا عمومی حال یہ ہو کر سر چھپاتا ہے تو پاؤں کھلتے ہیں، ایک جگہ کو سیتا ہے تو دوسری جگہ ادھڑ جاتی ہے، جس کی معاشی زندگی اس ادھیڑ بن کی شکار ہو، ظاہر ہے کہ ایسے

پراگندہ روزی پراگندہ دل

آدمی سے مزید اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے؟

بظاہر یہ ایک لگتی ہوئی بات بھی معلوم ہوتی ہے، بقول ایک دل جلے انگریز کے اسی غربت و فلاکت کا ذکر کرتے ہوئے جھنجھلا کر اس نے لکھا تھا

> غربت کی کشمکش کرنے سے قلب کی صفائی ہوتی ہے، یہ بعض لوگ کہتے ہیں
> حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اس کش مکش سے سابقہ نہیں پڑا ہے
> ورنہ تمام کش مکشوں میں جن میں کسی انسان کو پھنسایا جا سکتا ہے۔ یہ
> (غربت و افلاس) سب سے زیادہ پست، اور ذلیل کرنے والی کشمکش ہے۔
> (داستان دہقان ص ۲۲۸ مصنفہ ڈارلنگ)

سعدی نے بھی مختلف پیرایوں میں اسی خیال کو ادا کیا ہے، ان کا زبان زد عام شعر اسی سلسلے کا یہ بھی ہے ؎

شب چو عقد نماز می بندم — چہ خورد بامداد فرزندم

اور گو محدثین کے اصول پر ان مشہور اقوال کا آثار و ثبوت سے ہونا مشتبہ ہے، لیکن بہرحال مسلمانوں میں مشہور ہے اور اسلامی بزرگوں نے اپنی کتابوں، اپنی گفتگوؤں میں انھیں عموماً استعمال کیا ہے، مثلاً

کاد الفقر ان یکون کفراً — قریب ہے کہ ناداری اور محتاجی کفر ہو جائے

یا

الفقر سواد الوجہ فی الدارین — محتاجی اور ناداری دونوں جہان کی روسیاہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو دعائیں اسانید کے ساتھ منسوب ہیں، ان دعاؤں میں سے ایک دعا میں یہ الفاظ بھی پائے جاتے ہیں یعنی اللھم انی اعوذ بک من فتنۃ الفقر (اے اللہ میں فقر و محتاجی کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں) بعض دعاؤں میں یہ بھی ہے کہ آپ فرماتے۔

اقض عنی الدین واغننی من الفقر۔ — مجھ سے میرے قرض کے بار کو ٹال دیجئے اور محتاجی سے مجھے بے نیاز کیجئے۔

کیا پوچھئے تو قدری رزق کے ان ہی حالات کی طرف مذکورہ بالا اقوال اور حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن کے متعلق اس انگریز نے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدری رزق کے بعض مدارج ایسے ہولناک جان گسل روح فرسا ہوتے ہیں کہ اس وقت کسی قسم کی کوئی نصیحت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

قدری رزق کے دراصل یہی جو عوارض و آفات ہیں جن کی ذمہ داریاں بجائے قدریوں کے اسلام نے ان لوگوں پر عائد کی ہیں، جو بسط کے پیمانے پر قدرت کی طرف سے روزی پا رہے ہیں، ہر ملک اور ہر آبادی کے ان طبقات کو جو بسطی معاش سے سرفراز ہیں، ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ ان سے لیا جائے گا اور ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا، جو ان ہی کے ساتھ ان ہی آبادیوں میں قدری زندگی گذار رہے ہیں، اسلام کو اپنے اصول پر اتنا اصرار ہے کہ قدریوں کے اسی حق کو بسطیوں سے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ میں تلوار تک اٹھائی، الزکوٰۃ کے نام سے بسطی آمدنی رکھنے والوں پر باضابطہ قانون کی شکل میں ایک ایسا فرض (زکوٰۃ) عائد کیا گیا ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اسلام کے چار اہم ارکان میں وہ ایک بڑا اہم رکن ہے، اسی قسم کا اہم رکن کہ عہد صدیقی میں باضابطہ اعلان جنگ ان لوگوں کو دے دیا گیا تھا جو قدریوں کے اس حق سے گریز کرنا چاہتے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفہ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ایک ڈوری بھی اس حق کی اگر دبالی جائے گی، تو ان پر قتال اور ان سے جہاد کیا جائے گا۔

اور صرف الزکوٰۃ ہی نہیں، ہر آبادی کے ارباب بسط پر صدقۃ الفطر کے نام سے جو صدقہ واجب کیا گیا ہے اور اس طور پر واجب کیا گیا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے یہ صدقہ نکالا جائے جن کا آدمی کفیل ہوتا ہے، ہر سال تقریباً کروڑہا کروڑ روپے کی شکل میں دنیا کے مسلمان اس صدقہ کو ادا کرتے ہیں، اور گو مقصود بالذات قربانی سے صدقہ نہیں ہے، لیکن قرآن میں

واطعموا البائس الفقیر — اور کھلاؤ (قربانی سے) مصیبت زدہ محتاج کو۔

کا جو حکم قربانی ہی کے متعلق پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک بڑا مقصد قربانی کا یہ بھی ہے کہ قدری رزق رکھنے والوں کو بسطیوں سے امداد دلائی جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الزکوٰۃ کی مستقل مد کے سوا قدریوں کی امداد کی اور بھی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ — مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ یہ فرما کر

ثم تلا لیس البر ان تولوا — صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی وہ آیت تلاوت کی

ما تحبون۔	جس کو تم چاہتے ہو نیکی کو ہرگز نہ پا سکو گے
	جب تک وہ خرچ نہ کرو جسے تم چاہتے ہو۔

اور اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول یعنی

اذا ادیت زکوٰۃ مالک فقد قضیت	تم نے جب زکوٰۃ ادا کر دی، تو تم پر جو حق
ما علیک۔	تھا اسے پورا کر دیا۔

یہ صرف حکومت کے اس مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے جسے امیروں سے غریبوں کے لئے وصول کرنا اسلام نے واجب ٹھیرایا ہے، یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد حکومت اب امیروں سے مطالبہ نہیں کر سکتی، خود قرآنی آیت

ان تبدوا الصدقات فنعما	اگر صدقات کھلے بندوں ادا کرو تو یہ بھی
ہی وان تخفوھا وتؤتوھا	اچھا ہے، اور اگر اسے چھپاؤ اور فقراء کو دو
الفقراء فھو خیر لکم ویکفر	تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور دفع
عنکم سیئاتکم۔	کرے گی یہ پوشیدہ خیرات تمہاری برائیوں کو۔

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جسے علانیہ کھلے بندوں دیا جائے، اور یہ بات اسی صدقہ میں پائی جا سکتی ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اور دوسری قسم الصدقات کی وہ ہے جسے چاہئے کہ آدمی چھپا کر ادا کرے، قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں کا ازالہ اس خفیہ صدقہ سے ہوتا ہے جو آدمی کو بری معلوم ہوتی ہوں کہ "السیئات" بری باتوں ہی کو کہتے ہیں، ان حدیثوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جن میں خبر دی گئی ہے کہ بلاؤں کو صدقہ کے ذریعہ سے ٹالا جا سکتا ہے یا صدقہ خدا کے غصے کو بجھا دیتا ہے، اغلباً یہ خاصیت خفیہ صدقات ہی کی بیان کی گئی ہے، تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ صدقات کی اسی قسم کے متعلق غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ اسے اس طریقہ سے لوگوں کو دیا کرو کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں کو نہ ہو، صرف یہی نہیں بلکہ آئندہ قانونی ابواب میں آپ پائیں گے کہ عام خیر و خیرات صدقات کے سوا اسلام نے قرض کو بھی نیکی کی ایک بڑی اہم مد قرار دی ہے اتنی اہم کہ قرض چاہنے والوں کی طرف سے قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر خدا نے خود قرض کا مطالبہ فرمایا ہے

من یقرض اللہ قرضا حسنا	کون اللہ کو اچھا قرض دیتا ہے، تو
فیضاعفہ لہ۔	بڑھائے گا اللہ اس کو۔

قرآن میں تو صرف قرض ہی کی حد تک یہ فرمایا گیا ہے، لیکن مشہور حدیث جس میں بیماروں اور عام حاجت مندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشہور روایت ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ اپنے بندوں سے فرمائیں گے۔

یا ابن آدم استطعمتک فلم	اے آدم کے بچے! میں نے تجھ سے کھانا
تطعمنی قال یارب کیف اطعمک	مانگا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا، بندہ کہے گا الٰہا
وانت رب العالمین قال اما	میں آپ کو کیسے کھلاتا آپ تو خود

علمت انہ استطعمک عبدی	سارے جہان کے پالنے والے ہیں، تب
فلان فلم تطعمہ اما علمت	خداوند تعالیٰ فرمائیں گے، تجھے کیا اس کی
ان لو اطعمتہ لوجدت	خبر نہ تھی کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے
ذالک عندی۔	کھانا طلب کیا تو تو نے اسے نہ کھلایا

کیا تو نہیں جانتا تھا کہ اگر اس شخص کو تو کھلاتا تو پاتا تو اس کھانے کو میرے پاس۔

اسی طرح پیاسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان حاجت مندوں کی جگہ قائم فرما کر پانی کا مطالبہ کیا ہے، سمجھا جا سکتا ہے کہ ان ذمہ داریوں کو جو قدرتیوں کی طرف سے بے بسوں پر عائد ہوتی ہیں، کتنی اہمیت عطا فرما دی ہے، غالب مرحوم نے شاید اسی حدیث کے مطلب کو اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب	تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اور قدرتی رزق کی پیچیدگیوں کے حل کی صرف یہی صورتیں اسلام نے اختیار نہیں کی ہیں، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ باوجود مقدرت و اقتدار کے پیغمبر اور پیغمبر کے جانشینوں (صلوات اللہ علیہم وسلامہ) نے زندگی کے جس نمونے کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، کھانے پینے، پہننے، رہنے سہنے کا جو معیار قصداً اختیار فرمایا گیا تھا، اس کی ایک مصلحت اگر یہ بھی بتائی جائے کہ غریبوں یعنی قدری معیشت رکھنے والوں کی دلجوئی و تسکین خاطر بھی اس طرز عمل سے مقصود تھی، تو ایسا سمجھنے کے کافی وجوہ موجود ہیں، آخر خود ہی غور کرنا چاہئے کہ جس کا دعویٰ ہو کہ اوتیت مفاتیح خزائن الارض (بخاری) مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، اور یوں بھی خدا کی طرف سے ہر قسم کی روحانی اور مادی قوتوں سے جو ہستی سرفراز تھی، کیا اسی کے متعلق مجبوری اور معذوری کا ہلکا سا وسوسہ بھی ہو سکتا ہے[1]! جن مسلمانوں کو خبر دی گئی ہے کہ زمین کو سونا بنانے کا اختیار بھی آپ کو سپرد کیا گیا تھا، احد پہاڑ نے چاہا تھا کہ اپنی تمام چٹانوں کے ساتھ زر خالص کی شکل آپ کے لئے اختیار کرے، اور جو مسلمان نہیں ہیں کم از کم ان کو تو سب ہی کو ماننا ہی چاہئے کہ جس پیوند دوز کمبل اور کھجوروں کی شاخوں سے چھائے ہوئے مکان میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات جس وقت ہوئی تھی، اس وقت اگر وہ چاہتے تو دس دس مربع میل کے بادشاہ کی حیثیت کا لباس اور مکان بھی رکھ سکتے تھے۔ مگر آخر وقت تک نہ خود اس اقتدار سے فائدہ اٹھایا، اور نہ اپنے خاندان والوں کو اس سے استفادہ کا موقع عطا فرمایا، ان کی چہیتی صاحبزادی بھی

---

[1] اسبکی نے قاضی عیاض کے حوالے سے ادریس کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اصفہان کے رہنے والے ایک شخص صالح نامی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان زہدہ صلعم لم یکن قصداً وانما کان لعدم قدرتہ علی الطیبات لاکلھا (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زاہدانہ زندگی قصد و اختیار کا نتیجہ نہ تھی، آپ بھی اگر اچھے کھانوں کے کھانے کی قدرت رکھتے تو ضرور کھاتے) گویا فقر کو وہ مجبوری و معذوری کا نتیجہ قرار دیتا تھا، لکھا ہے کہ اس رسالے کے علمائے اندلس نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور وہ مصلوب ہو کر مارا گیا (دیکھو کتاب تتمۃ المختصر ابن الوردی ص ۲۹ ج ۲)

طرف سے مذہب نے ان پر عائد کیا ہے۔

بہر حال قدری معیشت کی دشواریوں کو سہولتوں سے بدلنے کے لئے یہ تو اسلامی ہدایتوں کا وہ سلسلہ تھا، جن کا خطاب بجائے قدریوں کے بسیلیوں سے ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جن جاں فرسا پیچیدگیوں اور کشمکشوں میں قدری زندگی آدمی کو مبتلا کر دیتی ہے، ان کے حل کے لئے اسلامی دستور کے یہ قوانین کافی ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ عمل کرنے والے جیسا کہ چاہئے ان پر عمل بھی کریں، اور قدرت نے جو ذمہ داریاں ان پر ڈالی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کو بسیلی پیمانے پر روزی پانے والے طبقات اپنا فرض خیال کریں مقصد یہ کہ جو حقوق بسیلیوں کی آمدنیوں میں، اسلام نے قائم کئے ہیں، حکومتیں ان حقوق کو حاصل کر کے حقداروں تک پہنچانے کا باضابطہ نظم اگر قائم کر دیں، اور یہی براہ راست جو مطالبات اس سلسلہ میں بسیلیوں سے کئے گئے ہیں، ان مطالبات کی تکمیل ہوتی رہے جنہیں معاشی بلندی عطا کی گئی ہے، پستی میں رہنے والوں کے غیب سے وہ بھی اپنی زندگی کے معیار کو حتی الوسع پست ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہیں، میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قدری معیشت کی جن تلخیوں کا دنیا کو شکوہ ہے، بہت کچھ اس کے ازالے کی صورت یوں ہی نکل آسکتی ہے۔

لیکن اسلام کامل دین ہی کیوں ہوتا، اگر اسی نقطہ پر اپنی تعلیم کو ختم کر دیتا، آپ دیکھئے ایک طرف بسیلیوں کو خطاب کر کے قدری زندگی کی الجھنوں کے سلجھانے کی جو تدبیریں اس نے تجویز کی ہیں، وہ بھی کیا کم ہیں، لیکن دوسری طرف براہ راست قدری معیشت رکھنے والوں کو بھی جو ہدایتیں دی گئی ہیں، کاش! ان ہدایتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی تو غریبوں کے طبقات کو اس کا تجربہ ہو سکتا تھا کہ اپنی جن معاشی بے چینیوں اور قلبی کلفتوں میں وہ بسیلیوں کے بظاہر دست نگر نظر آتے ہیں، بجائے دوسروں کے بہت کچھ ان کے ازالہ کا سامان وہ خود بھی کر سکتے ہیں اور اب میں ان ہی چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

قانون مدّ عین میری ایک اصطلاح ہے، اور قرآن سے ماخوذ ہے۔ مدّ کے قانون سے میرا اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما	اور نہ اٹھاؤ اپنی دونوں آنکھوں کو ان کی
متعنا به ازواجا منهم	طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی شکل میں
زهرة الحیوة الدنیا	ہم نے متمتع بخشی ہیں، یہ پست زندگی کی
لنفتنهم فیه (طٰہٰ)	رنگ ہے اس لئے ان کو دی گئی ہیں۔
	تاکہ ہم امتحان میں ان کو ڈالیں۔

بعض الفاظ کی کمی و بیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما	اور نہ اٹھاؤ اپنی دونوں آنکھوں کو
متعنا به ازواجا منهم	ان چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے کو

ولا تحزن علیهم (الحجر)	شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا ہے
	اور نہ اس پر غم کھاتا!

ان دونوں آیات میں مدّ عین سے منع کیا گیا ہے، مدّ کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں اور عین کے معنی آنکھ، مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، جنہیں گویا بسیلی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔ اردو میں مد نظر کا لفظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو مدّ عین کا مفہوم ہے، بہرحال قرآنی الفاظ کا سرسری حاصل یہ ہوا بسیلی طبقات کی تعبیر جن الفاظ سے یہاں کی گئی ہے، غور کرنے کی یہی چیز ہے، پہلے اسے سمجھ لینا چاہئے۔

(۱) پہلی بات اس سلسلے کی "ازواجاً" کا لفظ ہے، بسیلی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اشارہ کیا گیا ہے، مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری، لباس، پوشاک، مکان وغیرہ وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی، باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود ہوتی ہے، لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا، دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے، پھر شکل و صورت، رنگ روپ کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان امیروں کے گھروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے دوسری طرف کسی کمرے میں دیکھئے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھ ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیر ہوتے ہیں، ان کی چھڑی دانیوں میں رکھا نظر آئے گا، اور یہ تو ان کا حال ہے جن کا شمار متوسط طبقات بلکہ کہئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ چھٹ بھیوں میں ہو گئے جاتے ہیں، ازواجی مذاق میں ان کی کیفیت ہے، باقی ان میں جو بڑے ہیں، ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ، اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا، ہر چیز میں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد آگئی ہے تو صرف "ازواجیت" اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سنا ہی نہیں گیا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے مقابل دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل و صورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی، چونکہ قبلہ کا رخ ہے کہ ایسی صورت میں اس دوسری بناوٹی مسجد کا کعبہ کی سمت واقع نہیں ہو سکتا تھا اس لئے واقع میں تو وہ مسجد نہ ہو سکی، لیکن دیکھنے والوں کو اگر مغالطہ ہو جائے اور شکل و شباہت سے دھوکہ کھا کر اس میں نماز پڑھنے لگیں تو کچھ تعجب نہیں!

(۲) دوسری چیز "زہرۃ الحیوۃ الدنیا" کے الفاظ ہیں "الحیوۃ الدنیا" تو ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ پست زندگی کی تعبیر ہے، رہا زہرۃ سو لغت میں اس کے معنی تازگی اور شادابی کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ

ایک تو انسان کی موجودہ زندگی کے واقعی ضروریات ہیں، یعنی ایسی ضرورتیں جن کے بغیر اپنی زندگی کو آدمی گذار نہیں سکتا، معاشی اصطلاح میں جنہیں NECESSARY کہتے ہیں، اور دوسری چیزیں وہ ہیں جن کا اصطلاحی نام LUXURY ہے۔ سچ پوچھیے تو "زہرۃ الحیوۃ الدنیا" زندگی کے ثانی الذکر لوازم کی قرآنی تعبیر ہے۔ دوسرے مقام پر اسی کو کبھی "زینۃ الحیوۃ الدنیا" بھی کہا گیا ہے۔ یعنی زندگی کے آرائش و زیبائش سے ان کا تعلق ہے۔ ان امور کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب مذکورہ بالا آیات کے مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ بسطی طبقات کی طرف نگاہ اٹھانے سے جب ان آیتوں میں منع کیا گیا ہے تو یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ براہ راست ان آیتوں کے خطاب کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جو معاشی لحاظ سے بسطی نہیں بلکہ قدری زندگی رکھتے ہوں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بسط و قدر انسان کے معاشی مدارج کی اضافی شکلیں ہیں، اس لئے ان کے استعمال میں یہی چاہیے کہ کسی خاص حد کو متعین کر کے محدود نہ کر دیا جائے۔ بلکہ وہی بات کو اپنے آپ سے بالاتر طبقات کے حساب سے جو لوگ یہ پاتے ہوں کہ معاشی لحاظ سے وہ فقر اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، وہی ان آیتوں کا اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں جن کی طرف حق تعالیٰ نے راہنمائی فرمائی ہے۔

مقصود تو ان آیتوں سے یہی ہے کہ ہر شخص کو معاشی جد و جہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ تاپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائیگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں لوگ مبتلا نہ کریں، گویا دوسرے الفاظ میں وہی بات جس کی طرف قرآن ہی کی آیت

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ	اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے
بعضکم علی بعض ۔	خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے۔

میں توجہ دلائی گئی ہے۔ میں نے بھی کہیں لکھا ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی پوری ہونے کے باوجود دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں، وہ دنیا میں اگر تنہا پیدا ہوتے، اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا، پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی مسرور ہوتا، کیوں نہیں آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گذاریں، تجربہ بتا دے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدری معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے، ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہو گا کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ تھا۔ لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مذکورہ بالا آیات کے جن الفاظ کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے ان پر غور کیجیے نظر آئے گا کہ ان الفاظ کا اضافہ بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے آخر سوچیے کہ بسطیوں کے جن حالات کو دیکھ دیکھ کر قدریوں کا گروہ محزون و مغموم رہتا ہے، تجزیہ کے بعد ان کی حقیقت کیا وہی نہیں ہے کہ زیادہ تر ان میں وہی ازواجی مذاق یعنی ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں رکھنے، اور ہر شے کے متقابل کے مہیا کرنے کے شوق سے ان کا تعلق ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک قسم کی

ابلہی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے، تاجروں اور کاریگروں، کارخانہ داروں سے پوچھیے، وہی ازواجی پہلوؤں کے اس راز سے خوب واقف ہیں، اسی لئے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں اور قالبوں میں ڈھال ڈھال کر وہ ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، اور ان بیچاروں کی اسی ذہنیت سے جو ازواجیت کے ذوق کی بنا پر پیدا ہوتی ہے فائدہ اٹھاتے ہیں، بسطیوں کو جو کچھ دیا گیا ہے جو اس کی اس واقعی حقیقت پر متنبہ ہو جائے گا جس کی طرف قرآن نے "ازواجاً" کے لفظ سے اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اسی ابلہی کی ہوس اپنے اندر کیوں پیدا کرے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور حدیث

من حسن اسلام المرء ترکہ	آدمی کے اسلام کی خوبی کی یہ دلیل ہے کہ
ما لا یعنیہ۔	لا حاصل اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے۔

کا ایک مصداق آدمی کا یہ طرز عمل بھی ہے، بلکہ حدیثوں میں جو آیا ہے۔

یکفیک من الدنیا ما سد	دنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے
جوعتک ووارٰی عورتک	تیری بھوک کا ازالہ ہو جائے اور جس سے
وان کان شیء یظلک فذاک	تیری ستر پوشی ہو جائے۔ اور اسی کے ساتھ
وان کان لک دابۃ فبخ۔	اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے
(کنز العمال)	سائے میں تو رہے یعنی کسی قسم کا گھر، تو

پھر یہ تو بہت ہی، اسی کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔

اس میں بھی اسی حقیقت کی یافت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب اس کے بعد "زہرۃ الحیوۃ الدنیا" کے الفاظ پر غور کیجیے، میں نے عرض کیا تھا کہ اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں "زینۃ الحیوۃ الدنیا" سے بھی کی گئی ہے۔ یعنی جن سرمایوں کو بسطیوں کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ اس کا تعلق بھی زندگی کی ضرورت سے نہیں، بلکہ زینت سے ہے، جن لوگوں کو حیات دنیا کی زینت دی گئی ہے، اس زینت کے استعمال سے تو ان کو منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ منع کرنے والوں کو ملامت کیا گیا ہے، جس کا ذکر اپنے مقام پر آ چکا ہے، لیکن سوال ان لوگوں کے متعلق ہے جو حیات دنیا کی اس زینت یا زہرہ سے محروم ہیں، کیا ان کی محرومی اس قابل ہے کہ اس پر حزن کیا جائے، اور اس حزن و ملال کو مٹانے کے لئے زینت ہی کو اپنی زندگیوں کا مقصود بنا لیا جائے؟ قرآن میں سخت تہدیدی لہجہ میں یہ فرماتے ہوئے

تریدون زینۃ الحیوۃ الدنیا	کیا اس پست زندگی کی زینت کو تم
اپنا مقصود بناتے ہو۔	

حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیوں روکا گیا ہے؟ کیا خدا کا اس میں فائدہ ہے، جو حیات دنیا کی زینت سے جو سرفراز کئے گئے ہیں، انہیں اس کے استعمال سے جب منع نہیں کیا گیا ہے تو زینت کا استعمال ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ناراضی کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں خطاب

ان لوگوں سے ہے جن کی معاشی زندگی زینت کے اسباب سے خالی ہے، ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بلا وجہ زینت کو اپنا مطلوب بنا کر وقت کو ضائع نہ کریں۔ جب ضرورت پوری ہو رہی ہے تو غیر ضروری چیزوں کی طلب میں اپنے آپ کو دکھ میں آدمی کیوں مبتلا کرے۔ بلکہ مدِ عین والی آیتوں میں سے ایک آیت جو سورۂ طٰہٰ میں پائی جاتی ہے اس کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں

ورزق ربک خیر وابقیٰ — تیرے مالک کی روزی تیرے لئے بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو حیاتِ دنیا کی زینت کو مطلوب بنانے سے روکنے کی دوسری وجہ بھی اسی سے سمجھ میں آسکتی ہے، مطلب یہ ہے کہ زینت سے ہٹ کر اگر آدمی ان ہی ضروریات پر قناعت کرے جن کی بدولت اس کی زندگی گذرتی رہتی ہے، قرآن نے جس کا نام "رزقِ رب" رکھا ہے تو زینت کی ٹکروں سے مقابلے کے ساتھ ہی رب کی یہی روزی آدمی کے لئے خیر کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ خیر کے معنی وہی ہیں کہ وہی اس کی فطرت کے لئے بہتر اور خوش گوار بن جاتی ہے اور یہ حاصل تو خیر کے لفظ کا ہوا، رہا دوسرا لفظ ابقیٰ جو اس کے بعد ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ آدمی جب تک جیتا ہے، اس وقت تک ضروریاتِ حیات بہ مسلسل اس کے لئے مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے جب تک قدرت ان ضرورتوں کو اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے جن پر اس کی زندگی بنی ہے، اس لئے جب تک زندگی ہے اس وقت تک ان ضرورتوں کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ اور جب تک یہ ضرورتیں فراہم ہوتی رہتی ہیں، اسی وقت تک زندگی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اور زندگی کی ان ضرورتوں کو ایک دوسرے سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا بخلاف ان چیزوں کے جن کا تعلق حیاتِ دنیا کی زینتوں سے ہے، کہ زندگی کے ساتھ ان کی بقا کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا، آئے دن لوگوں کو یہ ملتی بھی رہتی ہے اور چھنتی بھی رہتی ہے، اچھے زینت والے ہیں جو چھنتے رہتے ہیں، اور حیاتِ دنیا کی ان زینتوں کے بغیر جیتے رہتے ہیں جن سے کسی زمانہ میں وہ مالا مال تھے زینت الحیوٰۃ الدنیا کو مطلوب و مقصود بنانے سے منع کرنے کا یہ دوسرا فائدہ ہے جس کی طرف "ابقیٰ" کے لفظ سے میرے خیال میں قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے، اور غالباً یہی مطلب اس حدیث کا بھی ہے۔

ماقل وکفیٰ خیر مما کثر والھیٰ (نسائی المختار) — ایسی چیز جو کم ہو لیکن کافی ہو وہ بہتر ہے اس چیز سے جو ہو تو بہت لیکن آدمی کو غفلت میں مبتلا کر دے (یعنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے غافل بنا دے)

اور یہ مطلب تو "صدق" کا ہوا، باقی اسی قانون کا دوسرا جزء جسے "عدل" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح بھی قرآن ہی کے الفاظ سے ماخوذ ہے

مقصد یہ ہے کہ قدری معیشت رکھنے والوں کو ایک تو سلبی حکم یہ دیا گیا ہے کہ طرح طرح کی نعمتوں اور حیاتِ دنیا کی تر و تازگی زیب و زینت سے جو لوگ سرفراز ہیں، ان کی طرف مدِ عین نہ کرنا چاہئے یعنی ان کی طرف ٹکٹکی باندھنے یا گھورنے سے منع کیا گیا ہے، اب اسی کے ساتھ قرآن ہی کے دوسرے

ایجابی حکم کو ملایا جائے یعنی اس قسم کی آیتوں کو جن میں سے ایک مشہور آیت یہ ہے

وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا — اور اگر اللہ کی نعمت کو تم گنو تو نہ گن پاؤ گے اس کو۔

مذکورہ بالا آیت میں نعمتوں کے عد (شمار کرنے) کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام عد کی مناسبت سے عدل رکھ دیا گیا ہے۔ مد کا قانون تو سلبی حکم پر مشتمل ہے یعنی مدِ عین سے روکا گیا ہے، اور عد والا قانون ایجابی و اثباتی ہے۔ یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈوبا ہوا ہے، ان ہی کے گنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے کہنا چاہتا ہوں کہ قانونِ مد کی تعمیل کرنے کے بعد نا یافتہ نعمتوں سے نگاہوں کو ہٹا کر یافتہ نعمتوں کو اگر آدمی شمار کرنے لگے، تو غنیوں کی طرف آنکھ اٹھانے، ان کے معاشی حال سے اپنے معاشی حال کو ناپنے کی وجہ سے قلوب میں شکوے شکایت کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف ان کا ہی ازالہ نہیں ہو جائے گا بلکہ یافتہ نعمتوں کے شمار کرنے یعنی قانونِ عد پر عمل کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ جذباتِ شکر کی مسرتوں سے دل بھر جائیں گے، بخاری مسلم وغیرہ میں جو حدیث پائی جاتی ہے یعنی

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نظر احدکم الی من فضل فی المال ..... فلینظر الی من ھو اسفل منہ۔ — تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے مال و دولت میں اس پر برتری دی گئی ہو تو چاہئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو مال و دولت کے حساب سے اس سے نیچے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ قانونِ عد ہی کی تعمیل کی یہ ایک عملی شکل ہے۔ مطلب یہی ہے کہ غنیوں کی دولت و ثروت، اور شان و شوکت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قدری معیشت سے جو لوگ غیر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور نایافتہ کی حسرتیں جن کو بے چین کرتی رہتی ہیں، ان کو چاہئے کہ ان نعمتوں کو شمار کریں جو انہیں حاصل ہیں اور ان حاصل شدہ نعمتوں کے شمار کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو چاہئے ان لوگوں کو دیکھے جو نعمتوں کے حساب سے اس سے بھی فروتر درجہ میں ہیں، سعدی نے جس کی مثال دی ہے کہ بغیر جوتے کے ایک دن راہ چلنے کا مجھے اتفاق ہوا، اپنے افلاس کا دل میں شکوہ پیدا ہوا تھا کہ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس حال کو دیکھ کر

سپاس نعمت حق بجا آوردم و بے کفشی صبر کردم۔ — اللہ کی نعمت کا شکر بجا لایا اور جوتے کے نہ ہونے پر دل کو صبر ہو گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدری معیشت کی طرف جن جن تکلیفوں کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے بعد صرف زائل ہی نہیں بلکہ زحمتیں راحتوں سے بدل جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس حدیث کے راویوں میں عون بن عبداللہ بن عتبہ بھی ہیں، صاحب جمع الفوائد نے ان کا یہ

ذاتی تجربہ نقل کیا ہے، یعنی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا،

صحبت اصحاب الاغنياء فما كان احد اكثر هما مني كنت ارى دابة خيرا من دابتي وثوبا خيرا من ثوبي فلما سمعت هذا الحديث صحبت الفقراء واسترحت۔
(مجمع الزوائد ص ۲۵۵ ج ۱۰)

میں پہلے امیروں کی صحبت میں زندگی گذارا کرتا تھا، اس زمانے میں مجھ سے زیادہ غم والا آدمی کوئی نہ ہوگا، میں دیکھتا کہ دوسروں کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اور دوسروں کے کپڑے میرے کپڑوں سے اچھے ہیں، لیکن جب سے میں نے یہ حدیث سنی، میں نے فقیروں کی صحبت اختیار کی، میں اس دن سے چین میں ہوں۔

قدری معیشت اور قانون صبر

اور اب سمجھا جا سکتا ہے کہ اس صبر کا کیا مطلب ہے؟ جس کا مطالبہ اگرچہ ان تمام کشمکشوں، پریشانیوں، مصیبتوں میں کیا گیا ہے، جو موجودہ زندگی کے کسی شعبہ میں پیش آتی ہیں یا آ سکتی ہیں، لیکن ان ہی پریشانیوں میں قدری معیشت کی پریشانیاں بھی ہیں جن کے متعلق قرآن میں اسی صبر کے قانون سے استعانت اور امداد حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، صبر سے جن جن مقامات میں کام لینا چاہیے ان میں "اموال کے نقص" کا بھی قرآن نے تذکرہ کیا ہے، اور جو لوگ قدری معیشت کی پریشانیوں میں صبر سے کام لیتے ہیں

الصابرين في البأساء والضراء۔

یعنی جو تنگی معاش اور سختی تکلیفوں کے وقت صبر کرنے والے ہیں۔

کے ذیل میں شمار کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے؛

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "تقدیر کے قانون" کو سمجھنے کے بعد قدری معیشت رکھنے والوں کے لئے "صبر" کے مطالبہ کی تکمیل میں غور کرنا چاہئے کیا اب بھی دشواری پیش آ سکتی ہے؟ آخر "صبر" کا کیا مطلب ہے؟ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے یعنی

حبس النفس عن الشکوی (ص ۱۳۵ ج ۴) — اپنے جی کو شکوہ گلہ سے روکے رکھنا۔

ظاہر ہے کہ "تقدیر کے قانون" کا علم جن الفاظ میں قرآن نے عطا کیا ہے، جس کی تشریح گذر چکی، اس علم کی روشنی میں "صبر" کے مقام تک آدمی قدرتی طور پر پہنچ جاتا ہے، میں بتا چکا ہوں کہ ان قوانین سے علم کی تصحیح کے بعد شکوہ شکایت کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، بلکہ بجائے اس کے دل کو شکرگزاری کے جذبات سے معمور بنایا جا سکتا ہے۔ "صبر" غریب کا جن لوگوں نے "داروئے تلخ" نام رکھ چھوڑا ہے، حتیٰ کہ بعضوں نے تو صبر کے اس لفظ تک کو عربی زبان کے لفظ "صِبر" سے ماخوذ قرار دیا ہے، جو ایلوا جیسی تلخ چیز کا نام ہے۔ پھر اس تلخی کو مٹانے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں سے دنیا کے اکثر ادبیات میں کام لیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم و تربیت کا اسلام نے جو طبعی طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی عمل کی تکمیل کے لئے علم کی تصحیح یہاں بھی

اسی طریقۂ کار کو اختیار کرنے کے بعد آپ نے دیکھا کہ "صبر" کا عمل اس علم کا ایک لازمی منطقی نتیجہ بن جاتا ہے، جو تقدیر کی آیتوں سے ہمیں بخشا گیا ہے، یعنی اسفلی معیشت والوں کی دولت و ثروت کو دیکھ دیکھ کر قدری معیشت والوں کو جو کوفت اور دکھ ہوتا رہتا ہے، دکھ کا یہ کانٹا نکل جاتا ہے، ایک سکون میسر آتا ہے، ایسا سکون جو لوگوں کے سامنے اپنے افلاس اپنی تنگ دستی کے اظہار سے آدمی کو بے نیاز بنا دیتا ہے یہی مطلب ہے کہ صبر کا مطلب ہے۔ ورنہ جو چیزیں آدمی کو میسر نہیں ہیں، ان کے لئے جد و جہد کرنا خواہ جزئی اسباب کی راہ سے سعی و کوشش کی جائے یا کائناتی پیداوار جس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ اور تمام جس کا مسبب الاسباب ہے اس کے آگے عرض و معروض کر کے ان چیزوں کے حصول کی تدبیر اختیار کی جائے یعنی دعا کی جائے، صبر کے منافی ذرہ برابر نہیں ہے، سعی و عمل کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا پہلے کہہ چکا ہوں، رہی دوسری تدبیر یعنی مسبب الاسباب ہی سے براہ راست ان کو مانگنا اور طلب کرنا سو اس کا حکم تو قرآن ہی میں ہے، اسی آیت کے بعد جس میں مدِّ عین سے منع کیا گیا ہے، ارشاد ہے

واصطبر لعبادته نحن نرزقك والعاقبة للتقوى۔

اور اپنے مالک کی عبادت پر ڈٹا رہ، ہم تجھے روزی پہنچائیں گے، اور اچھا انجام تقویٰ پرہیزگاری کا ہے۔

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ارباب ثروت و دولت کی طرف ٹکٹکی باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر اور اپنے آپ کو ان سے ناپ تاپ کر لوگ اپنے ہاتھوں خود کو ذہنی کلفت اور دماغی کوفت میں مبتلا کر لیتے ہیں، بلکہ بجائے اس کے قرآن حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہو، عبادت کی تشریح کرتے ہوئے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے الدعاء مخ العبادة (عبادت کا مغز دعا ہے) بلکہ بعض روایتوں میں تو ہے کہ الدعاء هو العبادة (دعا ہی عبادت ہے) پس عبادت پر ڈٹے رہنے کا مطلب یہی ہوا کہ دعا پر ڈٹے رہو، آگے وعدہ کیا گیا ہے کہ

نحن نرزقك — ہم تمہیں روزی پہنچاتے رہیں گے۔

گویا دعا کے راز سے واقف ہونے کے بعد جو اس پر ڈٹا ہوا ہے، وہ روزی کے اس سرچشمہ کو جا کر پکڑا ہوا ہے کہ جس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے وہیں سے مل رہا ہے، پس صبر کی تلقین سے مقصود یہی ہے کہ غیروں کے سامنے ذلیل ہونے سے اللہ کے بندوں کو بچایا جائے، ورنہ حق تعالیٰ سے مانگنا اس کے آگے اپنی ضرورتوں کے لئے گڑگڑانا تو بندوں کی زندگی کے نصب العین کی تکمیل ہے، اسی لئے شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ

الصبر عندنا حبس النفس عن الشكوى لغير الله
(فتوحات ص ۲۲۲ ج ۲)

صبر کی حقیقت ہمارے یہاں یہ ہے کہ اپنے جی کو آدمی شکوہ شکایت سے روکے رکھے لیکن خدا کے آگے نہیں۔

یعنی خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں کا پیش کرنا، صبر کے منافی نہیں ہے۔ ترمذی کی یہ حدیث ہے کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من نزلت بہ فاقۃ فانزلھا بالناس لم تسد فاقتہ ومن نزلت بہ فاقۃ فانزلھا باللہ فیوشک اللہ برزق عاجل او عاجل۔

جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوا اور اپنی اس حاجت کو لوگوں کے روبرو پیش کرے گا، تو اس کی حاجت پوری نہ ہوگی، مگر جس پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوئی اور اپنی اس حاجت کو اس نے خدا کے سامنے پیش کیا، تو قریب ہے کہ دیر یا سویر اس کے پاس روزی پہنچ کر رہے گی۔

الحاصل "الرزق" کا جو حقیقی مالک ہے، اس کے آگے اپنی ضرورت کو پیش کرنا، پیش کرتے رہنا اور اس ضرورت کی تکمیل کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا اسی کا اصطلاحی نام "توکل" ہے، قرآن میں

رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو۔

پالنے والا مشرق کا اور مغرب کا نہیں ہے الٰہ کوئی اس کے سوا۔

کا علم عطا فرمانے کے بعد

فاتخذہ وکیلا

پس بنالے تو اسی کو اپنا وکیل۔

کے فرمان میں اسی توکل کا امر دیا گیا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ قدرتی معیشت کی کشمکشوں میں صبر کی راہ پکڑ کر اور صبر کے دامن کو دعا و توکل سے جوڑ کر زندگی کے ایک ایسے طریقہ کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے کہ معیشت کی فراخی اور تنگی خواہ کسی حال میں پہنچ گئی ہو لیکن عمل کرنے والے ان قاعدوں پر عمل کر کے چاہیں تو ہمیشہ اپنے آپ کو خوش رکھ سکتے ہیں، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ سورۂ کہف کی آیت

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیوٰۃ الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا۔

اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے مالک کو صبح و شام مقصود بنایا ہے ان لوگوں نے اللہ کی وجہ کو، اور نہ ہٹائیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے، کیا مقصود بنانا چاہتے ہو تم پست زندگی کے بناؤ سنگار کو اور نہ اطاعت کرنا ان لوگوں کی جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من مانے خیالات) کا اور یہ بات اس کی حد سے گزر گئی۔

اس میں بھی صبر کی تلخیوں کے مٹانے کی ایک تدبیر بتائی گئی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی عمل کے اختیار کرنے میں آدمی کو اگر دشواری محسوس ہو تو عام قاعدہ ہے کہ نمونوں اور مثالوں سے پست ہمتوں میں بلندی پیدا

ہو جاتی ہے، اگر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کو مذکورہ بالا آیت میں اسی کی ہدایت کی گئی ہے، اصل یہ کہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وجہ اللہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا یعنی یہ سمجھنا کہ حق تعالیٰ اور اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا یہی مسلمان کی ہستی کا مقصد ہے، ظاہر ہے کہ اسلام کا آخری خلاصہ یہی ہے، پس حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے وجہ اللہ کو اپنا مقصود اور اپنے وجود کا نصب العین ٹھیرا لیا ہے، ان کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑے رکھو، زندہ ہوں تو انہی کی صحبت میں رہو، نشست و برخاست انہی کے ساتھ رکھو، اسی طرح جو اس دنیا کی زندگی ختم کر کے دوسرے عالم میں جا چکے ہیں، ان کے حالات و سوانح کا پڑھنا، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی انہی لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو روکے رکھنے کا ایک طریقہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ تنہا صبر کے مقام پر اگر کسی کا پاؤں نہ جمتا ہو تو ایسے مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی نصب العین رکھنے والے بزرگوں کے نمونوں سے فائدہ اٹھائیں، جو زندہ ہیں ان کو دیکھیں، جو مر چکے ہیں، ان کے حالات کتابوں میں پڑھیں اور اپنے نصب العین میں کامیاب ہونے کے لیے جو طریقۂ عمل ان کا تھا، یعنی وجہ اللہ کو اپنا مقصود بنانے والے جیسا کہ چاہیے زیادہ وقت اللہ ہی کے ذکر و فکر میں گذارتے ہیں، اسی طرح ان نمونوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو بھی چاہیے کہ ذکر و فکر میں انہی کا طریقہ اختیار کریں، آخر میں یہ فرما کر کہ

ولا تعد عیناک عنھم

اور نہ ہٹائیو اپنی دونوں آنکھوں کو ان سے

گویا اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسے حیات دنیا کی زینت والوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، اسی کے بالمقابل چاہیے کہ ان نمونوں پر نگاہ جمائے رکھو، ان کو دیکھ دیکھ کر تسکین حاصل ہوتی رہے گی۔ آگے پھر اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے جس کا "دین کے قانون" میں ذکر ہو چکا ہے، یعنی جن لوگوں نے اپنے وجود کا نصب العین قرار دے رکھا ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی آخری ساعتیں پوری کریں گے قرآن ہی میں ایسوں کے متعلق اس قانون کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ

من کان یرید الحیوٰۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔

اور جو مقصود بنا لیتا ہے اسی پست زندگی اور اس کی زینت (بناؤ سنگار) کو پورا کرتے ہیں ان کے اعمال کو اس میں اور نہیں کمی کی جاتی ہے دینے میں۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حیات دنیا اور اس کی زینت کے حاصل کرنے کو جو لوگ اپنے جینے کا واحد نصب العین ٹھیرا لیتے ہیں، اور اسی راہ میں سعی و عمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کو اپنے عمل کے نتیجوں سے محروم نہیں کیا جاتا، بلکہ جد و جہد سعی و عمل کے مطابق نتیجے سے قدرت ان کو سرفراز کرتی ہے، قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، آج اس کی تفسیر ان ممالک کے باشندوں کے طرز عمل سے

ہو رہی ہے جنہوں نے اسی حیات دنیا کی زینت بناؤ سنگار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے، اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج بھی ان کے سامنے آ رہے ہیں[1]۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں، جس کا آیت کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کو ان کی پیروی سے منع کرتے ہوئے ان کے خصوصی صفات یہ بیان کئے گئے ہیں کہ ان کے قلوب پر قدرت غفلت کا پردہ ڈال دیتی ہے۔ اپنے رب کو وہ بھول جاتے ہیں اور اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو، اس کے پیچھے روانہ ہو جائیں، اور جس طرح بن پڑے اس خواہش کو پورا کریں۔ اسی لئے قدرت کے جو مقررہ حدود ہیں، ان ہی حدود پر ٹھہر نہیں سکتے، ان کی زندگی صرف زیادتیوں سے معمور ہو جاتی ہے اور اس کی تصدیق بھی ان ہی ممالک کے باشندوں کی زندگیوں سے ہو رہی ہے جو زینۃ الحیوٰۃ الدنیا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی و عمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں

---

[1] جو اپنے وجود کا شعبات دنیا کو بنائے ہوئے ہیں، ان ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے: من کان یرید العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد (اور جو مقصود رکھتا ہے اس عاجلہ یعنی جلد ملنے والی چیز یعنی دنیا کو، تو جلد عطا کر دیتے ہیں اس میں جتنا ہم چاہتے ہیں جس کے لئے چاہیں) جس کا مطلب یہ ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ "عاجلہ" یعنی جلدی پیش آنے والی زندگی یعنی اس حیات دنیا کی دوسری قرآنی تعبیر ہے، جو اسی کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں ان کو اسی دنیا میں دیا جاتا ہے لیکن سب کو دیا جاتا ہے؟ جواب اس کا یہ دیا گیا ہے، جتنا ہم چاہتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں دنیا میں دیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ جتنا چاہا جاتا ہے اتنا ملے یہ ضروری نہیں، گو کہ تنگ پورا ہونا ضروری نہیں، بسا اوقات جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی قید کا جس آیت کو اصل عبارت میں پیش کیا گیا ہے تعلق کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پورا پورا بدلہ دیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو ان میں کچھ تھوڑا سا معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورۂ ہود والی آیت میں سعی و عمل کے نتائج کے متعلق قانون بنایا گیا ہے یعنی سعی و کوشش کسی کی رائیگاں نہیں جاتی نوفّ الیہم اعمالهم فیها (پورا کرتے ہیں ان کے اعمال کی جزا وہیں) اسی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر ——— نتائج مرتب ہوتے ہیں، بخلاف اس آیت کے جس کا ذکر بنی اسرائیل کی سورۃ میں ہے یعنی عاجلہ جو بخشش کی گئی ہے اس میں صرف ان لوگوں کا سوال ہے جو چاہا کرتے ہیں اور دنیا خواہشوں میں، ہر ایک خواہش کی تکمیل جماعت امیروں کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ لیکن محنت و جانکشی ان سے نہیں ہو سکتی، ان ہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جتنا چاہتے ہیں ہم دیتے ہیں۔ الغرض سورۂ ہود میں عمل کے نتائج سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جاتا، دنیا میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت کا بھی یہی ہے، اسی بنی اسرائیل والی آیت کے بعد ہے ومن اراد الآخرۃ وسعی لها سعیها وهو مؤمن فاولٰئک کان سعیهم مشکورا (یعنی جو آخرت کی زندگی کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اور اسی نصب العین کے مطابق سعی و عمل میں سرگرمی دکھاتا ہے، تو ان کی کوشش بھی مشکور ہوتی ہے یعنی دیگر نتائج سے ان کے عمل کو محروم نہیں کیا جاتا۔ البتہ آخرت کے نتائج عمل و سعی پر اسی وقت مرتب ہوتے ہیں جب عمل کرنے والا مومن ہو، یہاں کے بغیر آخرت کے ساتھ بار آور نہیں ہوتے۔"

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ گو دنیا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے ان کے سامنے آ جاتے ہیں، لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان ہی کے متعلق یہی اعلان کیا گیا ہے

اولٰئک الذین لیس لهم فی الآخرۃ	یہی وہ لوگ ہیں کہ نہیں ہے آخرت میں
الا النار وحبط ما صنعوا	ان کے لئے مگر صرف آگ اور حبط ہو گیا
فیها وباطل ما کانوا یعملون۔	بیکار ہو گیا جو کچھ کیا، اکارت ہوا
	دنیا میں وہ سب بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔

مسلمانوں کو ان کی اطاعت اور پیروی سے منع کیا گیا ہے، اسی لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو وجہ اللہ والا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جائے گا اور اس کی توثیق بھی مشاہدہ و تجربہ سے ہو رہی ہے۔ مسلمانوں میں جنہوں نے ان قوموں کی راہ اختیار کی خواہ وہ ہند میں ہوں یا ترک میں، مصر میں ہوں یا مراکش میں، جس نسبت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں، وجہ اللہ کے نصب العین سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اس نصب العین سے محروم ہو جانے کے بعد آدمی اور کچھ باقی رہتا ہو یا نہ رہتا ہو لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان تو قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔

بہر حال صبر کی دار و مدار نتائج کو خوشگوار بنانے کے لئے، تو وہ تدبیریں تھیں جو اسلامی وثائق میں پائی جاتی ہیں، لیکن قرآن نے ان ہی تدبیروں پر معاملہ کو ختم نہیں کر دیا ہے، بلکہ من زینۃ الحیوٰۃ الدنیا کے نصب العین والوں کے سامنے ان کی سعی و عمل کے نتائج جیسے آتے ہیں، اسی طرح قرآن نے صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل کی ہے، پہلا نتیجہ تو اس عمل کا یہی ہے جسے ایک سے زائد مقام پر

ان اللہ مع الصابرین	تحقیق اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

کے الفاظ میں ادا کیا ہے، قدرتی معیشت کے سلسلے میں جس صبر کی تلقین غریبوں کو کی گئی ہے، وہ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی انہیں محزون رکھتی ہے، اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقع پر امداد حاصل کریں گے، تو پائیں گے کہ ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی معیت و رفاقت کی دولت انہیں مل جاتی ہے جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے جس کا مساوی دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہو سکتا اور خدا ہی جس کے ساتھ ہو جائے سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں پا لیا۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ صبر کرنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ انہیں یہ بشارت دی جائے کہ

اولٰئک علیهم صلوات من ربهم	یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی
ورحمة واولٰئک هم	طرف سے صلوات نازل ہوتے ہیں، اور
المهتدون۔	رحمت اور یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے
	راہ پائی۔

لیکن عام طور پر ان مطالبات کو اہمیت کیوں نہیں دی گئی؟ زیادہ سے زیادہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ان احکام کو کچھ نیک مشوروں کی حیثیت سے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدری معیشت کے مصائب کا احساس لوگوں کو جب ہوتا ہے تو ان کا دھیان بھی ان قرآنی احکام کی طرف نہیں جاتا جن پر عمل پیرا ہونا ایسی حالت میں ان پر فرض کیا گیا ہے۔ آخر زہرۃ الحیوٰۃ الدنیا والوں کی گوناگوں نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھانے سے قرآن نے جن الفاظ میں منع کیا ہے، کیا وہ معمولی الفاظ ہیں۔ لاتمدن ہی کے لفظ پر غور کیجئے، صرف یہی نہیں کہ بصیغۂ نہی اس فعل سے روکا گیا ہے جس کی خلاف ورزی قطعاً حرام ہو جاتی ہے، بلکہ آخر میں مشدد نون کے اضافے نے اس حکم میں جتنی قوت بھر دی ہے، اس سے معمولی عربی صرف کا جاننے والا بھی واقف ہے، لیکن اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سوچنا چاہئے کہ ایسے سخت تاکیدی فرمان الٰہی کے متعلق ہمارے احساسات کیا ہیں اور وقت پر اس حکم کی تعمیل کی توفیق کتنوں کو ہوتی ہے اور یہ حال تنہا اسی قانون کا ہے، یہی حال نفقوں کے حد والے قانون کا بھی ہے۔ یہی حال ان دفعات کا بھی ہے جن میں صبر اور شکر کے متعلق احکام نافذ کئے گئے ہیں۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ قدری معیشت کی ان ذمہ داریوں کے متعلق جو الفاظ مسلمانوں میں آج مروج ہیں سرسری حیثیت سے خواہ ان کا محل وہی کیوں نہ ہو جو قرآنی الفاظ کا ہے، لیکن معلوم کیوں قرآنی محاوروں کو ترک کر کے دوسرے الفاظ کو ان کا قائم مقام بنا کر پھیلا دیا گیا ہے۔ مثلاً ایسے مواقع میں لوگوں کو قناعت کی تعلیم دی جاتی ہے، لالچ اور حرص سے روکا جاتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان الفاظ کا مقصد بھی اگرچہ قریب قریب وہی ہے جو قرآنی الفاظ کا منشا ہے، لیکن قرآنی تعبیروں کو چھوڑ دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان غیر قرآنی اصطلاحات کو قرآن میں نہ پا کر شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ اس قسم کا احساس قائم ہو گیا ہے کہ یہ قرآنی مطالبات ہی نہیں ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگوں کا ایک گروہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ شاید غیر قوموں سے مسلمانوں میں قناعت و کم طلبی وغیرہ کے جذبات منتقل ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان مغالطوں میں جو خود مبتلا ہو گئے ہیں یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں زیادہ تائید ان لوگوں کو قرآنی تعبیرات کے ترک ہی سے حاصل ہو رہی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر قرآنی الفاظ کی اشاعت ہی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس سلسلے کے قرآنی بیانات کے متعلق صحیح طور پر یہ طے نہیں ہوا ہے کہ ان کا تعلق معیشت کے کس خاص کیفیت سے ہے؟ یعنی جن قرآنی آیات کا تعلق قدری معیشت اور اس کی دشواریوں کے حل سے ہے، ان کے متعلق عام مسلمانوں میں جہاں تک میں جانتا ہوں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا خطاب ہر شخص سے ہے، خواہ وہ قدری معیشت رکھتا ہو یا سبیلی، یہی وجہ ہے کہ جن خاص [illegible] ان قرآنی احکام اور مشوروں کو استعمال کرنا چاہئے، عام طور پر ان موقعوں پر لوگ ان کے استعمال کرنے کے عادی نہیں ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ان آیتوں سے جو منافع پہنچنے چاہئیں مہیا کرنے چاہئے

نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ضرورت جب پیش آتی ہے تو لوگوں کے سامنے عموماً ان اشعار اور مقولوں کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں غیر قرآنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر براہ راست قرآنی آیتوں کے استعمال کا رواج مسلمانوں میں باقی رہتا، تو یقیناً اس کے آثار و نتائج موجودہ حال سے مختلف ہوتے۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آپ کے سامنے معیشت کی دونوں قسموں اور ہر قسم کے متعلق اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں براہ راست قرآنی الفاظ ہی میں پیش کر دیئے گئے ہیں، حدیثوں کا استعمال بھی صرف تشریح و تفصیل کی حیثیت سے کیا گیا ہے، اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے

قل الحق من ربکم فمن شاء	سچی بات بول دے جو تیرے رب سے
فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔[1]	تجھ تک پہنچی ہے، پھر جس کا جی چاہے مانے

اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

کی اس آیت کریمہ کی تلاوت کر کے چپ ہو جاتا ہوں۔

یہاں تک تو ان ذمہ داریوں کا ذکر تھا جو رزق کی سبیلی و قدری حالتوں میں قرآن نے عائد کی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ان ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے جن نتائج پر قرآن نے تنبیہ کی ہے اس کی تفصیل پیش کر دی جائے، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ بحث کا حقیقی ماحصل مضمون کا یہی حصہ ہے اسی میں اس شبہ کا جواب آپ کو مل سکتا ہے جس کا ذکر ابتدائے مضمون میں کیا گیا تھا، یعنی معاشی زندگی میں خدا کو الٰہ المعاش بنانے سے جو گریز کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کم از کم موجودہ زندگی میں اس کے نتائج سے انہیں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے باشندوں کی باطمینان زندگی ثبوت میں پیش کی جاتی ہے، اسی خیال کی تردید واقعات کی روشنی میں اب آپ کے سامنے ہوگی، آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ میں قرآن کی ساری معاشی دھمکیاں صرف دھمکیاں نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے وہ حقیقی و مشاہداتی حقائق ہیں اور باللہ التوفیق۔

اجمالاً پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے، درحقیقت اسی کی تفصیل اب مقصود ہے، قرآن میں ضیق معیشت کا ذکر کر کے ایک خاص قانون کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی

ومن اعرض عن ذکری فان	اور جو کترایا میری یاد سے تو یقیناً اس
لہ معیشۃ ضنکا۔	کے لئے ہے ایسی معیشت جو ضیق اور

تنگی سے بھری ہے۔

ضیق اور تنگی یہی ضنک کے لغوی معنی ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی عائد کردہ

---

[1] یہ بات خاص طور پر سوچنے کی ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآن میں اسی موقع پر آئی ہے جہاں قدری معیشت کی الجھنوں کا حل بتایا گیا ہے کہ بجائے [illegible] خدا کو پکارنے والوں کی صحبت پر صبر کرو، اور ان ہی پر اپنی نگاہیں گاڑے رکھو ۱۲

ذمہ داریوں کو جو یاد نہیں کرنا چاہتا، قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کی معیشت میں قدرت تنگی اور ضیق پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قانون زندگی کے ہر حال اور ہر پہلو کو حاوی ہے اسی لئے سمجھنا چاہیئے کہ رزق کے حساب سے خواہ آدمی بسطی حالت میں ہو یا فقر کے، جو اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے اعراض و گریز کرے گا وہ اس کی معیشت تنگی اور ضیق کی شکار ہو جائے گی اگرچہ یہ بالکل ایک تجرباتی چیز ہے اسی لئے علماء نے اس کی تفصیل کی طرف کم توجہ کی، یعنی یہ بات کہ ایسی حالت میں ضیق اور تنگی کی کیفیت معیشت میں کیوں پیدا ہو جاتی ہے اسے چھوڑ دیا گیا ہے کہ تجربہ ہی اس کا بہترین جواب ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں قرآن ہی کی متفرق آیتوں کے مضامین پر اگر غور کیا جائے تو علاوہ تجربے کے یوں بھی اس کے اسباب اور ان اسباب سے پیدا ہونے والے آثار کو بیان کیا جا سکتا ہے جہاں تک میں نے سمجھا ہوں اس باب میں اپنے خیالات عرض کرتا ہوں۔

بسطی معیشت کی ذمہ داریوں کی خلاف ورزی کے نتائج

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ مال و دولت کی حرص یہی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں اس سے امداد ملتی ہے لیکن بسطی معیشت کو مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے قرآن ہی کی آیت ہے۔

واما من اعطی واتقی و	جس نے دیا اور ڈرا اور تصدیق کی
صدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ	اس نے حسنیٰ کی یعنی اچھی باتوں کی

قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔

جس کا مطلب یہ ظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسریٰ یعنی آسانیوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے جو دیتے ہیں، دینے کا منشا یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، آگے واتقی و صدق بالحسنیٰ (یعنی ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کی) یہ اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتے ہیں، یعنی خدا سے ڈرتا ہے اور اچھی باتیں جنہیں خدا پسند کرتا ہے، انہیں وہ مانتا ہے، ظاہر ہے خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہو گا تو کسے ہو گا؟

بہرحال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسریٰ (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خدا کے خوف سے خدا کی مرضی کے مطابق حق داروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں، یہی بات کہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی باتیں یعنی الیسریٰ پر ان کی زندگی آسان ہوتی ہے یا نہیں، سوچا کہ میں نے عرض کیا یہ بالکل ایک تجربہ کی بات ہے اور جہاں تک میرے خود فکر کا تعلق ہے اس باب میں اس سے زیادہ شاید اور کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس راہ سے ہٹ کر زندگی گزارتے ہیں یعنی یہی بات کہ اس سلسلہ میں خدا اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو یاد کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے

ذکر سے اعراض کرتے ہوئے، مثلاً اس اصول کو اختیار کرتے ہیں جس کا ذکر العسریٰ والی آیت کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

واما من بخل واستغنیٰ و	اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی
کذب بالحسنیٰ۔	باتوں کو جس نے جھٹلایا،

یعنی جو لوگ بجائے اعطاء (داد و دہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اسی کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں آگے کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو بے نیاز کر دیتے ہیں، اور بظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے، ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کی پوری ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہو گا، اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑے گا، کس کس سے کہنا ہو گا، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بنک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں بے غم رہتا ہے، ہر ضرورت جو پیش آ سکتی ہے اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے کہ قاضی الحاجات ہمارے پاس موجود ہے جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہو گی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کے پہننے کو جی چاہے گا، بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہو گی، جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ میں اگر چارپائی پر بیمار پڑنے کی صورت میں بلوا سکتا ہوں، جس دوا کی طبیب ضرورت ظاہر کرے گا منگوا سکتا ہوں، روپے کے متعلق "استغنا" یا "غنا بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو بالآخر بخل پر منتج ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا بظاہر ایک حد تک کی بات بھی معلوم ہوتی ہے، روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے، اور صرف انسانوں سے ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے ایسی کیفیت جس کا انہیں ممکن ہے شعور بھی نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بھی بالآخر بے تعلق بنا کر رہتی ہے اور یہی وہ بات ہے کہ خدا کی ضرورت تو اسی بیچارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو، لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا، اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے، لیکن دوسرا جملہ وکذب بالحسنیٰ (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنیٰ (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتاً بخل زدہ انسان انہیں جھٹلاتا ہے، اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے، صلہ رحمی، اقربا پروری، حسن سلوک الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی ہو جاتی ہیں، آخر ان باتوں کی پرواہ کیوں کرے جب آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے یا مخلوق خدا کے خیال سے، لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیازی و استغناء کا احساس مسلط ہو وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب کہتا ہے

کوئی میرا کیا کرے گا؟ اس "تکذیب بالحسنیٰ" کے ردِ عمل میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، محرومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے، محفلوں میں مجلسوں میں لوگ اس کی دناءتوں و خباثتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ملامتوں کی تہ میں عداوت کا یہی مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ "بخیل خدا کا دشمن ہے" مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغنا اس کے آگے "کوئی میرا کیا کرے گا" اسی حجاب کو وہ پہراتا رہتا ہے، اور یہ بھی یہی بات کہ بیچارے عوام اس کا کیا کر سکتے ہیں! لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں ہے، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فسنیسرہ للعسریٰ۔ پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے
اس کے لئے "العسریٰ" کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو۔

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں، لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے، یعنی عوام تو ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے کیا اس کے قبضۂ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے، اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے، یہ تو خیر عام بات ہے، اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اس سے الگ بات ہے، یعنی سب کچھ کو اس کے قبضۂ اقتدار میں دیتے ہوئے، قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت و ثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے، اور بظاہر بخل زدہ آدمی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداءً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے، لیکن قدرت کی نیابت کا یہ کیسا عجیب تماشا ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو بجائے "الیسریٰ" کے آسان زندگی کے "العسریٰ" (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کر دی جاتی ہے، وہ سب کچھ کھا سکتا ہے لیکن کچھ کھا نہیں سکتا، سب کچھ پہن سکتا ہے، لیکن کچھ پہن نہیں سکتا، الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام و عیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کر سکتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کر دیا گیا ہے، اتنا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ایں طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے، گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے، موجوں پر موجیں گزرتی رہتی ہیں، اسی پر سے گزرتی رہتی ہیں، لیکن اس کمبخت کو نصیب کی

تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، بہرحال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کر کے بخل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

فسنیسرہ للعسریٰ۔ پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے
اس کے لئے العسریٰ کو (یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تصویری مشاہدہ ہے جس کی زندہ مثالیں دنیا کی آبادیوں میں جہاں ڈھونڈئیے ہر جگہ مل سکتی ہیں، ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی دشوار ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہیں، اور جیسے ان شکلوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

کذب بالحسنیٰ۔ جھٹلاتا ہے وہ "الحسنیٰ" کو (یعنی جو
باتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں)

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی بخل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جاحظ کی مشہور کتاب "البخلاء" کے مطالعہ سے اپنے شوق کو وہ پورا کر سکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا "الحسنیٰ" کی تکذیب کے متعلق "کوئی میرا کیا کرے گا" کا یہ جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے ردِ عمل کو، جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں، خاطر اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہو، اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ حیثیت کی تنگی و تنقیص کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہو سکتی ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ انسانی احساسات رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں اور ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی، مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے عزت اور آبرو ہی کا بچانا ہے لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے، تاہم جو اذیت اپنی بے حرمتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے، چونکہ قلب کی یہ ایک مخفی کیفیت ہے جس پر گزرتی ہے وہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے، دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں ہے،

مگر دوسری سزا یعنی "العسریٰ" کی تیسیر یعنی دشوار اور کٹھن زندگی جو اس پر آسان کر دی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں یہ باب افسوس کہ جس "تشنہ لبی" کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آ رہا ہے، یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، سہولتوں اور آسائشوں کے لئے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، مغالطوں میں مبتلا ہو کر کسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنا لیتا ہے اور یہ ہے،

من اعرض عن ذکری فان له — جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً ہے اس کے
معیشة ضنکا۔ — لئے زندگی تنگی اور تنگی سے بھری ہوئی

کی مشاہداتی تعبیر اور کھلی ہوئی تفسیر، مرنے سے پہلے جسے ان لوگوں کو دیکھنی پڑتی ہے جو خدا اور اس کی

ذمہ داریوں کے یاد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

باقی مغالطوں میں مبتلا ہونے کا جو ذکر میں نے کیا، اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے پاپڑ جو اس مسکین کو بیلنے پڑتے ہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی بنیاد وہی "استغنی" کا بات ہے، یعنی دوسروں سے بے نیاز بنانے کی جو صلاحیت دولت میں نظر آتی ہے۔ یہی بات کراتی ہے، ان لوگوں سے جو کچھ کراتی ہے، لیکن کیا واقعہ بھی یہی ہے، اب میں لوگوں سے کیا کہوں، تاکہ شام ہر شہر ہر بستی و آبادی میں

ما اغنی عنہ مالہ وما کسب — نہ کام آیا اسے مال ہی اس کا اور نہ وہ جو کچھ کمایا اس نے۔

کی قرآنی آیت کا تجربہ لوگوں کو کرایا جا رہا ہو، صرف اسی وقت نہیں، جیسا کہ قرآن ہی میں اسی سورۂ واللیل کے اندر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ما یغنی عنہ مالہ اذا تردی — نہیں کام آتا ہے مال اس کا جب برباد ہو جاتا ہے وہ۔

خواہ یہ تباہی اور بربادی مال کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہو یا خود صاحب مال کی، کہ تو قریباً ایک کھلی ہوئی بات ہے، بکثرت قرآن ہی میں آپ کو اس مضمون کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی۔

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا اکثر منھم واشد قوۃ وآثارا فی الارض فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون۔

کیا وہ چلتے پھرتے نہیں زمین میں، پھر دیکھتے وہ کہ کیا حال ہوا ان کا جو ان سے پہلے تھے، ان سے قوت میں بھی اور زمین پر آثار (عمارتیں اور دوسرے آثار) کو چھوڑنے میں یہ گذرے ہوئے لوگ زیادہ بھی تھے اور شدید بھی تھے، پر نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ جو کمایا تھا انھوں نے۔

دولت و امارت، سلطنت و حکومت، شوکت و قوت کی غلط بخشیوں کے مغالطہ کا ازالہ ہر تھوڑے دن پر قدرت صحیفۂ عالم پر کرتی رہتی ہے۔ اتنا ہی دنیا میں حدود کی گزرتوں اور حربی و جنگی قوتوں، حیرت انگیز اختراعی و ابداعی ایجادوں سے استغنا حاصل کرنے والی قوموں پر جو گذر رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، انھوں نے زمین کو الٹا پلٹا، اور کیا کیا چیزیں نہیں نکالیں، شورہ نکالا، گندھک نکالا، زغال کے معدنوں کا پتہ چلایا، پٹرول کے خزانوں کا سراغ لگایا اور زمین کی ان ہی ودیعتوں سے کیا کیا کام نہیں نکالے، لیکن

فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون۔ — نہ کام دے سکا ان کو وہ سب کچھ جو کمایا تھا انھوں نے۔

ترجمہ ان میں کتنے کر چکے اور جو باقی ہیں انھیں آج نہیں تو کل بہرحال اس کا ترجمہ کرنا ہی پڑے گا، یہاں بھی کرنا پڑے گا اور وہاں بھی جہاں لکھنے والوں سے کہلایا جائے گا۔

ما اغنی عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ۔ — نہ کام آیا (آج) مجھے میرا مال، تباہ ہو گیا میرا سارا غلبہ (اقتدار)۔

لیکن یہ تو بڑے پیمانوں کی باتیں ہیں، زیادہ تر ان آیتوں کا تعلق اقوام و امم سے ہے، میں تو اشخاص و افراد تک کے متعلق دیکھ رہا ہوں کہ صاحب مال زندہ بھی ہیں، مال ان ہی کا مال ہے، دوسروں کی نگاہوں میں وہ خوش حال بھی ہیں، سب کچھ ہے لیکن باوجود اس کے

ما اغنی عنہ مالہ وما کسب — نہ کام دے سکا اس کو مال اس کا اور جو کچھ کمایا تھا وہ۔

کی تفسیر بھی کر رہے ہیں، اس راہ کے خورد کوں، اور مردکوں کو تو چھوڑیے، میں آپ کے سامنے بیسویں صدی کے سب سے بڑے انفرادی دولت مند کو پیش کرتا ہوں جو کسی خاص صوبہ یا ملک ہی نہیں، بلکہ ہفت اقلیم کے امیروں میں کبھی سب سے بڑا امیر گنا گیا، اسی کی شہادت اسی کی زبانی سنیے

"میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اس کا حساب بھی نہیں کر سکتا، کہا جاتا ہے کہ میری جائداد ۵ کروڑ پونڈ (۷۵ کروڑ روپے) سے زائد کی ہے۔"

سنا آپ نے! پچہتر کروڑ روپے سے زائد کی دولت موجود ہے، اس پر اقتدار کلی حاصل ہے، ابھی وہ مرا بھی نہیں ہے، زندہ ہے، لیکن غلط بخشیوں کی شماتت العیاذ باللہ جس قاضی الحاجات کے اندر پائی بھی جاتی ہے، اس کے متعلق اعلان کرتا ہے،

"میں ساری جائداد کو دے ڈالنے کو بخوشی تیار ہوں، اگر ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا کھا سکوں۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنے اخبار سچ مورخہ جنوری ۱۹۲۶ء میں ملک "پٹرول (تیل) کی مملکت کے بادشاہ" مسٹر راک فیلر امریکانی کی اس ذاتی شہادت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس کی (راک فیلر جو زندہ تھا) عمر ۸۶ سال کی ہو چکی ہے، ابتدا ہی سے سوء ہضمی کی اس کو بیماری ہے، حال یہ ہے کہ بجز دودھ اور بسکٹوں کے ایک قلیل مقدار کے وہ دن بھر کچھ کھا نہیں سکتا۔"

مولانا عبدالماجد نے کسی انگریزی وثیقہ سے یہ خبر نقل کی ہے، اور کہنا تو یہ ہے کہ بیچارا راک فیلر اس حال کا تنہا آدمی نہیں ہے، جو اس خبر کی تحقیق و تلاش میں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جائے، دولت کے اعتبار سے آپ کو راک فیلر جیسے سرمایہ دار ممکن ہے کہ دنیا میں نہ ملیں، لیکن ابتدا سے سوء ہضمی کی شکایت، پیٹ بھر کھانا کھانے کی آرزو رکھنے والی تمناؤں میں تو اس راہ کے اس بیسویں صدی کا اور آپ کو ہر گلی کوچے میں مل سکتے ہیں، جناب راک فیلر امریکانی کے دوسرے

ہم چشم و ہم قدم جو ابھی ابھی جا چکے ہیں، میری مراد ہنری فورڈ صاحب شاہ موٹران سے ہے، اسی اخبار
میں ان کے متعلق بھی یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

"وہ (ہنری فورڈ) ایک ضعیف البنیۃ لاغر و نزار دائم المرض بزرگ ہیں، جن
بیچارے نے اپنی زندگی کی خاطر سالہا سال سے اپنے اوپر ہر قسم کی لذیذ
اور پر تکلف غذاؤں کو حرام کر رکھا ہے، ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہر وقت
ان کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ کسی وقت کھانے میں بد پرہیزی نہ کر بیٹھیں۔"

اور یہ واقعہ تو چند ہی دن ہوئے دنیا کے اخباروں میں چھپا تھا کہ یہی ہنری فورڈ صاحب جنہیں
عربی اخباروں اور رسالوں میں "اغنی اغنیاء العالم" یعنی سارے عالم کے امیروں کا سب سے بڑا
امیر کے خطاب سے ہمیشہ یاد کرتے ہیں، ان کے اکلوتے فرزند ... پر بیماری کا حملہ ہوا سب کچھ
کیا گیا جو ہنری فورڈ جیسے باپ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے ممکن ہو سکتا تھا لیکن دولت کے متعلق
"خلد بخشی" کا انسانی نظریہ غلط ثابت ہوا، اور خدا کی بات

وما یغنی عنہ مالہ اذا تردی۔	اور نہیں کام دیتا ہے مال اس کا جب گرتا ہے وہ۔

پوری ہوئی۔ لیکن قدرت کی جیتی جاگتی کارفرمائیاں کیا اسی حد پر ختم ہو جاتی ہیں؟
یا بمقابلہ دیگر اعراض زندگی کو "معیشت ضنکا" یعنی تلخیوں اور تنگیوں سے ایسوں کی معیشت
جو بھری جاتی ہے۔ اس کے تلخ بنانے کی کیا صرف ایک یہی صورت ہے؟ قرآن کی ایک
پوری سورۃ جس کا سورۂ ھمزہ نام ہے۔ ہم مسلمانوں ہی کے پارے کی مشہور سورۃ ہے اس
میں بھی صرف ایک اسی معاشی مسئلہ کے ایک خاص پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال پہلے پوری سورۃ کو
ترجمے کے ساتھ لکھ دیتا ہوں۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ الذی جمع	خرابی ہے ہر چونک مارنے والے عیب چینی
مالا وعددہ یحسب ان	کرنے والے کے لئے جو جمع کرتا ہے مال کو
مالہ اخلدہ کلا لینبذن	اور گنتا رہتا ہے اس کو خیال کرتا ہے کہ
فی الحطمۃ وما ادراک	دوام بخشتا ہے مال اس کا، ہرگز نہیں
ما الحطمۃ نار اللہ الموقدۃ	وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمہ میں اور کس نے
التی تطلع علی الافئدۃ انھا	سمجھایا کہ الحطمہ کیا چیز ہے آگ ہے اللہ کی
علیھم مؤصدۃ فی عمد ممددۃ	سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر

اس آگ کے پٹ بند ہیں لمبے لمبے کھمبوں میں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے انجیل میں مال اور سرمایہ کے متعلق نظریہ "خلد بخشی" اور جن
آثار و نتائج تک یہ نظریہ آدمی کو پہنچاتا ہے، بیان کیا گیا تھا اسی طرح مذکورہ بالا سورۃ یعنی سورۂ ھمزہ میں

...سی مال اور سرمایہ کی بابت ایک دوسرا عام خیال جو پایا جاتا ہے اسی کی تعبیر

یحسب ان مالہ اخلدہ	خیال کرتا ہے کہ دوام بخشتا ہے اس کو مال اس کا۔

کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ زندگی کی راحتوں اور سہولتوں کو دیرپا بنانے
کی یا قرآنی اصطلاح کی رو سے "خلد بخشی" کی کیفیت مال میں پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ خیال
کیا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ کا ذخیرہ جتنا زیادہ بڑھایا جائے گا، راحتوں اور سہولتوں کی دیرپائی اور
خلود کی ضمانت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً دو سو روپے ماہوار کے خرچ سے زندگی کا
جو معیار قائم ہوتا ہے، اس معیار کو وہی برقرار رکھ سکتا ہے جو اس آمدنی کو قائم رکھے، اور اس معیار کو
جو بلند کرنا چاہتا ہے، چاہیے کہ اپنی آمدنی کو بھی بڑھائے۔

مال کے متعلق "خلد بخشی" کا یہی نظریہ ہے جو صرف "جمع" مال کے سمیٹنے ہی پر نہیں، بلکہ ان
گوناگوں پیچیدہ تدبیروں اور ترکیبوں پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے، قرآن میں جس کی طرف "عدد"
کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہی
ایک لفظ ان تمام حسابی چکروں کو حاوی ہے، جن کی عام تعبیر "گنا ٹوٹے کے پھیر" سے کی جاتی ہے،
بلکہ اگر وسعت فکری سے کام لیا جائے تو اکاؤنٹ اور فنانس وغیرہ کے پُرشوکت الفاظ سے
موجودہ زمانے میں مالی کاروبار کے جن شعبوں کو موسوم کیا جاتا ہے ان پر بھی "عدد" کے قرآنی
لفظ کو ہم منطبق کر سکتے ہیں۔

آگے قرآن میں "کلا" کا لفظ ہے، جو ایک تردیدی کلمہ ہے، جس کا اردو ترجمہ "ہرگز نہیں"
کیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ "جمع و عدد" کی یہ ہنگامہ آرائیاں، خلود اور دیرپائی کے
جس مقصد کے لئے لوگ برپا کئے ہوئے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ سرمایہ کے متعلق "جمع و عدد" کی
یہ تدبیریں خلودی نصب العین کے حاصل کرنے میں انہیں کامیاب بنائیں گی، قطعاً غلط ہے۔ اس
کے بعد جو یہ الفاظ ہیں

لینبذن فی الحطمۃ وما	قطعاً جھونک دیا جاتا ہے وہ "الحطمہ"
ادراک ما الحطمۃ نار اللہ	میں اور کس نے بتایا تجھے کہ الحطمہ کیا چیز
الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ	ہے، آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی
انھا علیھم مؤصدۃ فی	جو چڑھ جاتی ہے دلوں پر، اس آگ کے پٹ
عمد ممددۃ۔	بند ہیں ان لوگوں پر لمبے لمبے کھمبوں میں۔

لفظی ترجمہ تو قرآنی الفاظ کے سامنے لکھ دیا گیا ہے، لیکن مطلب اس کا کیا ہے؟ موجودہ زندگی کے
بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے، کیا ان کیفیات و حالات سے اس زندگی میں ان لوگوں کو دوچار
ہونا پڑے گا یا آئندہ زندگی کے سوا موجودہ زندگی میں بھی ہم ان کیفیتوں کو ان لوگوں کے اندر پا سکتے ہیں

شکل کے الفاظ اشتراک کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں، گویا پہلی نسلوں کے ساتھ پچھلی نسلیں بھی سرمایہ میں شریک ہوں، ان ہی کو "التراث" کہتے ہیں۔ دوسرا جزو اسی آیت میں "اکل لم" کا ہے، اکل کے معنی تو کھانے کے ہیں، رہا لَمّ کا لفظ، تو عربی زبان میں "رجل ملمّ" اس شخص کو کہتے ہیں جو قوم کے بکھرے ہوئے افراد کو سمیٹ کر کسی نقطہ پر جمع کرنے والا ہو، منتہی الارب میں ہے "رجل لمّ" (جمع کنندہ قوم یا عشیرہ پراگندہ را) لغت کی اسی کتاب میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے:

وتاکلون التراث اکلا لما	تم کھا رہے ہو تراث کو اکل لم کی شکل میں
نصیبکم ونصیب صاحبکم	یعنی اپنا حصہ بھی اور اپنے ساتھی کا حصہ

بھی کھا جاتے ہو۔

حاصل اس کا یہی ہوا کہ سرمایہ اور دولت سے استفادہ کی یہ شکل کہ پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک وہ بایں شکل منتقل ہوتی چلی جائے کہ دوسروں تک قطعاً اس سرمایہ کا کوئی حصہ نہ پہنچ سکے، بلکہ جو کچھ ہو دانہ دانہ، رتی رتی سب ایک ہی خاندان خاص نسل اور خاص طبقہ ہی تک پوری طاقت کے ساتھ اس طور پر اس کو محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی غیر کے منہ میں اس کی کوئی کھیل بھی اڑ کر نہ پہنچ سکے گویا وہی بات جس کے انسداد کے لئے ملکی فتوحات کے مقبوضات اور آمدنیوں کے متعلق قرآن میں

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء	تاکہ نہ بن جائے یہی دولت جو تمہارے
منکم	(سرمایہ داروں ہی کے درمیان گھومتی رہے)

کا قانون نافذ کیا گیا ہے، ٹھیک اسی کے توڑ پر یہ "اکل لم" سرمایہ داروں کا ایک خاص شیوہ ہے، پروفیسر ڈاڈ لنگ نے امریکہ و یورپ کے موجودہ نظام سرمایہ داری کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ جو لکھے ہیں:

"قبضہ میں رکھنے والوں اور تعاقب کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں" (داستان دہقان ص ۳۳۸)

میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآنی الفاظ "اکل لم" ہی کی گویا تفسیر ہے، اور اسی کے بعد وہ حالت اس راہ کے چلنے والوں کی ہو جاتی ہے جس کی طرف بخاری کی مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ یعنی

کالذی یاکل ولا یشبع	اس شخص کی حالت جو کھاتا جاتا ہے

اور سیر نہیں ہوتا۔

میں ایما فرمایا ہے، بلکہ قرآن کا وہ تمثیلی بیان گویا ان ہی لوگوں کی ایک زندہ تصویر ہے یعنی اس مثالی شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، یا قرآنی الفاظ میں

اخلد الی الارض واتبع ھواہ	ہمیشہ کے لئے گڑ گیا زمین میں اور پیچھے

چلا اپنی خواہش کے۔

کی کیفیت جس پر مسلط ہو گئی تھی، اسی کے متعلق ارشاد ہے:

فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل	تو اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر
علیہ یلھث او تترکہ یلھث۔	اسے دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا

نہ دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا۔

سرمایہ کے متعلق یہ خیال کہ زندگی کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کا وہ ذریعہ ہے، یہ چیز تو اس کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے، بلکہ بجائے اس کے "سرمایہ" اور "مال" بذاتِ خود اس کا مقصود و مطلوب بن جاتا ہے اسی لئے ہر حال میں "جمع وعد" کا یہ مریض ہانپتا ہی رہتا ہے، اسے جب بھی دیکھئے جب بھی کتوں کی طرح زبان نکالے اپنے اوپر حرص کی ایک ایسی کیفیت طاری کئے رہتا ہے کہ گویا اسے اب تک کچھ ملا ہی نہیں ہے، "جمع کرتا جائے، گنتا چلا جائے" اس کا کام اب فقط یہی رہ جاتا ہے، قرآن ہی میں

وتحبون المال حبا جما	اور چاہتے ہو مال کو جی جم کے ساتھ

جو فرمایا گیا ہے، اگرچہ میں اپنے خاص نقطۂ نظر کی بنیاد پر جس کا ذکر آئندہ آئے گا، بجائے مبسوط الرزق طبقات کے یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس آیت کا تعلق قدری رزق پانے والوں کے اس گروہ سے سمجھا جائے، جو رزق کے اس قدری ہونے کو اپنی اہانت و ذلت کا سبب ٹھیرا لیتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر اس کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ سرمایہ داروں کا یہ گروہ بھی یقیناً مال سے اسی قسم کا عشق مفرط پیدا کر لیتا ہے، یعنی ہر چیز سے ٹوٹ کر صرف مال ہی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے شب و روز وہ "جمع وعد" ہی کے ادھیڑ بن میں جکڑا رہتا ہے، اپنی ساری عقلی اور ذہنی قوتوں کی جولانیوں کی آماجگاہ "جمع وعد" کے مقابلہ کے اسی میدان کو قرار دے لیتا ہے، اسی میں رات دن وہ "تکاثر" والے مقابلہ میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اور یہی چیز اس میں اس خیال کو پیدا کر دیتی ہے کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع ہو گیا ہے یہ اس کی عددی کرتبوں اور معاشی مہارتوں کا نتیجہ ہے، قرآن کے سب سے بڑے تاریخی سرمایہ دار (قارون) کے حوالہ سے یہ فقرہ جو منقول ہے یعنی وہ کہتا تھا کہ

انما اوتیتہ علی علم عندی	اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ یہ

یہ دولت جو دی گئی ہے، یہ میرے اس علم کا نتیجہ ہے جو میرے پاس ہے۔

ہو نہ ہو اسی خیال کی ترجمانی ہے، جس کا پیدا ہونا اس قسم کے لوگوں میں ان کے اعمال و افعال کا لازمی نتیجہ ہے بلکہ اسی بنیاد پر ان کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جو جاری ہوتے ہیں

لن تبید ھذہ ابدا	قطعاً اب یہ قائم کیا ہوا یہ نظام آئندہ

برباد نہیں ہو سکتا۔

اسی کے قریب قریب متعدد مقامات پر قرآن ہی میں ان کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں تو وہ اسی زعم باطل کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قبضہ اقتدار میں جو کچھ بھی آیا ہے یہ ان کی حسابی اور فنی چالاکیوں اور فنیاتی نشو و نما بلکہ ہنروں کا ثمرہ ہے۔

اور یہی مقام ہے جس پر پہنچنے والوں کا عمر و قدر کے ان امراض میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے

جن کا قرآن کی مذکورہ بالا سورہ ہمزہ میں ذکر کیا گیا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جو رزق کی تنگی
حالت میں ہو یا فراخی میں، دونوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ دونوں رزق
کے قدرتی پیمانے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی حال میں ہو ایسے آدمی کی نگاہ رزق کے معاملہ میں قدرت اور
اس کی مشیت ہی پر جمی رہتی ہے، لیکن جو

دیا گیا ہے مجھے میرے اس علم کی بنا پر	اوتیتہ علی علم عندی

جو میرے پاس ہے۔

کے مغالطہ میں الجھ گیا یا الجھا دیا گیا ہو، وہ ان لوگوں کو بھی جو مقابلہ کے میدان میں اس سے پیچھے رہ گئے
ہوں اور ان کو بھی جو آگے بڑھ گئے ہوں، دونوں ہی کے دونوں حالتوں کا ذمہ دار خود ان ہی کو قرار دیگا
اور دے گا کیا معنی تجربہ شاہد ہے کہ قرار دیتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے اور دیکھا جاتا ہے
کہ جمع و عدد کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے والوں پر وہ حماقت و سفاہت، ناعاقبت اندیشی اور
اسی قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کرتا ہے، اور یہ حملہ شدت کی صورت عموماً اس لئے بھی اختیار
کرلیتا ہے کہ جمع و عدد کی مہم میں عموماً کام زیادہ تر وہی بیچارے رہ جاتے ہیں جو اپنی آمدنی کو زندگی
کی سہولتوں اور راحتوں میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خود اپنی ذات سے اس کا تعلق ہو یا اپنے بال بچوں
اعزہ و اقربا اور دوسرے مستحقین پر انھوں نے خرچ کیا ہو۔ اب کھلی ہوئی بات ہے کہ خرچ کرنے والوں کو
جو راحت و آرام رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے وغیرہ میں نصیب ہو سکتا ہے، یہ بات اس کم بخت
کو نصیب کیسے ہو سکتی ہے جس نے اپنے ہر پیسے پر پہرا بٹھا دیا ہو اور جمع و عدد کی اس مہم میں جو
ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں ہو کہ جو آچکا ہے وہ جانے نہ پائے اور جو آسکتا ہے اس کے آنے کا
کوئی موقع ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ظاہر ہے کہ دولت اور سرمایہ میں جو اس سے فروتر ہیں ان کی
رفاہیت اور خوش باشی کو دیکھ دیکھ کر اگر اس میں رشک و حسد کی آگ جل اٹھے تو تعجب نہ ہونا
چاہیے، جس کے پاس سب کچھ ہے وہ تو پاؤں اور جوتوں پر مارا مارا یا جوتیاں ہی چٹخاتا بازاروں
میں گھومتا پھرے، اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ موٹروں اور جوڑیوں پر اڑا پھرے، اس حال کو
دیکھ کر بے چین ہو جانا ایک قدرتی بات ہوتی ہے، اور اسی باطنی سوزش پر پانی ڈالنے کے لئے وہ
ان خرچ کرنے والوں پر ہمزی کلمات کے ساتھ برسنے لگتا ہے، خصوصاً اگر اس خرچ کرنے والے
غیر سرمایہ دار انسان کو کسی وقت سرمایہ دار صاحب سے کچھ لینے کی ضرورت پیش آجائے، خواہ وہ
قرض ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو، لیکن مطالبہ کی تکمیل کا مسئلہ تو بعد کا ہے، سب سے پہلے اس بیچارہ کو
ان فقروں میں دیر تک جلنا پڑتا ہے، جن کی صورت تو بظاہر نصیحت اور خیرخواہی کی ہوتی ہے
لیکن درحقیقت جن کا محرک اس کی تہہ میں دبی آگ ہوتی ہے، جو ان سرمایہ داروں کے دلوں میں
دبکی ہوتی ہے۔ چونکہ ان نالائقوں کو اس قسم کے بے سرمایہ لوگوں سے خوف بھی نہیں ہوتا،
اسی لئے ہجو بھی کی جو بھی سنائی ہوتی ہے وہ عموماً ان کے منہ پر سنائی جاتی ہے، قرآن میں ایک جگہ

ان ہی سرمایہ داروں کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں

وہی جو بخل اختیار کرتے ہیں اور حکم دیتے	الذین یبخلون ویأمرون الناس
ہیں لوگوں کو بخل کے اختیار کرنے کا اور	بالبخل ویکتمون ما اتاھم اللہ
چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اپنے فضل سے	من فضلہ۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے۔

تو ایک پہلو اس کا یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر پہلے تو خرچ کرنے والوں کو کفایت
شعاری، عاقبت بینی وغیرہ کے الفاظ میں بخل کی تعلیم دیتے ہیں، اور اسی کے ساتھ جب سبیل کرنے والے
کے بعد مطلب پر آتے ہیں تو بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتمان فضل سے کام لیتے ہیں یعنی کہہ دیتے
ہیں کہ میرے پاس تو خود کچھ نہیں ہے، خیر یہ صورت تو ان کے ساتھ پیش آتی ہے، جو میدان مقابلہ
میں پیچھے رہ جاتے ہیں، باقی آگے نکلنے والوں کے منہ پر تو شکوہ ہے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی لیکن
پس پشت یہ شکست خوردہ میدان مقابلہ میں ہارنے والا سرمایہ دار ہر گفتنی و ناگفتنی کو اس کی طرف
منسوب کرتا ہے، اور ان ہی باتوں کو اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی وجہ قرار دیتا ہے، اس نے
بے ایمانی کی، دھوکہ دیا، فریب سے کام لیا، یہ کیا، وہ کیا، حالانکہ یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے، اسی حسد کی
آگ کے ظہور کی ایک شکل ہوتی ہے جس میں "جمع و عدد" کا یہ ماہر سرمایہ دار جلتا بھنتا رہتا ہے۔
بعض علماء نے ہمزہ و لمزہ کے ان دو لفظوں کی تفسیر کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے،

سامنے منہ پر کسی کو برا بھلا کہنا یہ لمز	العیب فی الوجہ لمز و فی
ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا ہمز ہے بعض ان	الغیب ھمز و قیل بعکس ذلک
دونوں الفاظ کی تفسیر بالعکس ہی کے	ویدخل فیہ الاستھزاء
کرتے ہیں۔ بہرحال منہ پر کسی کے ساتھ	والاستخفاف والمحاکاۃ۔

کرنا، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کی نقل بنانی ان دونوں کے نیچے یہ ساری باتیں داخل ہیں۔

تو اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمزہ اور لمزہ کے ان دو
قرآنی الفاظ میں سے ایک کا تعلق اگر ان لوگوں سے رکھا جائے جو جمع و عدد کی مہم میں پیچھے رہ جاتے ہیں
اور دوسرے کے متعلق یہ قرار دیا جائے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس مہم میں آگے بڑھ جاتے
ہیں، تو اس مشہور علمی قاعدے کی بنا پر یعنی تاکید سے تاسیس بہتر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں کو
ایک ہی مصداق قرار دینا، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دونوں کو دو مختلف معانی پر محمول کیا جائے، اگر
ایسا کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

اب خیال کیجئے، اس شخص کے نفسی کیفیات اور باطنی واردات کا جو مال میں خلود بخشی کی
کرامتوں کو پوشیدہ قرار دے کر جمع و عدد کے گھن چکر میں مبتلا ہو گیا ہو، اور اسی اندرونی گردش نے
بالآخر اس کو ہمزہ و لمزہ کے مقام تک پہنچا دیا ہو، وہ ان سے بھی بگڑا ہوا ہے جو اس سے پیچھے رہ گئے ہیں،

اور ان سے بھی روشنا ہوا ہے جو آگے نکلے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ پھر آئے ہوئے پیسے کے متعلق یہ طے کئے ہوئے ہو کہ اسے نکلنے نہ دیا جائے گا، اور پھر وہ پیسہ جو ابھی نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کچھ بھی امکان ہے، اس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ بہرحال اس کو آنا ہی چاہئے۔ خود ہی سوچنا چاہئے کہ باہر سے ایسا آدمی خواہ کچھ ہی نظر آتا ہو لیکن اندر جھانک کر دیکھئے، بجز آگ ہی آگ کے اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے، خصوصاً زندگی کی ناگزیر ضروریات میں آئے ہوئے پیسوں میں سے کچھ پیسوں کا خرچ ہوتا رہتا چونکہ بہرحال یقینی ہے، اسی طرح جن آمدنیوں کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں ان کا حاصل ہونا کب ضروری ہے۔ پھر کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس چوٹ کا جو نکل نکل کر ہر پیسہ اس کے دل پر لگاتا رہتا ہے، اسی طرح جس کے آنے کا امکان تھا جب اس آدمی سے اسے محروم ہونا پڑتا ہے، اس کے قلق اور بے چینی کی کیا رُوداد بھی دے سکتا ہے، یہیں پر گذرتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسوں کے لئے خرچ ہونے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ خرچ ہو جانے، یا جمع شدہ سرمایہ کے ضائع ہو جانے کے خطرات بھی جن جن شکلوں میں انھیں ڈراتے اور دھمکاتے رہتے ہیں، اور مختلف اندیشے اور احتمالات جن جن شکلوں میں انھیں گھیرتے رہتے ہیں، بجائے خود یہ ایک مستقل بلائے جان کی صورت میں اس کے اندر ہنگامہ مچاتے رہتے ہیں، جس سے نجات کی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہوتی، آخر اس راہ کے بعض تجربہ کاروں سے کتابوں میں اسی قسم کے اعترافات جو ملتے ہیں، مثلاً امریکہ کے مشہور کروڑ پتی کارنیگی کا یہ زبان زد عام فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا،

"کروڑ پتی (ملینیر) کبھی مسکرا نہیں سکتا" (منقول از ہلال مصری مئی ۱۹۱۲ء)

یا اسی قارون آباد کے دوسرے غنی و دولت مند راک فیلر آنجہانی کے متعلق یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں "کامیابی" کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی، راک فیلر نے اخیر اس وقت تقریر کی۔

> "لوگ ان کی مراد کامیابی سے مال و دولت کمانا ہے، کیا اسی کا نام کامیابی ہے؟ میں کہتا ہوں، اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مفلس وہی ہے جس کے پاس مال کے سوا اور کچھ نہ ہو، میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے ابتدا ہی میں اس کا موقع دیا جاتا کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں، تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہوتا یا ہوتا تو بہت تھوڑا بقدر ضرورت ہوتا لیکن اسی کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے۔" (الہلال مصری جون ۱۹۱۳ء)

ان اعترافات کی تہ میں بجز ان نفسیاتی کیفیات و حالات کے اور کون سی چیز چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھئے اس کے بعد سورۂ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا۔

> "وہ جو مال جمع کرتا اور گنتا ہے، اسے خیال کرتا ہے کہ مال اسے خلود اور دوام عطا کرتا ہے، ہرگز نہیں، وہ تو ضرور پھینک دیا جائے گا الحطمہ میں

> چور چور کر دینے والی میں) اور یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی اونچی جھانکتی ہے دلوں پر اور اس آگ (کے پٹ) بند کر دیئے جاتے ہیں (اس پر) جو لمبے لمبے ستونوں پر گھری ہے"۔

یہ سچ ہے کہ حقیقی رنگ میں یہ کیفیت قرآن کے سامنے اسی وقت پیش آئے گی، جب یہ حقیقت اپنی اصلی رنگ میں نمایاں ہو گی، لیکن جو کل ہونے والا ہے، دیکھنے والے چاہیں تو آج بھی اس آتشیں مکان کا تماشا کر سکتے ہیں، جس کی دیواریں بھی آگ ہی کی ہیں، اور جس کی چھت بھی آگ ہی کی ہے ایسی چھت جو لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہے، اور اسی آتشیں مکان میں اسے جو بند کر کے پٹ بند کر دیا گیا ہے، نکلنے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود ہیں، آخر قرآن ہی میں تو

وان جہنم لمحیطۃ بالکافرین — اور تحقیق جہنم گھیرے ہوئے کافروں کو

فرمایا گیا ہے، کم از کم

احاط بہم سرادقہا — اس جہنم کے سراپردوں نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔

اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو چیز آج اندر ہے، وہی تو کل باہر نکل آئے گی اجساد کا تروح اور ارواح کا تجسد ارباب حقائق کا مسئلہ ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ جمع و عد کے مجرموں کے متعلق سورۂ ہمزہ کی جس سزا کو صرف ادھار ہی ادھار سمجھا جا رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو اسی سورہ کے الفاظ میں نقد کی جھلک بھی ان لوگوں کو نظر آ سکتی ہے جو مال و سرمایہ کے ساتھ انسانی نفسیات کے تعلقات کا مطالعہ ان قرآنی آیات کی روشنی میں کریں گے، یقیناً سوچئے جن اس "آتشیں گرداب" کی کچھ موجیں آج بھی محسوس ہو سکتی ہیں جس میں پھنس کر جمع و عد کے ان مجرموں کو بہرحال میں چکر کھاتے ہی رہنا پڑتا ہے، یہی جذبہ قدرت کی سلگائی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر کے ان کی چھاتیوں پر چڑھ کر مونگ دلتی رہتی ہے، باہر سے دیکھنے والوں کو یہ بیچارے نظر آتے ہیں کہ ان کے اوپر بھی روپیہ ہے اور نیچے بھی روپیہ ہے، وہ روپیوں ہی میں جاگتے اور اسی میں سوتے ہیں، لیکن جس کی نظر اندر کا کچھ بھی اندازہ کر سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی اشارات کی تصدیق میں وہ شک کر سکتا ہے، بلکہ ہمزہ و لمزہ کے جو شعلے ان کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے وہی ان شکلوں میں ان کی زبانوں کی راہ سے باہر نکلتا رہتا ہے گویا علم کی شہادت ظاہری یہ حالت ہوتی ہے بلکہ سورۂ ہمزہ کی یہی آیت یعنی

یحسب ان مالہ اخلدہ — خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشتا ہے۔

نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے، میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے، بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے، غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں جس "الشجرۃ" کا ذکر ہے، اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں، اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا، جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے، اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ

الاولیٰ عدم القطع بھا — زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کیا جائے۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا، ہم خواہ مخواہ اس کی تعیین میں کیوں سر کھپائیں، خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو، آخر اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی خاص علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا ہے؟ لیکن اگر حضرت آدمؑ کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصے کے اجزا سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو اس وقت دوسرے اجزا سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "الشجرۃ" کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ بہکاتے ہوئے "الشیطان" نے حضرت آدم کو کہا کہ

ھل ادلک علی شجرۃ الخلد — کیا راہ نمائی کروں تمہاری ہیشگی کے درخت کی طرف۔

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ ادا کرایا گیا ہے کہ اس نے آدمؑ و حوّا کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس "الشجرۃ" سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ اس "الشجرۃ" کے استعمال کے بعد تم دونوں کو "خلود" حاصل ہو جائے گا، یعنی تکونا من الخالدین (ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں) کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے، اور دوسری طرف سورۂ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں "خلود بخشی" کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو، لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے، تو جہاں تک قرآنی کا اقتضاء ہے، یہ خیال چنداں بعید نہیں قرار دیا جا سکتا، آخر ان امور پر غور کیجئے

(۱) حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

کلا منھا رغدا حیث شئتما — دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر

ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ — جہاں سے جی چاہے، اور نزدیک مت جانا اس درخت کے، کیونکہ تب ہو جاؤ گے تم اپنی حد سے نکلنے والے، یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ اولاد آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی ہوتی چلتی پھرتی رہتی ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیرپائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے، اب صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد "کل" کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے، عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالے کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے متعلق "خلود بخشی" کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے، یعنی مال اور سرمایہ، گویا آج جو مل رہا ہے کل بھی ملتا رہے، سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے، جیسا کہ بتفصیل اس پر بحث ہو چکی۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ "شجرۃ الخلد" کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے سوآت (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن ہی کے حوالے سے گزر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے تو "الحسنیٰ" یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے، گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

(۳) اسی "الشجرۃ" کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ ہٹا دیئے گئے، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں، بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہئے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا، قرآن میں بھی جیسا کہ گزر چکا "من بخل واستغنیٰ" کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) مال میں جیسے "خلد بخشی" کی کیفیت بظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے، گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے، اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے، حضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس "الشجرۃ" کے استعمال سے چونکہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو، اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

(۵) شیطان نے اس "شجرۃ الخلد" کی ایک صفت ملک لا یبلیٰ بھی بیان کی تھی، یعنی ایک ایسی چیز جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے، لیکن سونا چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے، قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پڑے رہے

اور فرسودہ ہو گئے، اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تر و تازہ حال میں روپیہ
دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت بعد واپس ہو، اسی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے، ایسی کوئی شے جو
پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

(۷) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی "شجرۃ الخلد" کی سزا میں ہبوطِ آدم اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی
کہا گیا کہ تمہارے بعض بعض کے دشمن رہیں گے" یعنی لبعضکم لبعض عدو، آدم کی اولاد میں بھی
آج جتنے جھگڑے رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں یا بڑے پیمانوں پر، آخری چیز ان
تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔

میرے ذہنی اشتعال کے اسباب یہی تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے، صرف
دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا۔ والعلم
عند اللہ تعالیٰ وھو اعلم بمرادہ۔

بہر حال ان قرآنی بیانات کا تعلق قرآن سے تھا، جو مال کے ساتھ بخل اور جمع و منع کا
تعلق رکھتے ہیں، باقی ان ہی سرمایہ داروں میں بعضوں کو جو دیکھا جاتا ہے کہ "العسریٰ" کی زندگی بسر
کرتے کرتے اچانک کبھی کسی کچھ دن کے لئے، ایک ہی دن دو دن کے لئے سہی کچھ ایسی صورت اختیار
کر لیتے ہیں کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اب ان پر گویا "الیسریٰ" کی زندگی آسان کی گئی ہے، مثلاً کسی
تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گزاری جس کا گزارنا شاید کسی ادنیٰ درجہ کے غریب
فقیری حیثیت رکھنے والے کے لئے بھی دشوار ہو، لیکن یہی غریبوں سے بھی غریب تر زندگی رکھنے والا چند
دنوں کے لئے امیرپنے کا مظاہرہ کرتا ہے، یا وہی جو بیع و عقد کے جالوں اور چالوں سے کام لے کر
تمام عمر غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کا ذریعہ اپنے سرمائے کو بنائے رکھتا ہے، ایک ایک پیسے کو
غریبوں کی جیبوں میں چھپا کر سیکڑوں اور ہزاروں روپے وصول کرتا رہتا ہے، اس طور پر وصول کرتا
رہتا ہے کہ وصولی کی اس مہم میں کسی غریب کی غربت کسی لاچار کی لاچاری پر لمحہ بھر کے لئے بھی اس کا
دل ترس نہیں کھاتا، لیکن ناگاہ دیکھا جاتا ہے کہ شہر کے کسی موڑ اور چوراہے پر یا کسی بڑے ریلوے اسٹیشن
کے سامنے "دھرم" کے نام سے کسی بلند و بالا اونچی عمارت کی تعمیر میں وہی اس لئے مصروف ہے کہ تھکے
ماندوں کو آرام ملے گا، مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے، یا از قبیل چیریٹی CHARITY اور خیرات خانے
کے نام سے کسی بڑی رقم کا اعلان اس احساس کے ادعا کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کا دل آدم کی
بے سرمایہ اولاد کے لئے روتا رہتا ہے، مفلوک الحالوں کے لئے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے، انسانی ہمدردی
کے ان ہی فریبانہ جذبات سے بے کل ہو کر کبھی اسپتال کھولتا ہے، کبھی محتاجوں کے لئے مخصوص
کر دیتا ہے کہ اس نے سدا برت جاری کیا ہے، غریبوں میں غلہ تقسیم کرتا ہے، حالانکہ یہ واقعات لے
دن دنیا میں پیش آتے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دلوں میں یہ سوال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ

نظریہ ابتلائیت کے انکار کے بعد کرنے والے یہ سب کچھ جو کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ خدا کو خوش کرنا
چاہتے ہیں، خدا اور خدا کی ذمہ داریاں ہی اگر انہیں یاد رہتیں تو سرمایہ کے جمع کرنے میں وہ خدا کی مرضیات
سے بے پروائی ہی کیوں برتتے، یہ نہیں تو کیا واقعتہً غریبوں کی غربت پر واقعی کیا ان کا دل دکھا ہے؟ انسانی
برادری کے متعلق ان کے دل میں کیا رحم کا کوئی جذبہ حقیقۃً متلاطم ہوا ہے؟ جن کی مالی فربہی ہزار غریبوں
کے خون ہی کے چوسنے سے پیدا ہوئی ہے، کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان کا دل غریبوں کی غربت پر
تڑپ سکتا ہے، افلاس جیسا پھیلا کر ملک کے عام باشندوں سے امراض کے مقابلہ و مقاومت کی قوت
جن کے کرتوتوں کی بدولت سلب ہو گئی ہو کیا ان ہی بے دردوں کو ان بیچاروں کی بیماریوں سے بھی
کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب وہ خرچ کرتے ہیں، تو یقیناً سوال ہوتا
ہے کہ کیوں کرتے ہیں؟ آئیے سنئے، قرآن کی آیتیں سنئے "آپ خود نہیں سوچتے تو قرآن جو کچھ کہتا ہے
کم از کم اسے تو سوچا کیجئے" ارشاد ہے،

والذی ینفق مالہ رئاء — (احسان کرنے کے بعد احسان جتلانے والوں
الناس ولا یومن باللہ — کی مثال) اس شخص کے جیسی ہے جو خرچ
والیوم الاخر۔ — کرتا ہے اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کے
لئے اور نہ مانتا ہے وہ اللہ کو اور نہ پچھلے دن کو (یعنی قیامت کے دن جو بدلہ کا دن ہے
اس کے یقین سے بھی وہ محروم ہوتا ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرنے والے صرف اسی لئے خرچ نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس خرچ سے خوش
ہو گا یا خدا کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے گا، بلکہ خرچ کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے جس میں پیش نظر مقصود
ہوتا ہے تو وہ بس رئاء الناس (لوگوں کو دکھانا) ہی ان کے مصارف کا نصب العین ہوتا ہے
اور یہ بھلا یہی بات کہ دیکھنے اور دکھانے کا تعلق خدا سے جو توڑ چکا ہے اب وہ دکھائے بھی تو آخر
کسے دکھائے، جن کو غریب بنا کر وہ اپنی امیری پیدا کرتا ہے، ان ہی غریبوں کی آنکھوں میں اپنی دھوم دھام کا
لپٹے ہوئے پاروں سے، سچ پوچھئے تو سرمایہ داروں کا یہ طبقہ خاک جھونکنا چاہتا ہے، "تکذیب بالحسنیٰ" سے
پیدا ہونے والی لعنتوں کو اس تدبیر سے چاہتا ہے کہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے
اور اسی لئے سیکڑوں چوہوں کی نگلنے والی یہ بلی در اصل "حج" کے لئے کر سکتی ہے، بلکہ سب نہیں تو ایک
بڑا گروہ ان میں ایسے بد باطنوں، سیاہ سینوں کا بھی ہوتا ہے جو "ریاء الناس" کی اس کمائی سے بھی
غریبوں کے قلوب کو ہتھوڑے کے تیروں اور برچھیوں سے گھائل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ دوسروں کی ہستی
ہو جیسے اس خیال سے باوجود قدرت و استطاعت کے اللہ کے خاص بندے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں
غربت کی زندگی گزارتے ہیں، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں دوسروں کو تلملانے اور جلانے کے لئے اپنے
مالی زور اور سرمایہ کی قوت کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں، اور جن کی نیت یہ نہ بھی ہوتی ہو لیکن نظریہ ابتلائیت
سے ہٹ کر خرچ کرنے والوں کے سامنے یہ بات تو ضرور ہوتی ہے کہ دوسروں پر ان کی دولتمندی کا

دوسروں سے مجھے بحث نہیں، لیکن میرے خیال میں اس آیت کے متعلق جو بات آتی ہے اسے عرض کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ مال اور سرمایہ میں خود بخشی کی قوت پا کر "جمع و عدد" کی تدبیروں پر عمل کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ صرف یہی نہیں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، بلکہ نتائج کے اس پھیر میں الجھ جانے والوں کو اسی وقت چور کر کے شکل دینے والی "الحطمۃ" اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں جھونک دیا جاتا ہے جو اپنی "اندرونی لگد کوب" سے انہیں چور چور کرتی رہتی ہے اور وہ بیچارے باطن کے ان ہی آتشیں کیفیات میں اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں، اسی طرح خرچ کرنے کے متعلق یہ خیال کہ وہ خطرات سے محفوظ کر کے آدمی کو اطمینانی زندگی بسر کرنے کا موقع عطا کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا سوال یعنی وہ کیا خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا "اس میں بھی گویا یہی بتایا گیا ہے کہ خطرات سے محفوظ ہو جانے کے مقصد میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے۔ اس کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سوال کو اپنے دل میں اٹھائے اور سوچے کہ دولت کی خواہ جتنی بڑی سے بڑی مقدار اس مقصد کے لئے خرچ کی جائے، پھر بھی آدمی کیا اپنے آپ کو اور اپنے سرمایہ کو خطرات سے محفوظ پاتا ہے؟ یعنی بس نہ چلے گا اب اس پر کسی کا، اسی سوال کو اٹھا کر دیکھئے اس کے دل کا اس کے دماغ کا اس کیا ہے؟ بلاشبہ عجیب سوال ہے، وہی نہیں جو بیچارے انسداد خطرات کی راہ میں دس بیس ہزار خرچ کرتے ہیں، بلکہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کروڑہا کروڑ (حتی کہ آج تو اربہا ارب) کے خرچ کرنے والوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کی حد تک تو وہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خوب خرچ کرتے رہتے ہیں، لاکھوں لاکھ تعداد والی فوجیں رکھتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار، اور اسلحہ تیار کرتے ہیں، نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا تقریباً اکثر و بیشتر حصہ اسی راہ میں بہاتے رہتے ہیں، عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیٹ کو نہیں پاؤں ہی کو آرام پہنچانے کے لئے ریلیں بناتے ہیں، سڑکیں تعمیر کرتے ہیں، عوام کا کام نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، لیکن کہتے یہی ہیں کہ ان ہی کو روشن دماغ بنانے کے لئے تعلیم گاہیں کھولتے ہیں، یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں، لیکن باوجود سب کچھ کرنے کے دوسرے ہی نہیں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ قرآنی سوال،

أیحسب ان لن یقدر علیہ احد — کیا خیال کرتا ہے وہ کہ اب بس نہ چلے گا اس پر کسی کا۔

کے جواب میں "نہیں" کے سوا ان اربوں اور کھربوں کے خرچ کرنے والوں کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت تک تو کوئی دوسرا جواب نہیں ملا ہے، ایک خطرہ ختم ہوتا ہے، تو دس خطرات دانت نکالے چاروں طرف سے چھپ چھپ کر جھانکنے لگتے ہیں، اور تھوڑے سے تھوڑے عرصے کے بعد "سرمایہ" کی بڑی سے بڑی مقدار ان ہی مزعومہ خطرات کی راہوں میں سلگ اور دھواں بن بن کر قرآنی آیت

حبط ما صنعوا فیہا وباطل ما کانوا یعملون — اکارت ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھرا تھا انہوں نے اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

کا تماشا عبرت پذیر نگاہوں کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے، خرچ کر کر کے "چھوٹے دائروں" کے خطرات سے اس قسم کے خرچ کرنے والے پاتے ہیں کہ وہ محفوظ ہو گئے کہ اچانک اس سے بڑے خطرے کو دیکھتے ہیں کہ سر پر کھڑا دھمکا رہا ہے، آدمی کیا کرے کتنا خرچ کرے، تاریخ جن جن خرچ کرنے والوں کے قصے سناتی ہے، سنائی جاتی ہے، بتاتی جاتی ہے کہ خرچ کے ہر پیمانے پر خطروں کا لوگوں کو شکار ہونا پڑا کتنے دنوں کی بات ہے، ابھی ابھی گذری ہے، آدھی دنیا اور اس کی پیداواروں کا شخصی مالک زار جس کے ذاتی مصارف کی فہرست تیار کرنے والوں نے یہ تیار کی ہے کہ

> "جو ٹوپی پہنتا تھا وہ مستقل ایک جگ مگ جگ مگ کرنے والا گویا ایک شعلہ تھا ایک نہیں، دو بڑے بڑے موتیوں کے ہار اس پر لپٹے ہوئے تھے، سامنے سب سے اوپر ایک لعل تھا جس پر الماس کی ایک صلیب چڑھائی گئی تھی ہاتھ میں ملکہ کیتھرائن کا وہ عصا تھا جو صرف زر خالص سے ڈھالا گیا تھا، جس کے اوپر رنگ رنگ کے انمول جواہر جڑے ہوئے تھے، عصا کے سر پر ایک لٹو تھا الماس کا، اور اس کے سوا بھی وقتاً فوقتاً استعمال کے لئے اس کے خزانے میں جو جواہرات رہتے تھے، جن میں الماس، زمرد، یاقوت وغیرہ سب ہی طرح کی چیزیں تھیں، جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ اسی ملین پونڈ (ایک ارب بیس کروڑ روپے) سے کی جاتی تھی، اور جن میں بعض جواہر کی تاریخ ہزار ہزار سال سے بھی متجاوز تھی۔" الہلال دسمبر ۱۹۲۲ء

لیکن وہ بھی جب واقعے نے ثابت کر دیا کہ "لن یقدر علیہ احد" (انہیں قابو چل سکتا ہے کسی کا) حق کے مقام تک نہ پہنچ سکا، اور یہ ہزار بے کسی و بے بسی وہ بھی اس کے بچے بھی اس کی محبوبہ بیوی بھی جس کے سامنے تڑپا تڑپا کر ذبح کئے گئے، تو جن مسکینوں نے خود اپنا اور اپنے عزیزوں کا اپنے فرزندوں اور دوسرے حق داروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہزار یا لاکھ وغیرہ اعداد کی صورت میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے، کس بنیاد پر ان غریبوں سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جانے کا دعویٰ کر کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں؟

خلاصہ یہی ہے کہ اپنی جبلی معیشت میں اختیار اس کی جائے کہ وہ ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کرنے والوں کو نہ تو سرمایہ کے جمع ہی کرنے میں چین کی صورت میسر آتی ہے اور نہ خرچ ہی کرتے ہی سکون تمام کوئی حصہ انہیں نصیب ہوتا ہے، دیکھا بھی جا رہا ہے، اور قرآن میں جو کچھ سنا گیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اضطراب اور بے چینی، تڑپ اور قلق، خلش اور تپش، سوز اور جلن، درد اور کرب، گھٹن اور کڑھن کی سانس ان کے اندر بھی جاتی ہے اور وہی باہر بھی آتی ہے، ان ہی بدبودار آتشیں گرم گرم سانسوں کے ساتھ جیتے بھی ہیں، اور جس دن مرتے ہیں تو آخری سانس بھی ان کی باطن کی ان ہی متعفن گندی کیفیتوں میں ٹوٹتی ہے، مرنے سے پہلے یہی قدرت کا انتقام ان کے معاشی جرائم کی

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی کوٹھی کی ایک چھت میں پھانسی پڑی ہوئی اس کی لاش لٹکی ہوئی ہے اور لاش کے نیچے اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ پڑا ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

مجھے اپنی طویل زندگی میں تجربہ ہوگیا کہ راحت کی تلاش اگر ہے تو روپے کے ڈھیروں میں وہ نہیں ملتی، میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں، اس لئے کہ تنہائی اور افسردگی سے میں عاجز آگیا ہوں۔ جس وقت نیویارک میں میں معمولی مزدور تھا۔ اس وقت مجھے مسرت حاصل تھی۔ لیکن آج کروڑوں کا مالک ہوں، مگر میری افسردگی کی انتہا نہیں، اور ایسی زندگی پر میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔"

اور یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے کیونکہ امریکہ کے ادب ہی کا یہ قول گذر چکا کہ

"لاکھ پتی آدمی مسکرا نہیں سکتا"

راک فیلر کے بیان کا بھی کہیں ذکر آیا تھا کہ "سب سے بڑا مفلس وہی ہے جسے روپے کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے" اسی اخبار حقانی میں یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ جیسی دیاہنٹ نامی انگلستان کے نامور رئیس تھے، مولینا عبد الماجد صاحب دریاآبادی (مدیر صدق) نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک (انگلستان) کے نامور امراء میں ان کا شمار تھا، بڑے ذہین اور طباع مشہور تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ کا لوگ لوہا مانتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ آج ایک تھیٹر کھول کر لاکھوں لاکھ کا ڈھیر لگا دیا کل روئی کے کارخانے جاری کر کے روپے کا انبار لگا دیا، پرسوں گھوڑ دوڑ کی بازیوں میں بازی لگا کر لاکھوں لاکھ جیت لیا، ایک روز بڑے نائلون کی فیکٹری کے مالک ہوگئے، دولت و ثروت، خدم و حشم کے ساتھ سوسائٹی میں گھلنے ملنے کا بھی بڑا شوق رکھتے تھے، شاہی خانوادے تک رسائی تھی۔ الغرض جیسے ہی نہیں بلکہ عقد والحاک یعنی اس راہ کے ہر مرحلے کے ماہر و شاطر تھے، لیکن ہوا کیا؟ مولینا ہی ارقام فرماتے ہیں،

ایک دن جب انگلستان میں ٹھیک سورج گرہن کا منظر لوگ منا رہے تھے۔ دیکھا گیا کہ بند کمرے میں سانس سے خالی ان کی لاش پڑی ہوئی ہے، سرہانے ایک تحریر بھی تھی جس میں لکھا تھا۔

(ترجمہ یہ ہے)

موت کے دروازے پر قدم رکھتے وقت اپنے آخری مضمون میں اس شخص کے نقطۂ نظر سے موجودہ تمدنی زندگی پر تبصرہ کروں گا جو سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہے، میں نے بادشاہوں تک کی میزبانی کی ہے۔ بڑے بڑے امراء اور والیان ریاست سے میری بے تکلفی کا یارانہ رہا ہے، سیاسیات کے حلقہ میں بھی رہا ہوں، ایک تھیٹر کا مالک بھی رہا ہوں، ایک ایک دن میں ساڑھے سات سات لاکھ پونڈ (گویا ایک کروڑ بیس لاکھ) کی

دولت کمائی ہے، اخبارات کا حصہ دار رہا ہوں، گھوڑ دوڑ کی بازی میں ایک ایک لاکھ پونڈ جیتتا رہا ہوں، مانچسٹر تک اپنی اسپیشل ٹرین پر گیا ہوں، اس لئے موجودہ تمدنی زندگی پر رائے دینے کا حق رکھتا ہوں:

آج میں اپنی زندگی کے آخری دن جب کہ ماضی کے سب سے نقشے جلدی جلدی میرے پیش نظر ہو رہے ہیں، مجھے نظر آرہا ہے:

موجودہ تمدن بجز حرص و خواہش نفسانی حب جاہ کے اکساوے کے اور کچھ نہیں ہے، جذبات عالیہ اور قناعت اب خواب و خیال میں ہیں، اور ان کی بجائے ایک نفرت انگیز ہنگامہ برپا ہے، ایک طرف شہوت جاہ، شہوت زر، شہوت زن کا زور ہے، دوسری طرف بولشویک دنیا تخلیق جدید کے خبط میں مبتلا ہے، ہر شخص پر دھن سوار ہے کہ محنت کم کرے اور روپیہ زیادہ ملے اور کچھ ہے خوب اڑانے کو ملیں اور بے حسی کی اس شدت کو دیکھ کر روح لرزاٹھتی ہے دل دھڑک رہا ہے، میں خدا کے آگے جھکتا ہوں، میں اسی سے لو لگاتا ہوں، میں قماربازی کی معصیت میں مبتلا رہا ہوں۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہئے۔" (سچ ۳۰ جولائی ۱۹۳۵ء بحوالہ سنڈے ایکسپریس)

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے سامنے اب تک پیش کیا جا چکا ہے یہ آیت قرآنی

ومن اعرض عن ذکری فان له	اور جو کترایا میری یاد سے تو اس کے لئے
معیشة ضنکا۔	ہے تنگی اور تنگی سے بھری ہوئی معیشت

کی شہادتی اور تجربی تفسیر کے لئے کافی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ذکر اللہ سے انحرافی زندگی جس نقد انتقام کے تجربات کو آئے دن پیش کرتی رہتی ہے جس پر گذرتی ہے وہی نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اندرونی کشمکش کے ان نتائج و آثار کے مشاہدہ کرنے کا بسا اوقات موقع ملتا رہتا ہے جن میں بظاہر سکھ اور درحقیقت سراسر دکھ بھری زندگی رکھنے والے لوگ مبتلا رہتے ہیں، وہی جنہیں اونچے اونچے بنگلوں، طرح طرح کے محلوں، پر شوکت سواریوں کے درمیان خدم و حشم کے جھرمٹوں میں بھی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

یا

خشب کی الجھنیں ہیں زندگی بس سر ہی پہ آیا باطینان دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی

اور اسی قسم کے اشعار پر سر دھنتے پایا گیا ہے، جن کی نگاہوں میں غالب شاعر ہی صرف اسی لئے بڑا شاعر ہے کہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یاس

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جیسے اشعار میں وہی بات کہہ دی ہے جو ان کے دل میں تھی، اکبرؔ مرحوم کے ایسے اشعار مثلاً

غریب اکبرؔ کے گرد کیوں ہیں جناب واعظ سے کوئی کہہ دے
اسے ڈراتے ہو موت سے کیا وہ زندگی ہی سے ڈر چکا ہے

یاس

اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں — مجھ کو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں

سن کر ہمیشہ تڑپتے اور پھڑکتے ہی دیکھا گیا ہے، جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ ان کے اندر ہو رہا ہے۔ اسی کی غمازی یہ اشعار کر رہے ہیں۔ آج بھی کسی کو شوق ہو نظریۂ "ابنائیت" سے لاپروا ہو کر ضنکی معیشت رکھنے والوں کا تجربہ ان اشعار کو سنا کر وہ کر سکتا ہے کسی مجلس میں جہاں اس طبقے کے لوگ جمع ہوں، آپ مذکورہ بالا اشعار یا اسی مفہوم کو دوسرے شاعروں نے بکثرت اپنے شعروں میں ادا کیا ہے۔ انھیں سنا دیجیے اور پھر دیکھیے تماشا۔ دیکھیے کہ اپنے دل کے حالات کا آئینہ ان حرکات و سکنات کو کس طرح بنا رہے ہیں جو ان اشعار کے سننے کے بعد ان پر طاری ہوتے ہیں۔"

البتہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے اور بجا سوال ہے کہ قدرت کے ان خمیازوں کو بھگتتے اور بھگتتے رہنے کے باوجود پھر یہ کیا ہے کہ ان میں کوئی بھی ضنکی معیشت سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے، اور نہ انحرافی طریقۂ عمل کو ترک کر کے بازگشت پر کوئی آمادہ نظر آتا ہے اگر واقعی ان ہی کلفتوں اور سوزشوں میں ان کی زندگیاں جلتی اور بھنتی رہتی ہیں۔ تو ایسی کونسی چیز ہے جو انھیں اندر ہی اندر گھٹائے رکھتی ہے، سب کچھ کہتے ہیں، سب کچھ سنتے ہیں، عقل رکھتے ہیں، ہوش رکھتے ہیں، حواس رکھتے ہیں، جب چاہیں پلٹ سکتے ہیں، پھر سکتے ہیں، پھر وہ کیوں نہیں پلٹتے، کیوں نہیں پھرتے؟

اب میں اس کا جواب کیا دوں، حالانکہ پڑھا جاتا تو قرآن ہی میں اس کا جواب بھی مل سکتا تھا، لیکن مصیبت یہ ہے خصوصاً اس زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ جن ان دیکھے اسباب و علل کو بتانے کے لئے پیغمبر آئے تھے، ان ہی ان دیکھی باتوں کو دلیل بنا کر پیغمبروں کی پیغمبری اور انبیاء کی نبوتوں میں شک اندازی کی جا رہی ہے، طبیب کے پاس مریض اسی لئے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا پتہ اسے نہیں چل رہا ہے، طبیب سے ان کا علم حاصل کرے اور اسی کے مطابق طریقۂ علاج اختیار کرے، لیکن مرض کے جن مخفی اسباب کی طبیب نشاندہی کر رہا ہو، مریض اگر ان ہی مخفی اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت ہی کا انکار کرنے لگے کہنے لگے کہ اپنے مرض کے جن اسباب کو میں جانتا ہوں چونکہ ان اسباب کی تم نشاندہی نہیں

کر رہے ہو، یعنی جو کچھ میں جانتا ہوں وہی چونکہ تم نہیں بتا رہے ہو، اسی لئے تمہارے طبیب ہونے پر مجھے بھروسہ نہیں، بتائیے کہ اس قسم کے مالیخولیا رکھنے والے مریضوں کا علاج دنیا کا کوئی طبیب کر سکتا ہے؟

حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہ تھی، ان ہی چیزوں کے بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لئے تو خدا نے نبوت اور وحی کی نئی راہ کھولی تھی، لیکن کہنے والا اگر اس پر اصرار ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی اختلال کے مریضوں کے لئے پیغمبروں کی پیغمبری اور نبیوں کی نبوت ہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

یہی سوال ہے، کتنا اچھا، کتنا معقول سوال ہے، دکھ درد کے اسباب سے انسان فطرتاً بھاگتا ہے، انحرافی زندگی اگر دکھ ہے تو چاہئے تھا کہ آدمی اس سے بھاگتا، لیکن بھاگنے کا کیا، دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ بڑھنے والوں کا غلو دن بدن اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سو کے حلقوں میں جکڑنے والے کوشاں رہتے ہیں کہ ہزار حلقوں والی زنجیریں ان پر چڑھا دی جائیں یوں ہی ہزار والے لاکھ کی اور لاکھ والے جہاں تک جا سکتے ہیں، جانے میں قطعاً کمی نہیں کرتے یہی کہتے ہیں کہ لکھ پتی کبھی مسکرا نہیں سکتا، لیکن جو لکھ پتی ہیں وہ کروڑ پتی بننے کے لئے اور کروڑ پتی ارب پتی بننے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں، پھر یہ قصہ کیا ہے؟

اب آپ مانئے یا نہ مانئے۔ لیکن قرآن ہی میں اسی ذکر اللہ سے انحراف کی پاداش میں اس دوسری مخفی سزا کا بھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی ارشاد ہے،

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن	اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمن کی یاد سے
نقیض له شیطانا فهو له قرین	تو پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے ایک
(زخرف ع ۳)	شیطان کو پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے

اور یہ ہے درحقیقت "تنگی معیشت" اور تلخ زندگی کے پھل کا وہ مخفی [illegible] درخت جس کے پھل کا مزہ تو ان میں سے ہر ایک کو چکھنا ہی پڑتا ہے جن کی زندگی ذکر اللہ سے کٹ کر گذر رہی ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ درخت ہی جب تک اکھاڑا نہ جائے گا، پھل کے پھلنے کو کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، اور انسانی فطرت کے جگر میں جڑ قائم کرنے والا یہی وہ درخت ہے جس کے اکھڑنے اور نکالنے کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ جس چیز کی حرارت سے وہ مرجھاتا ہے اور جھڑ کر گرتا ہے گرنے کے بعد خود بخود اس کی جڑ نکل جاتی ہے، اسی حرارت کے مہیا کرنے کا سامان کیا جائے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں، اور یہی پوچھتے ہیں کہ یہ "شیطان" آخر کیا بلا ہے، مگر اس کا جواب دینے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ بیچارا کچھ نہیں ہے، صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے، پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے متعین کے

اس کو پیدا کیا ہے۔ جو جس حد تک اس قدرتی منصب لعین سے ہٹتا ہے۔ زہر رکھنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا ہے، برستا چلا جاتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے، اپنے منصب لعین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لئے بنایا گیا ہے، یہی اس کا کام ہے، ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان	میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں۔

کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے۔

واجلب علیہم بخیلک ورجلک	اور چڑھا جا ان پر (آدم کی اولاد پر)
وشارکہم فی الاموال	اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ
والاولاد وعدہم	ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد
وما یعدہم الشیطان	میں، اور وعدوں (کے سبز باغ دکھا)
الا غرورا۔	ان کو، اور نہیں وعدے کرتا ہے ان سے
	شیطان مگر صرف فریب۔

"الاولاد" کے ساتھ "الاموال" میں جن لوگوں کے وہ ساجھی اور شریک بن جاتا ہے، یقین مانیے کہ ان ہی مسکینوں کو "دھن" کی شکل میں ہو، یا "حرص" کی راہوں میں، بہر حال ان ہی مشاغل و مصاحبات میں مبتلا کرتے ہوئے وہ گھسیٹتے لئے چلا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل قرآن کے حوالہ سے گزر چکی۔ مسرفانہ زندگی گزارنے والوں کو اس حال میں جو دیکھا جاتا ہے کہ چیختے بھی جاتے ہیں، چلاتے بھی جاتے ہیں، جلتے بھی جاتے ہیں اور گھٹتے بھی جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی چلے جاتے ہیں چڑھتے بھی جاتے ہیں، تو درحقیقت وہ خود نہیں بڑھتے، خود نہیں چڑھتے، قرآن کی روشنی میں دیکھئے اس شیطان کو جو انھیں دبوچے ہوئے بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریتہ (میں ڈھاٹی لگاؤں گا اس کی اولاد کو) گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رسی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں، اسی کو اردو میں ڈھاٹی لگانا اور عربی میں احتناک کہتے ہیں، [illegible] عتری لگانا کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو عتری لگا کر لوگ لے چلتے ہیں جو گدھوں اور گھوڑوں کی تذلیل کی شکل ہے، شیطان نے بھی دعویٰ کیا کہ انھیں گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا! گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے، گویا وہی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ کمل کو یہ نہیں چھوڑتے ہیں، ... بلکہ کمل ہی انھیں نہیں چھوڑنا چاہتا، جب تک کہ وہی چھو کر اس پر چھوڑتا

جائے جس کے سوا دنیا کے کسی جھاڑ اور پھونک کو وہ نہیں سنتا،[1] صحیح حدیثوں میں آیا ہے،

اذا ذکر اللہ خنس	جب آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے تب
	وہ پیچھے سرک جاتا ہے۔

ورنہ جب تک یہ نہیں ہے اس کا کام یہی ہے کہ جس چیز میں درحقیقت خدا بخشی کی قوت نہیں ہے باور کرائے کہ وہی آدمی کو غنی بناتی ہے، خود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے، دھوکہ دیتا ہے کہ وہی خود بخش ہے۔ جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں، باور کراتا رہتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں، جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا، سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے، الغرض جو ہے، شیطانی تسبیط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے، اور جو نہیں ہے، عجیب بات ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ وہی ہے یہی تو جہ ہے، آیت کریمہ قرآنیہ

وما یعدہم الشیطان الا غرورا	اور نہیں وعدہ کرتا ہے ان سے شیطان
	لیکن صرف فریب اور دھوکہ۔

کا، اور اب سمجھ میں آتا ہے اس کا مطلب کہ وہی قرآن وہی اسلام جس کی تعلیم ہی کہ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے، بلکہ آسمانوں و زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے، خدا نے سب کو انسان ہی کے لئے بنایا ہے، اسی قرآن میں

وما الحیوۃ الدنیا الا	اور نہیں ہے یہ پست زندگی، لیکن
متاع الغرور۔	صرف سرمایۂ فریب۔

اور ان جیسی آیتوں کو بھی جو پایا جاتا ہے تو ان کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں اسی نظریہ کو دہرایا گیا ہے، جس کے ماننے والوں نے دنیا اور دنیا کی چیزوں کو مایا اور مایا کا جنجال قرار دیا ہے، بہتوں کو دونوں نظریوں میں تناقض نظر آتا ہے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ اسلام کی تشریح و تفصیل کرنے والوں میں ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کو دنیا کا بھی ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں، وہ تو اس قسم کی آیتوں، حدیثوں کے ذکر سے پرہیز کرتے ہیں

---

[1] مسلمانوں میں بعض چیزیں کچھ ایسے طریقے سے مشہور ہیں کہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ [illegible] ان کے طریقوں کا تو سب ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ [illegible] ہے کس مرض کا۔ اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، یہی ذکر اللہ کا مسئلہ ہے۔ اسلامی تصوف کا سارا دار و مدار اسی کثرت ذکر پر ہے۔ صوفی کہتے ہی اس کو ہیں جو کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہ ہو، اور اسی دوام ذکر کی کیفیت کو حاصل کرنے کے ارباب تصوف نے بے شمار طریقے ایجاد کئے ہیں، لیکن یہ سوال کہ ہر وقت ہر حال میں خدا کے ذکر کی آدمی کو ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ حالانکہ دوسرے فوائد کے سوا ذکر اللہ کا سب سے بڑا فائدہ اسی تسبیط شیطان کے مرض کا ازالہ ہے، اس کا واحد علاج یہی ہے ۱۲

اور جن پر دینی جذبہ کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں کو پیش کر کے ان کے خیال کی تردید کرتے ہیں، حالانکہ نہ وہ غلط ہے اور نہ یہ غلط ہے ملنے والوں میں دنیا اور دنیا کی پیداواروں کو جو اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ پہنچتی ہیں، اور ٹھیک وہی مثال جو پیغمبر سے بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں مروی ہے اسی کو اپنی عملی زندگی میں دستور العمل بناتے ہیں، ان کی یہی دنیا آخرت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس حدیث کے ایک جز کا پہلے بھی ذکر آیا ہے، یہاں پوری حدیث نقل کی جاتی ہے، ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں،

جلس النبي صلى الله عليه وسلم على المنبر وجلسنا حوله فقال ان مما اخاف عليكم بعدي ما يفتح الله عليكم من زهرة الدنيا وزينتها فقال رجل او يأتي الخير بالشر يا رسول الله فسكت عنه فقالوا ما شانك تكلم رسول الله ولا يكلمك وارينا انه ينزل عليه فافاق يمسح الرحضاء وقال اين السائل آنفا ان الخير لا يأتي الا بالخير وان هذا المال خضرة حلوة وان ما ينبت الربيع ما يقتل حبطا او يلم الا آكلة الخضر فانها اكلت حتى اذا امتدت خاصرتاها استقبلت عين الشمس فثلطت وبالت ثم رتعت وان هذا المال حلوة من اخذه بحقه ووضعه في حقه فنعم المعونة هو ونعم صاحب المال هو لمن اعطى منه المسكين

تشریف لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر اور ہم لوگ آپ کے اردگرد بیٹھ گئے تب اللہ کے پیغمبر نے کہنا شروع کیا، بلاشبہ جس چیز سے ڈر رہا ہوں اپنے بعد وہ وہی چیزیں ہیں جنہیں فتح کرائے گا اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے دنیا کی تروتازگی سے اور اس کی زینت بناؤ سنگار سے (یعنی آئندہ اسلامی فتوحات کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا تھا) تب کہا ایک آدمی نے اے اللہ کے رسول کیا خیر اور بھلائی کے بعد شر اور برائی آئے گی؟ (یعنی بھلائی سے کیا برائی کا نتیجہ پیدا ہوگا؟) تب چپ ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں نے کہنا شروع کیا، رسول اللہ تو ایک بات فرما رہے تھے تجھ سے تو نہیں بول رہے تھے (جو تو نے خواہ مخواہ سوال کیا) اسی حال میں دکھایا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی (یعنی نزول وحی کے وقت جو ایک خاص حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتا تھا وہی کیفیت شروع ہو گئی) پھر اس حال سے افاقہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرمایا کہ

واليتيم وابن السبيل او كما قال صلى الله عليه وسلم وان من يأخذه بغير حقه كالذي يأكل ولا يشبع ويكون عليه شهيدا يوم القيامة۔

(رواه البخاري ومسلم والنسائي)

ابھی جس نے سوال کیا تھا وہ کہاں ہے؟ پھر فرمایا کہ اچھی چیز نہیں پیدا کرتی لیکن اچھے ہی نتائج کو اگر جب اس کا استعمال ٹھیک طور پر کیا جائے، پھر فرمایا کہ دیکھو یہ مال اور سرمایہ ہرا بھرا میٹھی چیز ہے لیکن برساتی پھواروں کے کنارے جو ہریالی اگتی ہے (سو وہ اگرچہ اچھی چیز ہے) لیکن اس کو

جب کوئی جانور زیادہ مقدار میں کھا جاتا ہے تو وہی ہریالی اس کو قریب موت کے پہنچا دیتی ہے، مگر ایسی مویشیاں جو صرف ہری ہری دوب کو چرتی ہیں کہ وہ انہیں کھاتی ہیں، پھر جب ان کے دونوں پہلو بھر جاتے ہیں، تو آفتاب کے سامنے دھوپ میں جا کر بیٹھتی ہیں، پھر گوبر کرتی ہیں، اور پیشاب کرتی ہیں، پھر جا کر چرتی ہیں (اس مثال کو بیان کر کے فرمایا) پس یہی حال مال کا ہے، بڑا میٹھا ہے جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ، اور حق ہی میں اسے خرچ کرے، تو بہترین مددگار ہے اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا آدمی ہے جو اپنے اس مال سے مسکین، یتیم، مسافر کو دیتا ہے پھر یہی الفاظ یا جیسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور فرمایا کہ جو اس مال کو اس کے حق کی راہ سے نہیں لیتا، اس کی مثال ایسی ہے کہ کھائے جاتا ہے لیکن پیٹ اس کا نہیں بھرتا اور قیامت کے دن یہی مال اس کے خلاف گواہ بن جائے گا۔

آپ نے دیکھا اسلام کے نقطۂ نظر کو، وہی مال اور وہی سرمایہ جس سے عموماً مذہبی مزاج والوں نے ہمیشہ نفرت ہی کا اظہار کیا ہے۔ خود مسیح کا دین حالانکہ سمجھا جاتا ہے کہ روشن خیالی کا دین تھا، لیکن چونکہ بہرحال وہ دین ہی تھا، اس لئے "مقدس راہبوں" کے خطاب سے زیادہ تو مسیح کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ کسی اور نام سے ان دولتمندوں کو موسوم کرتے جن کے متعلق انجیل میں خبر دی گئی تھی کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ آسمانی بادشاہت میں دولتمندوں کو گھسنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اسلام اسی دولت اسی سرمایہ اور مال کو خیر کہتا ہے اور یہ کہ بجائے خود وہ قطعاً شر نہیں ہے وابستہ خریدوں کا غلط استعمال اس کو شر بنا دیتا ہے، یہی حاصل ہے مذکورہ بالا حدیث کا بلکہ کا پوچھئے تو جو کہتے ہیں کہ سب کچھ یہیں ہے، یہاں کے سوا کہیں بھی کچھ نہیں ہے، قرآن میں

لم يرد الا الحيوة الدنيا — مقصود بنایا اس نے لیکن صرف اسی پست زندگی کو۔

ضل سعيهم في الحيوة الدنيا — یا کھوگئی ان کی سرگرمیاں اسی پست زندگی میں

وغیرہ الفاظ میں جس مسلک کی تعبیر کی گئی ہے، یعنی وہی مسلک جو آج مغربی اقوام و ملل اور ان کے طفیلیوں کی اکثریت پر مسلط ہے، یعنی پیٹ اور روٹی والا خالص مادی نظریہ اور ٹھیک اسی کے بالمقابل جو یہ کہتے ہیں کہ کچھ بھی یہاں نہیں ہے، یا جو کچھ بھی ہے جو گنے کے لئے نہیں بلکہ بھاگنے اور صرف بھاگنے کے لئے ہے، جس کا ذکر جیسا کہ گذر چکا، قرآن میں

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا	رہبانیت کا مسلک جسے ہم نے ان پر
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔	واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔

کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ الغرض مادیت اور رہبانیت ان دونوں افراطی و تفریطی متضاد نظریات کے درمیان جب دستور بیچارے انسان کے اپنی پرانی تدبیر آزما آزما کے تھک گئے کام لے کر اسلام نے انسانی فطرت کو اس کی وہ کھوئی ہوئی چیز عطا کر دی، جسے پیغمبروں کی تعلیم سے بچھڑنے کے بعد وہ بیٹھا کھو چکی ہے، الخیر لا یاتی الا بالخیر (اچھی چیز نہیں پیدا کرتی، لیکن اچھے ہی نتائج کو) یہی وہ پیغمبرانہ فقرہ ہے جس میں وہ سارا مضمون سمٹ کر آ گیا ہے جسے اب تک کسبی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کی تفصیل میں آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، دولت اور سرمایہ سے جب غلط نتائج کا تجربہ لوگوں کو ہونے لگا اور تاریخ کا کونسا دور ہے جس میں سرمایہ اور مال کے ان تلخ نتائج کی تلخیاں لوگوں کو نہ چکھنی پڑی ہیں، آج بھی یہی ہوا ہے، ہو رہا ہے، اور کل بھی یہی ہوا تھا، ہوتا چلا آیا ہے، پیچھے والے جب چیخنے لگے، اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کو اس راہ میں چیخنا ہی پڑا ہے تو عطائیوں نے غدے کو دیکھ کر مریض کے واویلا کو غدے ہی کی طرف منسوب کر دیا۔ سرمایہ اور مال، دولت اور ثروت کے نام سے تبرہ بازیاں شروع ہو گئیں، اسی پر لعنتوں کے تیر، نفرتوں کی گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، ان ہی لعنتوں اور نفرتوں نے کبھی رہبانیت و کلبیت کی شکل اختیار کی، کسی ملک میں مزدکیت کا چولا پہن کر اسی نے سر اٹھایا اور آج وہی اشتراکیت و اشتمالیت اور اسی قبیل مختلف بتوں کے بھیس میں سرمایہ داروں کو دھتکار رہی ہیں، مالداروں کو دھتکار رہی ہیں۔

لیکن انسانیت کی تشخیص و علاج کے لئے جن طبیبوں کو قدرت پیدا کرتی ہے، ان قدرتی اطباء نے سرمایہ کو نہیں بلکہ ان کو (کا جو سرمایہ کو غلط طریقہ سے استعمال کر رہے تھے) ان کو سلجھایا جنھوں نے خود الجھ کر دولت سے کام لینے کے فطری طریقوں کو الجھا دیا تھا۔

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو
اور قسم ہے اس کی جس نے نر و مادہ (مرد و عورت) پیدا کئے۔

قرآن مجید میں ان ہی عجیب و غریب قسموں اور تاریخی انقلابات کے عمیق اشاروں، مردوں اور عورتوں اور باہم ان کے تعلقات سے پیدا ہونے والے نتیجوں کے کنائی ذکر کے بعد

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى۔	تمہاری کوششیں (یعنی سرگرمیاں)
	طرح طرح کی ہیں۔

فرمایا

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۔	پھر جس نے دیا اور ڈرا اور الحسنیٰ
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ	(اچھی باتوں) کی تصدیق کی تو ہم قریب
لِلْيُسْرَىٰ۔	ہے کہ آسان کریں گے اس پر آسانی
	زندگی کو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس سلسلہ میں اب تک کہا گیا ہے یا کہا رہا ہے یا کہا جا سکتا ہے، "الیسریٰ" (آسان زندگی) کی ضمانت لی گئی ہے، ان لوگوں کے لئے عطائی مشوروں سے ہٹ کر قدرتی طبیبوں کے اس علاج کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، چوں کہ قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ کہنا تھا پہلے کہا جا چکا ہے، پڑھنے والوں کو چاہیئے کہ پھر اسی کو میں غور سے پڑھیں، علاج کا یہی لازوال فطری طریقہ ہے۔ فطرت کی راہوں سے ہٹ کر جو ی چلنا چاہے گا، دکھ کے ساتھ اسے واپس ہی ہونا پڑے گا، آج نہیں تو کل اسے پچھتانا ہی ے گا، ایک کانٹا نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے، اگر ایک گھاؤ مکلے گی تو کل کردی بیسیوں ھاؤں کی شکل اختیار کرے گی، عارف رومی نے اپنے تمثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے ئے میں ادا فرمایا ہے، مثنوی میں ہے:

کس بزیر دم خرخارے نہد	خر نداند دفع او برمی جہد
ب آدمی کسی گدھے کی دم کے نیچے کانٹا چبھا دیتا ہے	گدھا کانٹے نکلنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لئے
دتا پھاندتا ہے۔	
می جہاں خار و محکم تر زند	عاقلے باید کہ آں خارش کند
پھاندتا ہے وہ کانٹا اور زیادہ مضبوطی سے چبھتا جاتا ہے	جہاں ضرورت کسی عقل والے کی پڑتی ہے جو اس کانٹے کو اس کے جسم سے نکال دے
خر ز بہر دفع خار از سوز و درد	جفتہ می انداخت صد جا زخم کرد
ھا کانٹے کو نکالنے کے لئے مارے جلن اور درد کے	دولتیاں پر دولتیاں لگا کر سینکڑوں جگہ زخم پیدا کر دیتا ہے

ج دنیا اسی حال میں مبتلا ہے، انسانیت کے جسم میں جو کانٹا چبھ گیا ہے، اس کانٹے کے نکالنے کا طریقہ جن بزرگوں کو معلوم ہے، اللہ کے ان پیغمبروں سے تو بغاوت اختیار کی گئی ہے، اور شش کی جا رہی ہے کہ ان سے بے تعلق رہ کر اس کانٹے کے نکالنے میں کامیابی حاصل ئے گی، لیکن مسکین گدھے کو کون سمجھائے کہ خار برآری کی اس کوشش میں بجائے نکلنے کے اور اندر دھنستا چلا جائے گا، پھر وہ رگڑ جو اس کانٹے کو نکالنے کے لئے گدھا لگائے گا بیسیوں م اپنے اندر پیدا کر لے گا، بقول اکبر مرحوم

جتنا چھوڑ کر جال کے اندر	جال گھسے گا کھال کے اندر

سبی معیشت کی ذمہ داریوں سے انحراف کے وہ نتائج جن کا ظہور علاوہ انفرادی زندگی کے

اسی معیشت اور زندگی میں از روئے قرآن و حدیث اسی دنیا میں ہوتا ہے۔

قدری معیشت اور اس کی ذمہ داریوں سے انحرافات کے نتائج

اب میں چاہتا ہوں کہ قدری معیشت کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کے ان نتائج کی تفصیل کروں جن کا ذکر اسلامی وثائق و نصوص میں کیا گیا ہے، تو بات یہ ہے کہ

من اعرض عن ذکری — جو کترایا میری یاد سے پس اس کے لئے
فان له معیشة ضنکا. — معیشت ہے تنگی اور تنگیوں سے بھری ہوئی

کی قرآنی آیت میں جس جرم کی پاداش میں زندگی کو تنگ و پراگندہ بنا دینے کی دھمکی دی گئی ہے ظاہر ہے کہ جس طرح اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو بسیلی پیمانے پر رزق پاتے ہیں، اسی طرح اس کے دائرے میں وہ بھی شریک ہیں جنہیں قدری پیمانے پر روزی مل رہی ہے کیونکہ متن کا لفظ عام ہے، اور ہر اس شخص کو حاوی ہے جو ذکر اللہ سے ہٹ کر اور کٹ کر جینا چاہتا ہے، الغرض معیشت خواہ بسیلی ہو یا قدری جب معلوم ہو چکا کہ "الرزق" کا بہرحال خاص قسم کی خدائی ذمہ داریوں طالب ہے، تو جو ان ذمہ داریوں کو پوری کرے گا، ان کے نتائج بھی ان کے سامنے آئیں گے اور جو ان سے لاپرواہی اختیار کرے گا، قدرت کے انتقامی خمیازوں سے اپنے آپ کو وہ بچا نہیں سکتا، اسی طرح

ومن یعش عن ذکر الرحمن — اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمن کی یاد
نقیض له شیطانا فهو له قرین. — سے ڈیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے
شیطان کو، پس وہ ہو جاتا ہے اس کا ساتھی۔

کا قانون جیسے بسیلیوں کے لئے ہے اور ذکر الرحمن سے اعراض کی سزا شیطانی تسلط کی شکل میں جیسے انھیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اس جرم کا ارتکاب اگر قدری معیشت والوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے کی مار سے وہ اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں، بلکہ

الشیطان یعدکم الفقر — الشیطان دھمکاتا ہے تمہیں افلاس سے
ویأمرکم بالفحشاء. — اور حکم دیتا ہے بے حیائی کی باتوں کا۔

کی آیت جب میری تلاوت میں گذرتی ہے، تو ذہن میں یہی بات آتی ہے کہ جن بیچاروں کی آمدنی ٹھیک خرچ کے مطابق بالکل اس کے برابر برابر ہوتی ہے، یعنی خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس کچھ پس ماندہ نہیں رہ سکتا، ایسوں کے لئے معیشت کے اسی رنگ کو پیش کر کرکے ہر گذرنے والے دن کو حال سے نکال کر اشیطان آنے والے دن کی ضرورتوں کے اندیشوں کو پیدا کر کرکے ان کے قلبوں کو ہستی اور فردا کی فکر میں ڈال کر "امروز" کی لذتوں کو بھی ان غریبوں کے لئے تلخ بناتا چلا جاتا ہے اور یہی مطلب ہے الشیطان یعدکم الفقر کا (یعنی شیطان تمہیں محتاجی اور ناداری کی دھمکی دیتا رہتا ہے، لیکن بسیلی معیشت رکھنے والوں میں اس خیال سے ڈرانے کی گنجائش چونکہ نہیں پاتا، اس لئے عین

فحش" اور بے حیائیوں پر اشیطان ان لوگوں کو اکساتا رہتا ہے جو بسیلی معیشت رکھتے ہیں،
ہے کہ فقر کی دھمکی تو ان پر کارگر نہ ہوگی، تو آوارگی اور بدچلنی کی راہوں پر ان کو ڈالتا ہے،
م طور پر نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا جو حال ہے کہ اپنی بسیلی معیشت کی ابتلائی ذمہ داری
جب وہ بے پرواہ ہو جاتے ہیں، تو ان کی آمدنیوں کا بڑا مصرف یہی "فحشاء" رہ جاتا ہے۔

بہرحال یہ تو اجمال ہے، قرآن میں اسی اجمال کے جو تفصیلات پائے جاتے ہیں، اب ں ان ہی کو پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان تفصیلات کے ذکر سے پہلے میں پھر اسی مسئلہ پر تنبیہ روری خیال کرتا ہوں جن کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ قدری معیشت والوں کو جن معاشی پریشانیوں میں عام طور پر مبتلا ا جاتا ہے، ان کا ایک حصہ تو وہ ہے، جن کی ذمہ داری بالکلیہ ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو بسیلی یشت رکھتے ہیں، لیکن، اکل لم کے عارضہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے قدریوں کے ان جائز رق کو نہیں ادا کرتے، نہیں ادا کرنا چاہتے، جو دینے والے کی طرف سے ان کے سرمایہ میں قرر کیا گیا ہے۔

اور اکل لم کا استسقائی روگ ہے بھی ایسا ناپاک روگ کہ جن پر اس کا دورہ پڑ جاتا ، وہ صرف یہی نہیں کہ جو آچکا ہے اسی کو پوری طاقت سے اس طور پر پکڑے رہتے ں کہ ایک کھیل بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے منہ میں اڑ کر نہ جانے پائے، بلکہ دوسروں کے کے حقوں کو بھی چھین چھین کر چاہتے ہیں کہ نگلتے چلے جائیں، خود ان ہی کے ملک ان ہی کی م ان ہی لوگوں پر جن میں وہ رہتے سہتے ہیں کچھ بھی گذر جائے۔ لیکن اکل لم کے ان روگیوں کے ان پرجوں بھی نہیں، بلکہ خصوصاً جن ممالک میں آئینی پشت پناہیاں بھی اکل لم کے ان آسیب دوں کو میسر آجاتی ہیں تو پھر ان کے بے پناہ مظالم کا کیا ٹھکانا ہے، آج جن کے تماشے ان ممالک ں نظر آرہے ہیں، جہاں دولت کا طوفان برپا ہے، فی کس "اوسط آمدنی" کی طلسمی تعبیروں کا یہ کھیل یاں ملک کے سادہ لوح عام باشندوں کو خوش کرنے کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ سنایا جاتا ہے ہر تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف پیرایوں میں اعلان کرایا جاتا ہے کہ مثلاً ہمارے ک کی اوسط آمدنی فی کس

"گیارہ سو اسی روپے ہیں"

سط نکالنے کے وقت تو اس آمدنی کو فی کس پر بٹھایا جاتا ہے، لیکن بجائے اوسط کے واقعی جو سا نہیں بلکہ دولت ہے، ثروت ہے، اس کی قسمت کا وقت جب آتا ہے تو اسی گیارہ سو اسی روپے س آمدنی رکھنے والے ملک کے عام باشندوں کے متعلق یہ خبریں بھی معلوم ہوتی رہتی ہیں کہ

"ملک میں بے روزگاروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے"

دوں کی زمین امریکہ کا حال ہے (دیکھو رسالہ جامعہ دہلی اپریل [illegible])

اور خود امریکہ تو ایک بر اعظم ہے، لیکن اسی کے مقابلہ میں دنیا کے آخری کنارے کا وہ جزیرہ بلکہ جزیرچہ جس کے متعلق کہنے والے کہتے ہیں کہ صوبہ بنگال کے کسی بڑے ضلع کے رقبہ سے اس کا رقبہ زیادہ نہیں ہے، لیکن صنعت و حرفت، تجارت، سیاست و حکومت، بنکنگ اور اسی قسم کے جائز و ناجائز ذرائع سے کام لے کر دنیا کے اکثر حصوں کی پیداواروں کے سیلاب کا دہانہ اس وقت تقریباً اسی ملک کی طرف پھیر دیا گیا ہے، یا بقول اسی ملک کے کسی باشندے کے دنیا کی دولت کا اسپنج اس ملک والوں کو مل گیا ہے، بجائے پانی کے اسی اسپنج میں سارے جہان کے کمانے والوں کی کمائیوں کو جذب کر کے لوگ لے جاتے ہیں اور اسی ملک کے دریائے ٹیمز کے کنارے اسے نچوڑ دیتے ہیں، نچوڑنے کا یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں بلکہ صدیوں سے جاری ہے، اسی لئے فی کس کا اوسط یہاں بھی امریکہ کے برابر نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے۔

میرا اشارہ جزیرہ برطانیہ اور اس کے باشندوں کی طرف ہے۔ فی کس اوسط کا حساب اور واقع میں فی کس اس مجموعی سرمایہ سے لوگوں کو کتنا مل رہا ہے جو ہر سال اس میں داخل ہوتا ہے اس سے درحقیقت واقف تو وہی حضرات ہو سکتے ہیں[1] جن کا مشغلہ ہی اعداد و شمار کا یہی قصہ ہے، تاہم مجھ جیسے دور افتادوں کی نظر بھی اس فن کے ماہرین ہی کے بعض بیانات پر کبھی کبھی پڑ جاتی ہے، ان ہی میں سے ایک رپورٹ یہ ہے، یعنی جزیرہ برطانیہ کی آبادی جس زمانے میں بتائی جاتی تھی کہ چار کروڑ تیس لاکھ اور فی کس کے حساب سے اوسط نکالنے والے ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ فی کس اوسط نکالتے تھے، لیکن واقع میں دولت کی تقسیم اس ملک میں جس طریقہ سے ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء کی مردم شماری میں چار کروڑ تیس لاکھ کے باشندوں کے اس ملک میں ان لوگوں کی تعداد جو اپنی آمدنی کے اعتبار سے لیز (لکھ پتی) کہلاتے تھے، کروڑ لاکھ بلکہ ہزار بھی نہیں صرف پانسو تینتالیس تھی (المقتطف مصر نومبر ۱۹۲۳ء)

---

[1] دولت کی تقسیم "اکل لم" کے اس استثنائی دور میں اعتدال کے نقطہ سے بتدریج خفی طور پر ادھر یا ادھر دور ہٹتے ہوئے کہاں تک پہنچ جاتی ہے عوام تو عوام خواص کو بھی اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک خوفناک انقلاب کی شکلوں میں سامنے نہیں آ جاتے۔ ڈاکٹر ایف، ڈبلیو، ٹاسگ پی ایچ ڈی، ایل ایل ڈی وغیرہ جن کی کتاب اصول معاشیات کا ترجمہ دار الترجمہ سے شائع ہو چکا ہے، وہی لکھتے ہیں کہ عوام معلومات کس حد تک [illegible]

سب آپ نے کیا مطلب؟ انگلستان میں ہر سال آمدنی کی ان ان گنت راہوں سے انسانوں کا [illegible]یا ہوا روپیہ جو داخل ہوتا ہے، اس روپے میں سے تقریباً چودہ آنے "اکل لم" کے زور سے کل ان ہی [illegible] ساڑھے پانچ سو آبادکاروں کی جیب میں گھوم گھوم کر رہ جاتے ہیں، ان کی جیبوں سے چونے اور [illegible]کے لئے یہ ملک سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے بچوں، بچوں کے بچوں، پوتوں، پڑپوتوں کے ساتھ پھر [illegible]ہی کی جیبوں میں جا کر دفن ہو جاتے ہیں، یہی چکر ہے، صدہا سال سے اس ملک میں جس کے اندر [illegible]س کی دولت گھوم رہی ہے، باقی ملک کی عام آبادی پر وہی فی کس والا اوسط جس طریقہ سے تقسیم [illegible]ہے، اس کا اندازہ بھی آپ کو اسی ملک کی معاشی روئدادوں سے ہو سکتا ہے۔ جنگ عظیم اول سے [illegible] جب ہر طرف امن و امان ہی کا دور دورہ تھا، آمدنی ہی آمدنی تھی۔ آگ اور سمندر نے اس ملک [illegible]ہنے والوں اور ان کی کمائیوں کو نگلنے کے لئے اپنا منہ نہیں کھولا تھا، اس وقت کا حال چھپا ہے [illegible]ل نے اخبار میں یہ چھپوایا تھا،

> "آج ہمارے ملک انگلستان کی یہ حالت ہے کہ ہر تیس آدمیوں میں ایک آدمی
> ایسا مفلوک ہے جو اپنی قوت بازو سے اپنی گذر بسر نہیں کر سکتا۔"

[illegible] کیا تا ہے اور کہتے ہیں، بدبخت ہندوستان اس عارضہ میں بدنام تھا لیکن بدنام کرنے [illegible]ن کی نیک نامیاں کیا اس سے کم ہیں۔ اور یہ حال تو جنگ عظیم اول سے پہلے تھا۔ جنگ کے بعد ۱۹۲۳ء [illegible]کنے والوں نے اپنی کیفیتوں کو ان الفاظ میں مشتہر کیا تھا،

> "آخری مردم شماری کے اعداد کے لحاظ سے ہمارے ملک انگلستان میں ایک کروڑ
> (یعنی تقریباً چوتھائی آبادی) ایسی ہے جو ناداری میں بسر کر رہی ہے، اور
> دوسرے ایک کروڑ کی تعداد ایسی ہے جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں اپنی زندگی
> کے دن کاٹ رہی ہے جو آرام و آسائش کے نام سے بھی واقف نہیں اور
> جس کی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم ہی ہونے کو آمادہ ہے۔"

[illegible]ں کے عوام پر خود عوام کی حکومت ہے، جمہوریت کا سبق جو ملک سارے جہان کو پڑھاتا پھرتا اور [illegible] اس کے برکات بانٹتا پھرتا ہے، اس کی نصف آبادی سسکتی ہوئی زندگی جو ہر لمحہ گویا ختم [illegible]ہونے کو آمادہ ہے" گذار رہی تھی، اس کے نتیجہ کا آخری فقرہ یہ تھا

> "یعنی ہر چار آدمیوں میں ایک آدمی ایسی حالت میں گذار رہا ہے جس میں کوئی
> کاشتکار اپنے مویشی کو بھی رکھنا گوارا نہ کرے گا۔"

[illegible]۱۹۲۳ء اخبار [illegible] میں انگلستان ہی کے مختلف اخباروں سے یہ معلومات فراہم کر کے اس وقت [illegible]کئے گئے تھے، جب تک باہر کے دشمنوں نے اس جزیرے کے باشندوں پر بم برسائے تھے، نہ [illegible] گھروں کو کھنڈر بنا کر خندقوں میں شب باشی پر مجبور کیا تھا، اب اس وقت بھی ہر چار [illegible]میں خود ان ہی کا بیان ہے،

"ہم میں ایک آدمی کا حال ایسا ہے کہ گویا کوئی دھوبی اپنے گدھے کو، کوئی تیلی
اپنے کولھو کے بیل کو بھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا؟"

چار کروڑ انسانوں میں پانچ ساڑھے پانچ سو انسانوں کا لاکھ پتی ہونا اور اس کے بعد اسی چار کروڑ کی تہائی آبادی میں ہر چار میں سے ایک کو مویشیوں، گائے بیلوں، بھیڑوں اور بکریوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر کس نے مجبور کیا تھا؟ یا باہر کے بمب، انگنوں، اور آتش باروں نے؟ یا اندر کے پانچ سو، ساڑھے پانچ سو لکھ پتیوں کے اکل لم نے؟ کتنا دلچسپ ہے فی کس کے اوسط کا یہ افسانہ جسے سُنا سُنا کر غریب ہندوستان ہمیشہ اپنے لیڈروں کی زبانوں سے دھتکارا گیا اور دور دور کیا گیا ہے۔

یاد ہوگا ہے ان ہی دنوں میں عوام کے مطالبوں سے مجبور ہو کر انگلستان کی حکومت نے بھی اپنے بجٹ اس سال میں ایک حد تک "الفقراء والمساکین" کے حقوق کا جب اعتراف کیا، غریبوں کو کچھ امداد شاہی بھیجے، یا سرمایہ داری کے خزانے سے ملنے لگی تو فقرہ دو خبر ہونٹوں کو دیکھ کر کسی نامہ نگار نے لکھا،

"آپ کے ملک میں افسوس کی وہ حالت نہیں ہے"

ڈیلی ہیرالڈ نے جہاں ہی فقرہ دو خبروں کا اظہار ہے، اس اعلان کی اشاعت پر بھی کر لکھا تھا،

"ہم دریافت کرتے ہیں کہ نامہ نگار کو کتنے گھروں کے اندر جانے کا اتفاق
ہوا ہے، اسے کچھ بھی اندازہ ہے کہ اب بھی (تقسیم خیرات کے بعد بھی) کتنے
گھرانے ایسے ہیں جن کا گذر زیادہ تر محض روٹی اور چائے پر ہے،
بجائے مکھن کے جو چربی پر بسر کرتے ہیں، جنھیں گوشت اور سبزی (ترکاری
آلو) کے کبھی دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔"

ڈیلی ہیرالڈ کا یہ بیان اس وقت کا نہیں ہے جب انگلستان میں راشن بندی کا نفاذ ہو چکا تھا جنگ عظیم ثانی سے پہلے کا یہ قصہ ہارنے والے جرمنی کا نہیں جیتنے والے، بلکہ مقبوضات بڑھانے والے انگلستان کا ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جیسے پانچ کم اس قسم کے چند بھیوں کی اوسط آمدنی رکھنے والے ہندوستان کو کس بنیاد پر فرماتے، اور آن دہاتے تھے، جھونپڑوں والا ہندوستان سن کے کیسل اور پیلس والے انگلستان کا حال ایک

"شہر گلاسگو میں چودہ ہزار مکانات ایسے ہیں جو صرف ایک کوٹھڑی پر شامل
ہیں، اور ہر کوٹھڑی میں چار چار یا پانچ چھ آدمی رہتے ہیں، بیس ہزار
مکانات دو دو کوٹھڑیوں پر شامل ہیں، اور ان میں سات سے بارہ تک
گذر کرتے ہیں۔"

یہ بیان دیا تھا، جناب مسٹر لائڈ جارج صاحب سابق وزیر اعظم دولت انگلشیہ آکسفورڈ میں ... کہ اس لئے یہ اعداد و شمار فراہم کئے تھے کہ ووٹوں کی تعداد میں اضافہ ان ہی اعداد کے پیش کرنے ہی سے ہو سکتا تھا اور گلاسگو تو بہر حال گلاسگو ہے، بلاد دنیا کی ملکہ لندن ہی کا حال جب

تھا، مسٹر لائڈ جارج ہی کا بیان۔

"اس شہر لندن کی کل آبادی کا ½ ڈربوں جیسے مکانوں میں بسر کرتی ہے۔"

پھر لندن اور لندن والے جن ملکوں اور جن شہروں پر حکومت کرتے ہیں، اگر وہاں کے باشندوں کو رہنے کے لئے مرغی کے یہ ڈربے بھی نصیب نہ ہوں تو لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہے!

ان ہی دنوں میں جب یہ خبریں ایک کالم میں شائع ہوتی تھیں تو دوسرے کالموں میں اس قسم کی خبروں کی بھی کبھی کمی محسوس نہیں کی گئی ہے۔ اور آج بھی یہ دونوں سلسلے ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے جاری و ساری ہیں، مثلاً انگلستان ہی کے متعلق

"چار ارب چوہتر کروڑ روپے کی صرف شراب لنڈھا دی گئی" (۲۷ فروری)

اور امریکہ کے متعلق

"عورتوں نے اپنے چہروں (صرف چہروں) کی آرائش کے لئے غازہ پوڈر
وغیرہ پر چھتیس کروڑ روپوں سے زائد خرچ کئے (ویسٹ منسٹر گزٹ
۱۲۔ مارچ ۱۹۲۶ء)"

اور یہ ہیں

تاکلون التراث اکلا لما   کھا رہے ہو (اوروں کی سرمایہ کی
اکل لم کے ساتھ۔)

یہی وہ زندہ تفسیریں جن کی بدولت چار کروڑ کی آبادی میں سے دو کروڑ انسانوں کو تو سسکتے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے مویشیوں کے مانند مرغیوں کے ڈربوں میں پایا گیا، لیکن اسی ملک میں لنڈھانے والے چوہتر کروڑ ہی نہیں، بلکہ چوہتر کروڑ چار ارب کی سالانہ شرابیں بھی لنڈھا رہے ہیں۔ اشراف اللہ رے "اکل لم" کا زور کہ رخساروں پر چھتیس چھتیس کروڑ کی دولت مل مل کر مسل دی جائے، لیکن لاکھوں اور کروڑوں باشندوں کے بھوکے پیٹ اور ننگے اجسام کے لئے ان کے پاس کچھ نہ ہو، اور اس پر بھی دنیا کے کان کو اس قسم کے دعووں مسلسل دھوؤں سے بہرا بنایا جا رہا ہو کہ اختماس سے چھین کر ملک کے عام باشندوں تک دولت اور حکومت کے پہنچانے کا اقدام ہی نے پیش قدمی کی ہے، ورنہ اس سے پہلے جہاں بھی گذرے جو بھی گذرے، چور تھے ڈاکہ مارتے، اپنے اور اپنے بال بچوں کے سوا ان کے خزانوں میں ملک کے عام باشندوں کے لئے کچھ نہ تھا، دنیا ہی انصاف کر سکتی ہے کہ جس ملک میں ایک طرف تو یہ حال ہے کہ پینے والوں نے سال بھر میں چار چار ارب اور چوہتر چوہتر کروڑ روپے کی شراب لنڈھا ڈالی ہو، لیکن اسی ملک میں شراب ہی کے متعلق خریدوں کے ایسے طبقات بھی پائے جاتے ہیں، وہی ۱۹۲۶ء جس میں شراب کا بجٹ کے یہ اعداد ہیں، اسی سنہ جس میں ڈیلی میل اخبار نے یہ خبر بھی شائع کی تھی،

"گلاسگو میں وہسکی کے تین شیشے اتفاقاً شراب کی لاری سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے"

سڑک پر شراب بہنے لگی، ہزاروں کے اوپر عوام کا ہجوم تھا جو صراحیاں اور بوتلیں
لے ٹوٹ پڑا، اور بعض ترسی ہوئی روحوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ سڑک پر
اوندھے لیٹ کر نالی میں بہتی ہوئی شراب کو پینا شروع کیا اور بعضوں
نے اس میں کپڑے ڈبو ڈبو کر پھر انہیں برتنوں میں نچوڑ لیا (ماخوذ
از نگار ۳۰ مئی ۱۹۲۶ء)

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ داری کا جو ظالمانہ نظام آج یورپ و امریکہ میں قائم ہے، اسی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ممالک میں سفلی معیشت رکھنے والوں نے قدرتی رزق والوں کو محرومی و مفلسی کے کس آخری نقطہ تک پہنچا دیا ہے، گندی نالیوں میں بہنے والی شراب جس کے پینے پر شاید کتا بھی بآسانی تیار نہیں ہو سکتا، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے غریب افراد کتنی مسرت کے ساتھ اس نعمت غیر مترقبہ کو اوندھے ہو ہو کر نالیوں میں منہ ڈالے اسی کو پی رہے تھے!

اسی لئے قدرتی معیشت کی وہ دردناک حالت جو سفلی معیشت والوں کے "اٹکل آمیز" انجام خودخواری و خودفروشی کے جذبات کے تسلط کا نتیجہ ہے، اس کی اصلاح و تصحیح کے قصہ کو تو اسی قدرت کے حوالہ کرنا چاہئے جس نے ان ظالمانہ چیرہ دستیوں کے چنگلوں سے نجات دے کر تاریخ کے موجودہ دور تک نسل انسانی کو پہنچایا ہے، قرآن کا وہی خدا جس نے اپنے متعلق

ان ربک لبالمرصاد   تیرا رب گھات میں ہے۔

کا اعلان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ قدرت کی مخفی نگرانی اندازہ کرتی رہتی ہے، تاآنکہ

فاکثروا فیہا الفساد   جب بگاڑ اور فساد کو بڑھا دیتے ہیں

(سدھار اور اصلاح پر)

کے درجہ تک ظلم و تعدی کا پارہ چڑھ کر جب پہنچ جاتا ہے تو معاً اسی کے ساتھ

فصب علیہم ربک سوط عذاب   بس برسا دیتا ہے ان پر تیرا رب عذاب کا کوڑا۔

کا تجربہ کرۂ زمین کے باشندوں کو ہمیشہ کرنا پڑا ہے، وہ آج بھی "معاشی توازن" کے جس قدر ناہمواری کے جن حدود تک پہنچا دیا گیا ہے، مرصاد (گھات) والے رب کے سوط عذاب (تازیانۂ عذاب) کا لوگوں انتظار کرنا چاہئے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید قدرت کی اس مخفی بے آواز والی لاٹھی کی مار کے، آثار کا ظہور شروع ہو چکا ہے، آخر قرآن ہی میں یہ جو فرمایا گیا ہے یعنی

وذرنی والمکذبین اولی النعمۃ   چھوڑ دیجئے اور ان جھٹلانے والوں کو
ومہلہم قلیلا ان لدینا   جو نعمت والے ہیں اور مہلت دو ان کو
انکالا وجحیما وطعاما   تھوڑی، قطعاً ہمارے پاس ہیں بیڑیاں

ذا غصۃ وعذابا الیما   اور آگ کا ڈھیر اور کھانا ایسا جو گلے میں
اٹک جائے اور دکھ بھرا عذاب۔

ختم کیجئے یا "سرمایہ" اسی کو پالنے کے بعد اپنی متعلقہ ذمہ داریوں کو جنھوں نے جھٹلایا تھا، کچھ دن کی ڈھیل کے میدان ہی کے مقدم میں آج "اشتراکیت" و "اشتمالیت" اور اسی قسم کے مختلف نقشے جو اسکے نظر آ رہے ہیں، ایسے نقشے جنھیں نگلنے والے نگل سکتے ہیں نہ اگلنے والے اگل سکتے ہیں، سرمایہ و محنت، مزدوری اور اسی قسم کے دوسرے معاشی مسائل کچھ ایسی بھیانک شکلوں میں جو دانت دکھا رہے ہیں کہ موجودہ عہد کا ہر صاحب نعمت اپنی اپنی منقولہ یا اپنے اپنے سرمایہ کے حساب سے بدخوابیوں میں مبتلا ہے، کیا ان کو دیکھ کر بھی اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ مرصاد والے رب کا سوط عذاب اور غیبی کوڑا "غیب" سے نکل کر شہادت میں رہنے والوں کی پیٹھوں پر نہیں برسنے لگا ہے؟

اشتراکیت معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے

بہرحال قدرتی معیشت کا یہ پہلو زبردستوں کی زبردستیوں کا چونکہ نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے ان زبردستوں کا مقابلہ تو وہی کر سکتا ہے جس کا ہاتھ سب سے اونچا ہے اور آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے زیردستوں کو زبردستوں پر چڑھاتا رہا ہے، بڑے بڑے گرگوں کو لنگڑیوں سے دیکھا گیا ہے کہ اس نے چھوڑ دیا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ توڑ پھوڑ کے اس سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے، پھر جب آغاز ہو چکا ہے تو کسی نہ کسی حال اس آغاز کا انجام پہنچ جانا ہی رہے گا، غلطی میں مبتلا ہونے والوں کو غلطی جو کچھ بھی لگ رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "انتقام" کو وہ واقعی انسان کا کوئی "معاشی نظام" سمجھ رہے ہیں، لیکن واقعات خود اس کی شہادت پیش کرتے چلے جائیں گے کہ انتقام صرف انتقام تھا اور دنیا کا کوئی واقعی نظام نہ تھا، اور نہ ہو سکتا ہے، انتقام کے دن جب پورے ہو جائیں گے، تب بنی آدم کی معیشت کا جو فطری نظام ہے وہ خود بخود قائم ہو جائے گا یہی ہوتا رہا ہے اور دنیا کی عمر کی مدت اگر ابھی کچھ باقی ہے تو اللہ کی اسی سنت کا ظہور یقیناً ہو کر رہے گا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

بس قدرتی معیشت کے اس پہلو کو چھوڑ کر میں اسی معیشت کی صرف اس شکل سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بنی آدم کے صفات و کمالات کے فطری تفاوت کا لازمی نتیجہ ہے، اور قرآن میں جیسا کہ بار بار گزر چکا

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء   اللہ ہی کشادہ کرتا ہے جس پر چاہتا ہے
ویقدر   روزی کو اور وہی تنگ کر دیتا ہے
جس کی روزی کو چاہتا ہے۔

کے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ انسانی اعمال کی مصنوعی کوششوں کا نہیں بلکہ معاشی مدارج و مراتب کا یہ اختلاف حق تعالیٰ کی قدرت قاہرہ اور ارادہ باہرہ کا پیدا کیا ہوا قصداً و ارادۃً پیدا کیا ہوا ہے

جس کے ختم کرنے کی کوشش میں کامیابی اسی وقت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسانوں کے پیدا کرنے کا اختیار خود ہم انسانوں ہی کو مل جائے اور اس کے بعد آئندہ جتنے بچے بھی پیدا کئے جائیں وہ اپنے تمام اندرونی و بیرونی صفات کے لحاظ سے برابر کر کے پیدا کئے جائیں، لیکن جب تک مختلف صلاحیتوں اور مناسبتوں کو لے کر لوگوں کے پیدا ہونے کا یہ سلسلہ جاری ہے، معاشی طبقات کے تفاوت کے اس سلسلہ کو بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ بہرحال معیشت کی اس قدرتی کیفیت میں زندگی گزارنے کے قرآن میں جو چند گر بتائے گئے تھے ان کا ذکر تو گزر چکا، اب دیکھئے کہ ان قرآنی ہدایات کو ٹھکرانے والوں کو جو ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں، وہ کیا ہیں، ٹھیک بسطی معیشت کی ذمہ داری سے لاپروائی برتنے والوں کے متعلق قرآن میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے پیچھے شیطان لگا دیا جاتا ہے اور وہی شیطان آدمی کے نیک احساسات کو زیر و زبر کر کے بالآخر معیشت ضنک اور تنگ زندگی انہیں شکار بنا دیتا ہے، یقین کیجئے کہ یہی حال ان لوگوں پر بھی طاری ہوتا ہے اور اسی کو طاری ہونا چاہئے جو قدری معیشت میں مبتلا ہونے کے بعد ان ہدایتوں سے استفادہ نہیں کرتے جس کی طرف رزق کے اس خاص حال میں راہنمائی کی گئی ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ

من اعرض عن ذکری — جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً اس کے لئے ہی

فان له معیشة ضنکا — معیشت و زندگی ہے تنگ اور تنگی سے بھری ہوئی

۱؎ بلکہ نیز کسی بعد جیسے کہ جیسے معاشی مراتب یا درجے کے اختلافات کا قصہ امانات وغیرہ میں ختم شدہ جدوجہدی نوع انسانی میں پیچھا چھڑا نیز کسی کوشش، تقریر و تحریر یا تحریک و انقلاب کے ختم ہو جائے گا، اب میں لوگوں کو کیا کہوں، اخباروں میں روز پڑھتے ہیں، اس قسم کی خبریں روز پڑھتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ ڈاکٹر راجے نے بنگلور میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

علی پور کلکتہ کی عدالتوں کا حال کیا بتاؤں، اس وقت تو سو پچاس وکیل وکالت کرتے ہیں جن میں صرف دس فیصدی ایسے ہیں جن کی آمدنی اوسط درجہ کی ہے اور باقی یا ان میں وکلاء کی آمدنی کا اوسط ماہوار سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں، اور نہ معلوم کتنے وکلاء وکالت کی ڈگریاں رکھنے والے ایسے ہیں جو ایک ایک دانہ کو ترستے ہیں۔ (ریکارڈ ۲۰۔۱۰۔ [illegible])

یہ اس زمانہ کی صورت حال ہے جب کہ علی پور ہی کلکتہ اسی بنگال میں ہی تھا، ورنہ جیسے وکلاء کی اوسط آمدنی اس ملک کی راست جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، تقریباً پچاس پچاس ہزار روپے تک پہنچ جاتی تھی۔

وکالت ظاہر ہے کہ ایک آزاد پیشہ ہے، اس میں محروم رکھنے اور پیچھے ڈھکیلنے کا الزام انگریزی بالادستی پر بھی تو نہیں لگایا جا سکتا، بلکہ جمہوریت آزادی کا یہ حال ہے، امرا ایک ہی جگہ ایک ہی ہوتے ہیں جو وکالت اور قانون کی سند رکھتے ہیں، ان قدرتی صلاحیتوں کی کمی بیشی کے سوا آمدنی کے اس عظیم تفاوت کی توجیہ اور کیا ہو سکتی ہے جو باہم فطری طور پر افراد انسانی میں پائی جاتی ہیں اور بالآخر ان صلاحیتوں ہی کے تفاوت کا نتیجہ معاشی فرق مراتب کے نتائج کی شکل میں رونما ہو سکتا ہے ۱۲

اور

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض له — اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمٰن کی یاد سے

شیطانا فهو له قرین۔ — پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو

پس ہو جاتا ہے وہ اس کا ساتھی۔

جیسا کہ بتا چکا ہوں، دونوں میں مَن (جو) کا لفظ عام ہے، جیسے بسطی معیشت والوں کو حاوی ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی یہی قاعدے منطبق ہوں گے جو اپنی قدری معیشت میں خدائی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر زندگی گزارتے ہیں، باقی احساسات کے بگاڑنے کا یہ سلسلہ شیطان کس طرح شروع کرتا ہے، جہاں تک قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے ابتدا اس کی اس کیفیت سے ہوتی ہے جسے سورۃ الفجر کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی

واما الانسان اذا ما ابتلاہ — اور انسان کو جب جانچتا ہے اس کو

ربہ فقدر علیه رزقه — اس کا مالک یعنی تنگی کر دیتا ہے اس پر

فیقول ربی اهانن۔ — اس کی روزی کو تو کہتا ہے وہ کہ میرے

مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی قدری زندگی کے متعلق بجائے یہ خیال کرنے کے کہ یہ بھی ابتلائی اور امتحانی زندگی ہی کی ایک شکل ہے، اور جو ذمہ داریاں ایسی حالت میں آدمی کے سپرد کی گئی ہیں، ان کی تکمیل کی کوشش کرے، وہ یہ غلط خیال اپنے اندر قائم کر لیتا ہے کہ میرے پیدا کرنے والے نے قدری معیشت کی اس حالت میں مجھے مبتلا کر کے ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اپنی قدری زندگی کے متعلق اہانت کا یہی خیال یقین کیجئے کہ شیطان کا وہ پہلا عمل ہے جسے مسلط ہونے کے بعد اپنے معمول پر وہ شروع کر دیتا ہے۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے عام حالات میں اگر غور کیا جائے تو غربت کی زندگی یعنی قرآن کی اصطلاح میں جس کا قدری معیشت نام ہے، یہ خیال کرنا کہ میری رسوائی اور ذلت کی وجہ بنی ہوئی ہے، واقعہ سے بہت کم تعلق رکھتا ہے۔ آخر ہم میں ہر ایک کو سوچنا چاہئے کہ اس کے سامنے ہر وقت ہر گلی کوچہ میں لاکھوں لاکھ تعداد میں غریب مرد و عورت جو گزرتے رہتے ہیں کیا محض اس لئے کہ وہ بیچارے غریب ہیں یعنی ان کی آمدنی ان کی حاجت و ضرورت کے مطابق نہیں ہے، صرف اس لئے کون کس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہاں حال تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات ہی میں مستغرق رہتا ہے، دوسروں کے سوچنے کا موقع ہی کسی کو کب ملتا ہے، اور اگر کسی کے حال کی طرف کسی وجہ سے توجہ بھی ہوتی ہے تو جہاں تک میں جانتا ہوں کسی کی قدری معیشت کا حال سن کر لوگ جو ترحم کھاتے ہیں، ان کے ذلیل و خوار ہونے کا خیال بھی کسی کو نہیں گزرتا۔ آخر غربت و فلاکت کی وجہ سے آدمی کا دوسروں کی نگاہوں میں رسوا اور ذلیل ہونا اگر ضروری ہوتا، تو آج دنیا کے بڑے بڑے

مذہبی پیشواؤں، یا علمی حلقوں کی سربراہ اور وہ ہستیاں جن میں عموماً فقری معیشت رکھنے والوں ہی کی اکثریت ہے، ان کی عظمت و احترام سے لوگوں کے قلوب کیوں معمور ہوتے۔

اور بعض دماغوں میں غریبوں کے متعلق اگر اس قسم کا کوئی گندہ خیال پایا بھی جاتا ہے تو خود غریبوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، کسی پاکباز عفت مآب خاتون کو کوئی بد نظر خبیث الفطرت آدمی اگر بری نگاہوں سے دیکھتا ہے تو یہ گندگی دیکھنے والے کی ہے یا اس عفیفہ خاتون کی جسے بری نگاہ سے دیکھا گیا، سعدی کا مشہور فقرہ

"الحمد للہ کہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے"

اس میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ افلاس و غربت اگر کوئی مصیبت بھی ہے، تو وہ صرف مصیبت ہے، کوئی معصیت یا کردار کی خرابی تو نہیں ہے، جس کی وجہ سے آدمی ذلیل خیال کیا جائے واقعہ تو یہی ہے کہ غریب آدمی کو ذلیل خیال کرنے والا در اصل خود ذلیل ہوتا ہے جس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ غریبوں کو ذلیل خیال کرنے والے علانیہ اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کر سکتے، اسی لئے نہیں کر سکتے اور نہیں کرتے کہ وہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ میرے اس خیال کو جو بھی سنے گا، بجائے غریبوں کے مجھ کو وہ ذلیل خیال کرے گا۔

پس حقیقت تو جو کچھ ہے وہ یہی ہے۔ . لیکن فقری معیشت کی ذمہ داریوں سے جو صرف ہو کر زندگی گذارتے ہیں، دیکھا یہی جاتا ہے کہ خواہ انہیں کوئی ذلیل خیال کرے یا نہ کرے لیکن وہ جو بیٹھ گئے اسی احساس اور خیال میں گھلتے رہتے ہیں کہ میں اولاد آدم کا ایک ذلیل ترین فرد ہوں، وہ بیچارا تو یہ خیال کرتا ہے کہ میرا یہ احساس خود میری طبیعت کا احساس ہے اور ایک واقعہ کا احساس ہے، لیکن اب اس مسکین کو یہ کون بتائے کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے، اور جو واقعہ نہیں ہے بلا وجہ واقعہ کا رنگ دے کر اس کے سامنے وہ پیش کر رہا ہے اور شیطان کا سب سے بڑا کرتب یہی تسویل و تزویر ہے۔ اور بات اسی نقطہ پر کب ختم ہوتی ہے، عزت و ذلت بلندی و پستی کا سارا معیار جن کے سامنے صرف روپیہ رہ گیا ہو، ایسا "دل" اگر ہر چیز سے الگ ہو کر صرف عزت و جلال کے اسی معیار روپیہ کے عشق میں ڈوب جائے تو جس غلط خیال کا وہ شکار ہو گیا ہے، اس کا تو یہ ایک لازمی نتیجہ ہے، بسطی و فقری معیشت دونوں کو ابتلائی حالات قرار دیتے ہوئے سورۃ الفجر کی آیتوں کے بعد آخر میں دو فقرے جو پائے جاتے ہیں جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، یعنی

وتاكلون التراث اكلا لما — اور کھاتے ہو ترکہ کو اکل لم کے ساتھ اور
وتحبون المال حبا جما — چاہتے ہو مال کو حب جم کے ساتھ۔

میں پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ جیسے پہلے فقرے یعنی تاکلون التراث اکلا لما کا تعلق بسطیوں سے ہے اسی طرح اگر دوسرا فقرہ یعنی وتحبون المال حبا جما (اور چاہتے ہو مال کو حب جم کے ساتھ) کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کا تعلق فقیروں سے ہے تو جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نظریہ ابتلائیت کے انکار کے بعد جیسے بسطیوں کا گروہ یا لینے کے بعد [illegible]تا ہے کہ مال و دولت کے جس حصہ پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا ہے، وہ اس کے اور اس کی نسلی دائرہ [illegible] باہر نکلنے نہ پائے، قرآن نے جس کی تعبیر "تاکلون التراث اکلا لما" کی ہے، اسی طرح جو لوگ بسط [illegible] اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں یعنی فقری رزق پاتے ہیں، ضروریات حیات میں صرف ہو جانے [illegible] بعد جو سرمایہ کے کسی جز کو پس انداز نہیں کر سکتے۔ ان کا مال و دولت سے وہی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، جو درد فراق، غم ہجر میں مبتلا ہونے والے عاشق مہجور مسکین کا اپنے بچھڑے ہوئے معشوق سے [illegible]تا ہے، ایام ہجر میں عشق کا جذبہ جیسے عاشق مہجور کو ہر چیز سے توڑ کر صرف

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

[illegible] شغلہ میں غرق کر دیتا ہے۔ چونکہ "حب جم" کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی ہر چیز سے الگ ہو کر کسی شے کے ساتھ [illegible]نا یہی اس کے لغوی معنی ہیں، عربی محاورہ ہے کہ ہر طرف سے سمٹ کر جب پانی کسی گڑھے میں [illegible]ع ہو جاتا ہے، جم الماء یا تالاب وغیرہ کے کسی ایسے حصہ میں جو سب سے زیادہ گہرا ہو اور اسی [illegible] تالاب کا سارا پانی آخر میں جمع ہو جاتا ہو تو اس کو جمۃ الماء اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ پس قرآن کی [illegible]یان کردہ کیفیت کہ "چاہتے ہو تم مال کو حب جم کی چاہ کے ساتھ" جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وہی [illegible] [illegible] جس میں عموماً فقری معیشت رکھنے والے اس وقت مبتلا ہو جاتے ہیں جب بجائے امتحان و ابتلاء کے [illegible]ہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دارومدار روپیہ ہی پر ہے، وہی با عزت ہے جو [illegible]پیہ والا ہے، اور بے عزت وہی ہے جو روپیہ سے خالی ہو، مشہور فارسی شعر

[illegible]ترک باش وخوش باش و دیا سگ مردار باش — ہمہ با شخی باطل، لیکن اندکے زردار باش

[illegible]ی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم اور ملک پر مسلط ہو جاتی ہے تو "اندکے زردار باش" کے مشورے کی تعمیل کا [illegible] شوق جن لوگوں کو نہیں ملتا وہ قدرتی طور پر ہر چیز سے الگ ہو کر اسی "زردار باشی" کو وہ اپنے وجود کا آخری نصب العین بنا لیتے ہیں، بے شک آج موجودہ مغربی تمدن نے جس حال کو دنیا میں پیدا کیا ہے ایسا حال کہ شاید تاریخ میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے، کیونکہ عشق مال و سرمایہ اگرچہ کوئی نیا حادثہ نہیں ہے، فقری معیشت کو جس زمانہ میں بھی محسوس کرنے والوں نے اپنی اہانت کا ذریعہ محسوس کیا ہے۔ قدرتاً اس عشق کی آگ ان کو اپنے قلوب میں سلگانی اور بھڑکانی پڑی ہے، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں دل کے اس کیفیت کے اظہار کی عموماً لوگوں کو جرات نہیں ہوتی تھی، یا ہوتی بھی تھی تو کچھ چھپے دبے لفظوں میں ہوتی تھی، آدمی صرف مال اندوزی یا زر آفرینی کا آلہ ہے اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسی کی تعبیر آج کرنے والے ان الفاظ میں جو کر رہے ہیں کہ آدمی صرف پیٹ ہے یا فقط روٹی ہے، پیٹ ہی کے لئے وہ جیتا ہے اور پیٹ ہی کے لئے مرتا ہے، روٹی ہی کے لئے قدرت نے انسانی نسل کو پیدا کیا ہے، اسی کا حاصل کرنا اور اسی [illegible]صل کرتے ہوئے اپنی آخری سانس پوری کر لی، یہی فقط یہی اس کے وجود کا سب سے بڑا نصب العین ہے

جن بلند آہنگیوں کے ساتھ بغیر کسی شرم و حیا کے آج یہ سب کچھ بیانگِ دہل نہ سہی بر بانگِ ریڈیو ہی سہی کہا
جو کیا جا رہا ہے، ترنموں میں، تحریروں میں چیخنے والے صرف ان ہی آوازوں کے ساتھ جو چیخ رہے
ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر جو چلا رہے ہیں، انسانیت کی تاریخ کا کوئی مورخ کسی قوم کسی ملک کے کسی
دور کا مورخ کیا بتا سکتا ہے کہ زمین کے کرہ پر بنی آدم کے گھرانوں میں اتنی ڈھٹائیوں اور انتہائی
بے حیائیوں کے ساتھ کانوں کو کبھی پہلے بھی سننے والوں نے یہ سنا تھا یا زبانوں پر اس قسم
کے الفاظ آئے تھے شاید یہ قرآنی الفاظ

تحبون المال حبا جما — اور چاہتے ہو مال کو تم جم کے ساتھ

کی حقانیت تفسیر ہے، اسی لئے ان حالات میں جو کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی تھی زبانوں سے
بھی اس کا اقرار کرا دیا گیا، اور اس طور پر اقرار کرا دیا گیا کہ آج ان الفاظ کے انکار کرنے والوں کو
ہی مطعون ٹھیرایا جا رہا ہے، وہی دھتکارے اور دھتکارے جا رہے ہیں، جو انسان جیسی بلند
ہستی کو اتنا پست قرار دینے سے جھجک رہے ہیں۔

بہرحال انسانیت کی بلندی و پستی کا یہ قصہ بجائے خود ایک الگ قصہ ہے، جو چونکہ دوسروں
خرس (ریچھ) یا سگِ مردار بنا کر نہیں پیدا کیا گیا ہے، اسی کو انہی چرندوں یا درندوں کے مطابق
اتارنے کی کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے یہ بحث نہیں ہے
میرے پیش نظر اس وقت جو کچھ بھی ہے، وہ صرف یہی ہے کہ قرآن کے نظریۂ ابتلاء کا انکار کیجئے یا
خدا کی ذمہ داریوں سے انکار کیجئے، اس انکار کے بعد انسانی احساسات میں قدری معیشت کے متعلق
جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، قرآن کی روشنی میں اسے ان لوگوں کے آگے رکھ دوں جو قرآن کو
سمجھنا اور سمجھ کر اسی کی روشنی میں چلنا چاہتے ہیں، آپ نے دیکھ لیا کہ پہلا اثر انسانی فہم پر
اس سلسلہ میں جو پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ قدری معیشت کو لوگ اپنی اہانت و ذلت کا ذریعہ یقین کرنے
لگتے ہیں، اس کے بعد قدرتاً خواری و ذلت کی اس حالت سے نکلنے کے لئے مال اور سرمایہ کے اس
حب غیر یا "عشق مفرط" کی آگ اپنے اندر جلا لیتے ہیں، جس کی تعبیر قرآن نے "حب جم" سے کی ہے
گویا اصلی معیشت والے جیسے نظریۂ ابتلائیت کے انکار کے بعد سرمایہ کے متعلق "اکل لم" میں مبتلا
ہو جاتے ہیں، اسی طرح قرآنی اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدری معیشت والوں کو مال کے
حب جم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہی قرآن سے بھی سمجھا جاتا ہے اور واقعات بھی اسی کی توثیق
کر رہے ہیں، لیکن بات کیا اسی منزل تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے؟ اگر ختم بھی ہو جاتی تو جنہیں اپنی
انسانیت اور اس کی قدرتی بلندیوں پر ناز ہے ان کا ایک معمولی ذہنی انقلاب کے ہاتھوں اتنا
نیچے گر جانا یا گرانے والے کا ان کو اتنا نیچے گرا دینا درحقیقت کچھ کم سزا نہ تھی، لیکن کہنے والے
کہہ سکتے تھے بلکہ کہہ رہے ہیں کہ اپنی بلندی و برتری کا یہ خیال انسانوں کا خود ساختہ ایک وہمی خیال
ہے، زمین پر چرنے والے ستوروں، جنگلوں میں گھوم گھوم کر شکار کرنے والے درندوں، کیڑوں مکوڑوں

کوچوں میں دربدر مارے مارے پھرنے والے کتوں سے آخر آدم کے بچوں کو بلند و بالا کیوں خیال کیا جائے،
کیوں سمجھا جائے کہ کھانا، پینا، مرجانا اس حیوانی نصب العین سے زیادہ انسانی وجود اپنے ساتھ
کوئی اور اونچا نصب العین بھی رکھتا ہے، جیسا کہ قاعدہ ہے کہ قرآنی حجت "بالغہ" یعنی آخری
دروازے تک پہنچانے والی حجت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی کم از کم میرے نزدیک یہی طرز عمل
اس نے اختیار کیا ہے،

مطلب یہ ہے کہ مال کے "حب جم" اور سرمایہ کا "عشق مفرط" جب ان طبقات پر مسلط ہو جاتا
ہے جنہیں قدری پیمانے پر یہاں روزی مل رہی ہے، تو پھر

اے عشق بجھے لے چل اے عشق کہیں لے چل

کے دوروں سے ان بیچاروں کو کون بچا سکتا ہے جو اپنے آخری محبوب کے وصال کی تمناؤں
میں تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں، قدری معیشت کی دشواریوں کو آسان بنانے کے وہ
سارے ذرائع جن کی مذاہب نے تعلیم دی ہے، عشق کی اس آگ میں جل بھن کر بھسم ہو جاتے
ہیں، اور وہی پرانا معاشی چھوٹا

ان نفعل فی اموالنا ما نشاء — اپنے اموال اور سرمایوں کو جو ہم چاہیں کریں

کا دماغوں میں نمودار ہوتا ہے، صلوات کیجئے یا مذہب و دین ایمان و دھرم کا "معاشی جدوجہد" کی
راہوں سے رشتہ توڑ دیا جاتا ہے، ز کا قانون، اقتصاد الاکرم، صبر و توکل، دعا، انفاق الی الادنیٰ،
ترک مالایعنی، الغرض وہ ساری ذمہ داریاں جو قدری معیشت میں الرحمٰن کی طرف سے عائد کی گئی
ہیں، وہ جلا دی جاتی ہیں، اپنے عشقی مطالبات کی تکمیل میں بے روک ٹوک لوگ مشغول ہو جاتے
ہیں، ایسے آدمی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹ پڑے اس کا کون اندازہ کر سکتا
ہے، معاشی مسائل کے متعلق حضرت شعیب علیہ السلام کی تبلیغ، قوم جس نے اپنے اندر مال کے اسی
حب جم کو پیدا کیا تھا، اسی قوم کو خطاب کر کے اللہ کے منادی حضرت شعیب علیہ السلام کے جو اس
قسم کے الفاظ قرآن میں محفوظ کئے گئے ہیں،

ولا تقعدوا بکل صراط توعدون — اور بیٹھتے ہو تم ہر راہ پر دھمکاتے ہو
لوگوں کو۔

یا فرماتے

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها — اور نہ بگاڑ پیدا کرو زمین میں اس کی
سدھار کے بعد۔

شعیبی مواعظ کے ان فقرات کی تفسیر اگر کوئی پڑھنا چاہے، تو ان ممالک میں جا کر پڑھ سکتا ہے جو
سمجھنے کی حد تک تو سب سے بڑے آئینی ممالک ہیں، بلکہ آج تو دنیا کی آئین گری اور آئین سازی کا
کام وہی کر رہے ہیں، اور انسانی اخلاق کی تعلیم کا وہ بے خطا معلم جس کے متعلق یاد پڑتا ہے کہ

جاہل ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے سرونسٹائن چرول نے لکھا تھا،

"یکماے جیسے مدبر نے یہ اعلان کیا کہ تعلیم ہی بدامنی اور قانون شکنی کا بہترین اور یقینی علاج ہے۔ اس لئے انگریزی گورنمنٹ کے لئے قطعی ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کے ذہنی خلاصی کی کوشش کرے۔"

بدامنی اور قانون شکنی کا یہی بہترین اور یقینی علاج تعلیم سے بھی جن ممالک کے کوچہ و برزن پٹے ہوئے ہیں، لیکن اور تو اور آئینیت اور عقلیت کے سب سے بڑے مرکز امریکہ میں قدری معیشت رکھنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، ہر راہ پر بیٹھ کر مال کے جب جم کے تقاضوں کی تکمیل میں جن جن ہتھکنڈوں سے وہ کام لے رہے ہیں، کس دن کے اخبارات میں اس کی خبریں نہیں چھپتی ہیں، آج تو ان ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے تو جانے دیجئے، جب امن کے دن تھے، عافیت کا دور دورہ تھا، اخبار پانیر نے صرف امریکہ کے متعلق لکھا تھا کہ،

"امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے رہتے ہیں، پانچ لاکھ کے قریب چوریوں کی تعداد ہے" (پانیر الہ آباد، ۱۱۔جنوری ۱۹۳۰ء)

یہ ۱۹۳۰ء کی رپورٹ ہے، اس کے بعد

"۱۹۳۱ء میں وکرشم کمیشن نے جو رپورٹ امریکہ کے متعلق حکومت کے آگے پیش کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ چوریوں نقب زنیوں جعل سازیوں غبن وغیرہ جرائم کی تحقیقات کے سلسلہ میں حکومت پورے تین ارب روپے خرچ کرتی ہے۔" (سچ ۲۔اکتوبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ تو خیر ایک ملک کا حال ہے، اسی اخبار سچ میں ملک نہیں، صرف ایک شہر الموسوم بہ لندن کے متعلق یہ روئداد شائع ہوئی تھی،

"گلے بندوں اس شہر (لندن) میں جو ڈاکے پڑے ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد ساٹھ اور ۱۹۳۰ء میں ستر تھی، اور ۱۹۲۰ء میں نقب زنی کے ذریعے سے دو ہزار چھیالیس اور ۱۹۳۰ء میں اسی طریقہ کو کام میں لاکر دو ہزار آٹھ سو چھپن آدمیوں نے چوری کی، راہگیروں کو ڈرا دھمکا کر جن لوگوں نے شہر لندن میں روپے وصول کئے ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد (۲۰) اور ۱۹۳۰ء میں (۴۲) تھی" (سچ ۱۱۔ستمبر ۱۹۳۱ء)

اور یہ وہ واقعات ہیں جن کا سراغ پولیس نے لگا لیا، ورنہ پولیس کے دائرۂ اطلاع سے باہر جو حوادث اس سلسلہ میں پیش آئے ہوں گے، ان کو اسی پر قیاس کیجئے، اور سچ تو یہ ہے کہ جس تمدن اور تہذیب نے مردوں سے آگے بڑھ کر عورتوں تک کو اتنا جری بنا دیا ہو، جیسا کہ امریکہ کے ایک اخبار ایوننگ گرافک نے لکھا تھا،

"ہمارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم یافتہ حسین لڑکیوں نے قزاقی اور راہزنی کا پیشہ شروع کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ روز روشن میں یہ حسین ڈاکو ریوالور بندوق سے مسلح ہو کر موٹروں پر بیٹھ کر بینکوں کو لوٹنے لگی ہیں۔" (اخبار سچ ۳۰۔جولائی ۱۹۳۱ء)

بہرحال قرآنی آیت

وتقعدون بکل صراط توعدون — اور بیٹھتے ہو ہر راہ پر دھمکاتے ہوئے

کی تفسیر جن نت نئی بلکہ بعض ناقابل تصور شکلوں میں آج دنیا کے ان ممالک میں ہو رہی ہے جہاں کے قدری معیشت رکھنے والوں میں "مال کا حب جم" خود ان ہی کے راہ نماؤں، اور حرص و طمع اندوزی، کے اندیشوں نے پیدا کر دیا تھا، انھیں کون گن سکتا ہے، معصوم بچوں کو اڑا اڑا کر لے بھاگتے ہیں، اور ان کی ماؤں اور باپوں سے یہ دھمکی دے کر بڑی بڑی رقمیں طلب کرتے ہیں کہ اگر روپیہ نہ دیا جائے گا تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا، پھر جن بدقسمت ماں باپوں نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی، بجائے زندہ بچے کے اپنی آنکھوں سے بچے کی سربریدہ لاش، انھیں دیکھنی پڑی، ایسے دن جہاں یہ واقعات شہروں اور قصبوں کے لئے اب نئے نہیں رہے ہیں، حیدرآباد کے پائیگاہی امیر نواب ظہیر یار جنگ بہادر نے اپنے سفرنامہ امریکہ و یورپ میں لکھا ہے کہ شکاگو کے میئر جدید نے خصوصیت کے ساتھ تاکید کی ان پر یہ امر اپنی کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے چاہیے کہ کسی خفیہ آدمی کو مقرر کر لیں، ورنہ امریکہ کے ڈاکوؤں سے ممکن ہے کہ ان کو گزند پہنچ جائے۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے سیاحوں کے لئے ایسا کرنا اپنی جان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین و قانون تعلیم رکھنے والے اس ملک کی کیا حالت ہو چکی ہے، سالانہ اربوں کی رقم خرچ کرنے کے باوجود اس ملک کی حکومت لوگوں کی جان و مال کی حفاظت سے معذور ہو چکی ہے۔ اور تعلیم جسے آئین شکنی کے انسداد کا یقینی نسخہ باور کرایا گیا تھا، جہاں تک واقعات اور خبروں سے معلوم ہوتا ہے، وہی تعلیم بدامنی اور قانون شکنی میں امداد پہنچا رہی ہے، ناولوں افسانوں کے ذریعہ لوگ نت نئے جرائم کی تدبیروں کے نقشے پیش کر رہے ہیں، سینماؤں، اور متحرک تصاویر کی راہ سے ان ہی جرائم کو کر کے دکھایا جاتا ہے، اور جو باتیں سوچی بھی نہیں جا سکتیں، بتایا جا رہا ہے کہ آدمی چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے، فریب دہی کے سائنٹیفک طریقوں کا رواج اس ملک میں بڑھ رہا ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ جن ملکوں کے اہل قلم ارباب تصنیف و تالیف تک کے متعلق ایسی باتیں سنی جاتی ہوں، اگرچہ واقعہ تو جزئی ہے۔ لیکن جزئیات ہی سے کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے، لندن کے اخبار ریو آف دی ورلڈ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ چارلس گارڈن نامی ایک صاحب جن کا شمار انگلستان کے ممتاز مصنفین میں ہے، متعدد مقبول عام کتابوں کے مؤلف ہیں، اپنی کتابوں سے ہزارہا روپے دو تین سال کے عرصہ میں انھوں نے کما کر لیا تھا، ان ہی مصنف صاحب کے متعلق

یہ واقعہ چھپا تھا کہ ایک دن جب سڑک پر سناٹا تھا، انگلستان کا یہ مصنف تعلیم یافتہ گھر سے باہر نکلا۔ قسمت کی ماری ایک میم صاحبہ سڑک سے گذر رہی تھیں، گلے میں ان کے ایک ہار پڑا ہوا تھا جس کی قیمت پندرہ سولہ ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ اس قیمتی ہار والی میم صاحبہ کو تنہا پاکر جناب مصنف صاحب نے ہار پر ایک جھپٹا مارا، غریب عورت کیا کر سکتی تھی، وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، اور ہار کو گلے سے اتار، مصنف صاحب یہ جا وہ جا، گلیوں میں غائب ہو گئے، لیکن میم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا، چور چور، اچکا اچکا کہتے ہوئے وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگی، سامنے راہ گیر جو آرہے تھے، انھوں نے اس تعلیم یافتہ مصنف چور کو پکڑ لیا۔ اتنے میں پولیس آگئی، چور گرفتار ہو گیا، اچک کر لے بھاگنے کے جرم میں ڈیڑھ سال کی سزا اس چور مصنف کو بھگتنی پڑی (ماخوذ از سچ بحوالہ نیوز آف دی ورلڈ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۲ء) بدقسمتی سے یہ چور مصنف صاحب پکڑے گئے، اس لئے بات کھل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانتا ہے کہ "مال کے حب جم" کے عاشقوں سے بھرے ہوئے اس ملک میں آئین شکنی کا بے خطا اور یقینی علاج کن کن نتائج کو پیدا کر رہا ہے۔

اور یہ حال تو ان کا ہے جن میں جرائم کی ان راہوں پر چلنے اور قسمت آزمائی کی ہمت پائی جاتی ہے، لیکن قدری معیشت رکھنے والوں میں ناکام عاشقوں کا وہ گروہ جو کرنا تو سب کچھ چاہتا ہے، لیکن کچھ کر نہیں سکتا، اس کے درد کا افسانہ کون سن سکتا ہے، سنتے ہیں اور کہتے کیا ہیں خود قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ بعض معاشی دشواریاں غالب آتے، اور مال کے "حب جم" کے جذبہ کی تسکین کے لئے وہاں کے باشندے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی ذبح کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے[1]، قرآن کو اسی رواج کے انسداد کے لئے ایک سے زائد مقام پر

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔	اور نہ گردن مارو اپنی اولاد کی افلاس کے اندیشے سے۔

کا حکم نافذ کرنا پڑا اور جہاں تک عرب کی تاریخ کا تعلق ہے قرآن کے بعد سنگدلی اور قساوت قلبی کے

---

[1] عام طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ جاہلیت میں عرب صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور اس لئے کر دیتے تھے کہ اپنی لڑکی کو کسی اجنبی مرد کی جورو بنتے پر ان کی غیرت اور جاہلی حمیت آمادہ نہ تھی، ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم اسی وجہ سے روا رکھا گیا ہو۔ گو اس کا کوئی تاریخی ثبوت ابھی تک مجھے نہیں ملا ہے، لیکن لڑکیوں کے سوا لڑکوں یا عام اولاد لڑکے ہوں یا لڑکیاں ان کے قتل کے جاہلی دستور کا ذکر تو خود قرآن میں ایک سے زائد جگہ پر کیا گیا ہے، جہاں اس کا ذکر ہے وہاں قتل اولاد کی اس سفاکانہ رسم کی وجہ بھی اور صرف یہی بیان کی گئی ہے جسے آج برتھ کنٹرول کے جواز بلکہ وجوب کے سلسلہ میں عموماً پیش کیا جاتا ہے یعنی معاشی دشواریوں کے حل کا ایک ذریعہ قتل اولاد عرب کے جاہل اسی طریقہ سے قرار دیئے ہوئے تھے جیسے آج ضبط تولید کے نام کو بھی خوبیوں کی اسی قسم کے حل کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ پڑھئے قرآن میں پڑھئے قتل اولاد کی ممانعت کا جہاں کہیں ذکر ہے وہاں اسی کے ساتھ من خشیة املاق (افلاس کے اندیشہ) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۱۲

اس بیماری کا زور بھی کہ اس ملک میں اب تک تو دیکھا نہیں گیا ہے، لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا، آج تعلیم یافتہ یورپ و امریکہ میں پیدا ہونے کے بعد نہیں بلکہ پیدا ہونے سے پیشتر ہی بچوں کے گلے ماؤں کے پیٹ ہی میں برتھ کنٹرول وغیرہ کی مختلف تدبیروں سے جو گھونٹے جا رہے ہیں۔ کیا اس کی وجہ اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ دوسروں سے چھیننے کی ہمت جو اپنے اندر نہیں پاتے "مال کے حب جم" کے ان عاشقوں نے اپنے قدری سرمایہ کو بچانے کی یہ تدبیر پیدا کی ہے کہ قدری معیشت کی پریشانیوں میں جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

اور قصہ کیا یہیں ختم ہو جاتا ہے؟ آج نہیں کہ آج تو "دشمن کشی"[1] کے مشاغل میں یہ ممالک مشغول ہیں، لیکن ان ہی دنوں میں جب تک "دشمن کشی" کا یہ قصہ نہیں چھڑا تھا، کون نہیں جانتا کہ قدری معیشت ہی کے متعلق ان ممالک کے باشندوں کے غلط احساسات نے ان کے لئے "اولاد کشی" ہی نہیں کہ "اولاد" پھر بھی غیر ہی ہوتی ہے بلکہ "خود کشی" کے فعل کو بھی ان کا ایک محبوب شغل بنا دیا تھا، ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کس سے پوشیدہ ہیں کہ بعض علاقوں میں "خودکشی" کو آسان بنانے کے لئے باقاعدہ انجمنیں اور کلب قائم تھے، رسالے نکلتے تھے جن میں لوگوں کو بتایا جاتا تھا کہ بہ سہولت تمام اپنی زندگی کے قصہ کو وہ کس طرح ختم کر سکتے ہیں، یونائیٹڈ اسٹریا وغیرہ کا نام اس سلسلہ میں سب سے آگے تھا۔

۱۹۳۲ء ماہ مارچ کی اشاعت میں سنڈے ایکسپریس اخبار میں برگیڈیر جیری گارڈن کا ایک بیان "خودکشی کے واردات" کے متعلق شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ

"ان کی رائے میں خودکشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں" (سچ ۱۱ اپریل ۱۹۳۲ء)

چونکہ جیری گارڈن کے مطالعہ کا خاص مضمون خودکشی کے واردات ہی تھے، اس لئے ان کے بیان کو بہت اہمیت دی جاتی تھی، اسی بیان میں انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ

"ہر ہفتہ اوسطاً آٹھ آدمی زبانی یا تحریراً مجھے اپنے ارادہ خودکشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جو خودکشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے ان کی تعداد انگلستان میں ہر سال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔" (اخبار مذکور)

دیکھا آپ نے نظریۂ ملائیت کا انکار قدری معیشت میں بھی بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جنھوں نے اپنی قدری زندگی کا رشتہ جب خدا سے توڑا، تو اس رشتے کے ٹوٹنے کے جو لازمی نتائج ہیں ان سے اپنے آپ کو وہ کیسے بچا سکتے تھے، یہی لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

---

[1] اس کو خیال کتاب پڑھنے والوں کو رکھنا چاہئے کہ کتاب جس وقت لکھی جا رہی تھی اس وقت یورپ میں دوسری جنگ عظیم برپا تھی ۱۲

ومن یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ۔

اور جو خیال کرتا ہے کہ نہیں مدد کرے گا اللہ اس کی دنیا میں اور آخرت میں تو تانے وہ ڈوری کسی بلندی میں (پھر پھانسی لگا کر اس کو کاٹ دے اور دیکھے کہ) کیا اس چال سے اپنے دل کے غم و غصہ کا ازالہ وہ کر پایا؟

اس موقعہ پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شاید اس قرآنی اشارے کے سمجھنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے ایک "مغربی خاتون" جس کا نام مسز گیلس تھا اس کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ

"یہ ایک حسین عورت تھی ۲۹ سال کی جوانی عمر، شوہر موجود تھا۔ اولاد بھی ہو چکی تھی، موجود تھی، شادی پر صرف پانچ سال گذرے تھے"

مولانا کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی اور عنفوان شباب کے زمانہ میں "فلم اسٹار" بننے کا موقعہ بھی مل چکا تھا لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک کے ہو رہنے کا اس نے فیصلہ کیا تھا۔ اب اسباب کیا تھے لیکن جیسا کہ دستور ہے، رزق جس پیمانہ پر اس کے لئے مقدر ہوا تھا وہ قدر کا پیمانہ تھا، سینمائی زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد قدری معیشت کا یہ حال اس کے لئے ناقابل برداشت بن گیا جس تمدن و تہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ خدا اور اس کی نعمتوں سے مایوس تمدن اور مایوس تہذیب تھی، ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا اسی کو پیش کرنا میرا مقصود ہے۔ اس کی خود نوشتہ تحریر کا ترجمہ ہے۔

"میں مالی مشکلات سے جن کا کوئی حل نہیں مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں، میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری اور میری بچی کی گذر ہو سکے، شوہر سے میرا فراق ہو چکا ہے، میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے، میرے دوست و احباب ایسے موجود ہیں جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی۔"

اس تحریری فیصلہ کے بعد اپنی اعانتوں اور خدائی نعمتوں سے اس مایوس تمدن میں پیدا ہونے والی اس عورت نے یہی عجیب بات ہے کہ جس کا قرآن میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی فلیمدد بسبب الی السماء (چاہئے کہ چھت میں رسی لٹکائے) ثم لیقطع (پھر اسے کاٹ دے) گویا اسی حکم کی تعمیل اور تجربہ کی راہ بتاتے ہوئے اپنا اور اپنی بچی کا اس نے خاتمہ کر دیا لیکن جیسا کہ قرآن میں پوچھا گیا ہے۔

فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ۔

پھر دیکھے کہ کیا اس چال سے بھی اس کے دل کے غم و غصہ کا ازالہ کیا؟

اس کے دل میں بھی اس کا خیال آیا، مردہ ضمیروں میں زندگی کے بعض جراثیم موجود ہوتے ہیں، خصوصاً موت کے وقت کسی نہ کسی حد تک ان زندہ جراثیم کی حرکت کا احساس ہوتا ہے، اسی احساس کو دبانے کے لئے اس عورت نے یہ بھی لکھا تھا،

"میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کئے دیتی ہوں، اس لئے بھی ختم کرتی ہوں کہ اگر وہ حسین نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین نہیں ہے۔ تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں، میں ہی اس بچی کو وجود میں لائی تھی، اور میں ہی اس کو ختم بھی کر دیتی ہوں،"

جو سوالات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے، معاذیر[۱] کے ان ہی پردوں کو ان پر ڈال رہی تھی۔ آخر میں اس نے یہ بھی لکھا تھا،

"مجھے یقین ہے کہ اپنی اور اپنی بچی کی جان لینے میں حق بجانب ہوں، اخبار میں چھپتا رہتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد واقعی زیادہ ہے، خیر اس زیادتی سے بقدر دو عورتوں کے کمی ہو ہی جائے گی!"

لیکن ظاہر ہے کہ دم نکلنے کے بعد اس کی یہ ساری چالیں اور اس کا کید قطعاً اس کے لئے نفع بخش نہ ہوا، ہو سکتا تھا جیسا کہ موت سے پہلے کی زندگی جو ارحم کے ذکر سے الگ ہو کر گذر رہی تھی۔ اس کے متعلق اس نے لکھا تھا کہ "میں نے زندگی کو اپنے حق میں ایک مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہ گذرا، میں نے مردوں کو درندہ پایا، کوئی مرد اپنی غرض کے بغیر پوچھتا بھی نہیں، اس لئے اس بچی کو میں اس مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی!"

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا۔

اور جو کترایا میری یاد سے اس کے لئے ہی معیشت تنگ اور تنگیوں سے بھری ہوئی۔

کی یہ کتنی مکمل تفسیر اور اس کی تصدیق کی کتنی واضح شہادت ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ بجائے ابتلا و امتحان کے موجودہ زندگی اور اسی کی راحتوں اور نعمتوں کو اول و آخر مان کر خدائی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر جیتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ بھی جیتے ہیں لیکن کاش یہ پوچھئے تو وہ ہر وقت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں ایک جوان اور حسین عورت کہ جوانی اور بہار کے دن جس نے ہر قسم کے قیود سے آزاد ہو کر گذارے، سینما کے افق پر ستارہ بن بن کر چمکتی رہی، لیکن وہی اقرار کرتی ہے کہ

"میں نے زندگی کو اپنے حق میں مصیبت پایا، میری زندگی کا کوئی حصہ چین سے نہیں گذرا۔"

۱؎ اشارہ قرآن کی مشہور آیت کی طرف ہے یعنی بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ (بلکہ آدمی اپنے آپ کا دیکھنے والا ہے خواہ اس پر عذروں کے پردے ہی کیوں نہ ڈھانپتا چلا جائے) ۱۲

کرنی حصہ کا اتفاق ہی خوب ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ سبلی اور قدری معیشت کے دونوں حالات میں معیشت خشک اور تلخ زندگی ہی وہ گذارتی رہی، اس کا اعتراف ہے اور اس کی زندگی کے دونوں کے چہرہ کا آخری نتیجہ ہے۔ آخر دونوں کو دنیاوی دولت و ثروت کے ساتھ جب اس طرح چھوڑ دیا جائے کہ وہی سب کچھ بن کر رہ جائے، نہ ہونے کی صورت میں ہونے کے ولولے اور جذبات اور ہونے کی صورت میں زوال نعمت کے اندیشے اور خطرات اس قسم کے نفوس کے لئے جس طرح سوہان روح بنے رہتے ہیں ان کا اندازہ بہ نسبت دوسروں کے خود ان ہی کو زیادہ ہو سکتا ہے اخبار میں ہی میں ایک دفعہ دنیا کے سب سے بڑے ہنسوڑ، خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے والے نقال چارلی چاپلن کے متعلق یہ خبر امریکن و یورپین اخبارات کے حوالے سے چھپی تھی۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا تھا:

> پچھلے دنوں انگلستان و امریکہ کے جتنے اخبار موصول ہوئے۔ سب میں خم کا یہ افسانہ موجود تھا، یعنی چارلی چاپلن کی لیڈی صاحبہ مسز چاپلن نے اپنے شوہر نامدار پر دعویٰ دائر کر دیا جو ہر طرح کے گفتہ و ناگفتہ الزامات پر شامل ہے، اور جس کی بنا پر چارلی چاپلن کی برسوں کی کمائی، لکھوکھا روپے کی جائداد خطرے میں ہے۔"

مولانا نے اس کے بعد جو بات لکھی تھی وہی اس قابل ہے کہ زیادہ عبرت و بصیرت سے اسے پڑھا جائے، لکھا تھا:

> ان راویوں کے بیان کے بموجب اب چارلی کے جسم پر بے تکلف جا بجا جگہ چتیڑے لگے ہوئے ہیں، چہرے پر چھائیاں چھوٹ رہی ہیں، صورت پر وحشت برسنے لگی ہے، پیرانہ سالی کے آثار اس پر طاری ہوگئے، صورت اتنی بدل گئی کہ پہچاننا دشوار ہے۔

آخر میں نیوز آف ورلڈ لندن کے حوالے سے مولانا نے نقل کیا تھا:

> کل جو دنیا کا زندہ ترین دل تھا وہ آج دنیا کا مردہ ترین شخص ہے (سچ [illegible])

اللہ اللہ جو اپنے چہرے اور اس کی کیفیات کو دل کے حالات سے جدا رکھنے کی عمر بھر مشق کرتا رہا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مال کے "حب جم" اور سرمایہ کے "عشق مفرط" نے اس کو کتنا متاثر کیا تھا کہ مصنوعی حالات کے طاری کرنے کی یہی ساری مہارت غائب ہوگئی اور جو آگ اس کے دل میں بھری ہوئی تھی اسی کے شعلوں نے چہرے کی ساری مصنوعی بشاشتوں کو جلا کر خاک سیاہ بنا دیا، اور یہ قدری معیشت میں مبتلا ہو جانے کے خطرے، صرف خطرے کے احساس کا اثر تھا۔ پھر اسی سے اندازہ کیجئے ان سینکڑوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا جو واقعی ان ممالک میں قدری زندگی گزار رہے ہیں اور گزارنے پر مجبور ہیں، نظریۂ اشتراکیت کا شکار کر کے انکے مفکرین اور راہنماؤں نے جن ذہنی اور فکری انگاروں پر دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنے کے لئے ان کو چھوڑ دیا ہے، معاذ اللہ اس کی سوزش و تپش کا کوئی ٹھکانہ ہو سکتا

باہر کی دوزخ کا انکار یقین کیجئے کہ ایسوں کے لئے خود ان کے اندر دوزخ بن کر بھڑک اٹھتا ہے، بنانے والے نے آدمی کی فطرت یوں ہی بنائی ہے۔ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ پائی ہے قدری معیشت کا وہ حال جس میں انسان کا خدا اور خدا کی مشیت خدائی رحمت و نصرت سے رشتہ توڑ دیا گیا ہو، قدری زندگی کو بند و سبلی زندگی سے بدل دینے کا سارا اقتدار و اختیار جہاں خود انسان ہی کے سپرد کر دیا گیا ہو، وہی جس کی تعبیر اس زمانے میں یہ کی جاتی ہے کہ اپنی تقدیر کا معمار ہر شخص بذات خود ہے، کاش ان کو اس وقت جانے دیجئے، میں ذکر ان لوگوں کا کر رہا ہوں جو یہ سب کچھ سیکھ کر سکھا کر پھر بھی اپنی تقدیر کی تعمیر میں ناکام رہتے ہیں، اور حالات ان کو ناکام رہنے پر مجبور کرتے ہیں ایسی جن کے قلبی انگاروں اور باطنی جہنم کو ٹھنڈی کرنے کے لئے آج اشتراکیت کا جھنڈا اڑایا گیا ہے سرمایہ داری اور سرمایہ بیزاری کی اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا، ابھی تو وہ سامنے نہیں ہے، لیکن سوال ان سے ہے جو اس وقت جل رہے ہیں، اور ان سے پہلے جل جل کر جن بیچاروں نے اپنی قدری زندگیوں کو دوزخ بنا کر گذاری ہے، ان کے ساتھ یقیناً یہی کیا گیا کہ ان سے دوزخ کا خیال نکال کر ان کے دلوں میں دوزخ بھر دی گئی، اس وقت تک بھری ہوئی ہے۔

حالانکہ میں تو کہتا ہوں، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہی قدری معیشت جو انسانیت کے لئے جہنم بنی ہوئی ہے۔ ابتلائی نظریے کی راہنمائی میں اسی زندگی کو جنہوں نے گذارا ہے اور آج بھی خدا کے فضل سے ایک بڑی تعداد زمین کے اس کرہ پر اسی زندگی کو گذار رہی ہے جو خوشی و سکون گذار رہی ہے، اگر اپنی زندگی کو وہ جنت کی زندگی نہیں بنا سکے ہیں تو اتنی بات یقینی ہے کہ اس جہنم میں بھی نہیں جلنا پڑا ہے جس میں جہنم کے انکار کرنے والوں کو آج جلتے بھنتے گھٹتے اور کڑھتے دن رات دیکھا جا رہا ہے، بلکہ کچھ پوچھئے تو جس جنت کو آج خیال صرف خیال ٹھہرایا جا رہا ہے، میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس جنت کے خیال نے بھی ان بہتوں کی زندگیوں کو جنت بنا دیا ہے، انسانی آبادیوں میں آج بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو گو ان کی تعداد گھٹ چکی ہے اور گھٹتی چلی جا رہی ہے لیکن پھر بھی آپ کو ایسے افراد ان ہی انسانوں میں مل جائیں گے جن کی زندگی کو جنت کے اسی خیال ہاں صرف خیال نے جنت بنا رکھا ہے، دوسروں کو اختیار ہے خواہ وہ کچھ ہی سمجھیں، لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں ان لوگوں کو جب کبھی دیکھتا ہوں تو ہمیشہ یہی اثر دل میں پیدا ہوا ہے کہ جن کا خیال بھی جنتی زندگی کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے، اسی جنت کی واقعی حقیقت اپنے اندر مسرت و نشاط کے کن سمندروں کو سمیٹے ہوگی۔

لوگوں نے سمجھا نہیں ورنہ دین الٰہی یا مذہب کا ادھر میں کے نتائج کا براہ راست تعلق آخرت سے سمجھا جاتا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ مذہب اور دین کا روبار کے نتائج کا حقیقی تعلق آخرت ہی کے ساتھ ہے لیکن استلزامی اور ذیلی طور پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیا کی زندگی میں بھی دین یقیناً انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ دیکھا جا رہا ہے، انقلاب اور کیسا انقلاب!

تجربہ شاہد ہے کہ دین کی دوزخ کا خوف جس حد تک جس کی زندگی پر مسلط ہوتا چلا گیا ہے، اسی حد تک دنیا کی دوزخوں کا دکھ بھی اس کے لئے سکھ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا یہ فقرہ

من الیقین ما تھون بہ	اے پروردگار ہمارا اضافہ فرمائیے میرے
علینا مصائب الدنیا۔	یقین کی قوت میں جس کے ذریعے دنیا

کی مصیبتیں ہلکی پڑتی چلی جاتی ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی مطلب ہے اور یہی حال دین کی جنت کا بھی ہے کہ جس کا جتنا زیادہ اعتقاد دین کی اس جنت پر بڑھتا چلا گیا ہے، دنیا ہی میں اس پر جنت کے دروازے کھلتے چلے گئے ہیں۔

اب لوگوں کو کیا کہئے وہ آدم کی اولاد سے نیکی اور نیک کرداری کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کو جو امانت بھی سپرد کی جائے بغیر کسی خیانت کے امانت کے فرائض کو وہ انجام دیتا چلا جائے ان غریبوں پر پیشانیاں چڑھائی جاتی ہیں جو حکومت کے محکموں میں رشوتیں لیتے ہیں، رعایا کو بھی لوٹتے ہیں اور جس حکومت کے ملازم ہوتے ہیں موقع ملنے پر اس کی آمدنیوں سے بھی نفع اٹھاتے ہیں ان سیکڑوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہے جو تجارت میں دھوکے دیتے ہیں، سستی دستکاریوں میں فریب سے کام لیتے ہیں، ان کے لئے قانون پر قانون بنائے جا رہے ہیں، تعزیری دفعات ڈھالے جا رہے ہیں، جیلوں کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، سوسائٹی میں ان کو رسوا کیا جاتا ہے، لعنتوں اور ملامتوں سے ان کے قریب کو لوگ چھلنی بنائے ہوئے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات یہ تھی کہ جہنم کا خوف جن کے دلوں سے نکال دیا گیا ہے اور نکال دینے کی مسلسل کوشش جاری ہے، کالجوں میں، اسکولوں میں، تصنیفوں میں، اخباروں میں، رسالوں میں، سینماؤں میں اور تماشہ گاہوں میں، جلسوں میں اور کلبوں میں، اور یہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو، بلکہ دنیا ت کہ مرنے کے بعد بھی سزا یا جزا سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے گا، اس کا مسخرہ کر کے اڑایا جاتا ہے، یہ مذہب کا ڈھکوسلہ صرف ڈھکوسلہ ہے، ہر ایک کی تدبیر خوری کوشش اسی کے باور کرانے پر مرکوز ہو گئی ہے، پھر آنے والی زندگی کی سزاؤں سے نڈر بنائے گئے ہیں، جہاں ڈر نہ ہو پولیس کا، ڈر نہ ہو عدالت کا، ڈر نہ ہو وہاں ان افعال کے ارتکاب سے آپ کیا سمجھتے کہ وہ کیوں ڈریں، جن سے ڈرنے کا آپ ان سے خواہ مخواہ مطالبہ کر رہے ہیں، رشوت کی اس آمدنی سے وہ کیوں دست بردار ہوں، جس کی اطلاع حکومت کے دسترس سے باہر ہے وہ دھوکے کیوں نہ دیں جب جانتے ہوں کہ جسے دھوکا دیا جا رہا ہے وہ دھوکہ کیا سکتا ہے، خود لوگوں کو آپ یہ بھی سکھا رہے ہیں، آپ کے اساتذہ سکھا رہے ہیں، آپ کے ارباب تصنیف و تالیف سکھا رہے ہیں، شعراء گا رہے ہیں، مقررین سنا رہے ہیں، ایکٹر بازیگروں کو تک دیکھا جا رہا ہے کہ باور کرایا جا رہا ہے کہ جو کچھ ہے یہاں اور اسی زندگی میں کھویا جاتا ہے، پھر وہ

کسی کو ملتی ہے اور نہ وہ چیزیں ملتی ہیں جن کی زندگی کو ضرورت ہے، آپ یہ بھی سناتے جاتے ہیں، اب میں آپ کو اور آپ کی عقل کو کیا کہوں کہ اسی کے ساتھ یہ بھی بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ اس روپے کو ہاتھ مت لگانا جس کے لینے کی قانون اجازت نہیں دیتا، کیا قانون کے رو کے چھوٹے روپے کو چھوڑ دینے سے قانون پھر اس رقم کو مجھ تک پہنچا سکتا ہے، آپ نے انسان کی فطرت کا مطالعہ اگر کیا ہے تو کیا کیا ہے، جس پر بغیر کسی خطرے کے قبضہ کیا جا سکتا ہے، ان پیسوں کو کوئی کیوں چھوڑے، جب تک یہ نہ باور کرایا جائے کہ ان پیسوں کے چھوڑنے والوں کو روپیہ دیا جائے گا لیکن روپیہ تو روپیہ ان چھوڑے ہوئے پیسوں کے معاوضہ میں کوڑی دینے کے لئے بھی آپ تیار نہیں، پھر یہ کتنا غیر فطری مطالبہ ہے کہ ان پیسوں کو چھوڑ دیا جائے، انھیں حرام سمجھا جائے صرف رشوت، چوری، بدعنوانی، بددیانتی وغیرہ کے مذہبی الفاظ فقط الفاظ سے آپ کب تک فائدہ اٹھائیں گے، جب خود اپنے ہاتھوں اس دیوار کو ڈھا رہے ہیں جس پر ان الفاظ کے زور کی بنیاد قائم ہے، مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے،

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست　　　او پیاز گندہ را ندہد ز دست

اور کودک یا بچوں کی فطرت کا جو حال ہے کہ سڑی پیاز کو ہاتھ سے اسی وقت چھوڑ سکتے ہیں جب اس کی جگہ سیب انھیں پکڑا دیا جائے، یہی فطرت جوانوں اور بوڑھوں میں بھی عمل کرتی رہتی ہے، تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے باہر میں ہوتی ہے لیکن "اندر" ہر حال میں سب کا ایک ہی رہتا ہے، قرآن مجید کی آیت

اعلموا انما الحیوۃ الدنیا	جانو اس بات کو کچھ نہیں ہے یہ پست
لعب ولھو وزینۃ وتفاخر	زندگی لیکن لعب (کھیل) اور لہو (مشغلہ)
بینکم وتکاثر فی الاموال	اور زینت (بناؤ سنگار) اور باہم ایک
والاولاد۔	تفاخر (ایک کا دوسرے کے مقابلہ میں

فخر کرنا) اور اموال (سرمایہ) اور اولاد کی کثرت میں مقابلہ۔

میں آدمی کی موجودہ پست دنیاوی زندگی کو بظاہر پانچ ادوار میں جو تقسیم کیا گیا ہے، مشاہدہ سے بھی جس کی تصدیق ہو رہی ہے یعنی پیدا ہونے کے بعد آدمی پر پہلا حال جو طاری ہوتا ہے اس کی تعبیر لعب سے کی گئی ہے، لعب کھیل کود کا نام ہے یا بالفاظ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کسی نتیجہ کو نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مٹی یا ریت کے گھروندے بنا کر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکتا ہے، اسی قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی ہی میں کرتا ہے، اسی وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، اگرچہ اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی، ایام طفولیت کے کسی

دور کے گزرنے کے بعد جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں، پہلے ان کی فہرست مرتب کر لینی چاہیئے۔ تب معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عام خیال میں حقیقت کا حصہ کتنا شریک ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور لعب والے کے گزرنے کے بعد یہ چار دور آدمی پر اور آتے ہیں۔

(۱) لہوی دور کے معنی غفلت کے ہیں، طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب جوانی کی حرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے، یہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے، یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے، ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں جن کا تقاضا جوانی کے ان دنوں میں زور پکڑتا ہے۔

(۲) پھر اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی کے پیچھے پیچھے بننے اور سنورنے کا جذبہ آدمی پر مسلط ہوتا ہے صورت شکل کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو لیکن جسے بھی دیکھیے نظر آتا ہے کہ اپنے بالوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، سنوار رہا ہے، مونچھوں کو پا تراش بنائے ہوئے ہے، یا لباس میں سجا ہوا ڈھال میں، الغرض اپنی اپنی بساط کے مطابق زیب و زینت میں عموماً لوگ مشغول ہو جاتے ہیں، اسی کا نام قرآن نے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں "زینت" رکھا ہے، یہ فیشن اور بناؤ سنگار کا دور ہوتا ہے۔

(۳) یہ دور بھی بتدریج گزر جاتا ہے، گزرتا رہتا ہے کہ اپنے دائرے میں ہر چیز کو اپنا مقابل بنا کر اس کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان مشغلوں میں مصروف ہیں جن کا قرآن نے تفاخر نام رکھا ہے۔ اپنے حسب پر اپنے کمالات و صفات پر، شکل پر صورت پر نظر آتا ہے کہ ہر ایک ناز کر رہا ہے اور کیسا ناز، کہ گویا اس کے مقابلہ میں دوسرا کچھ نہیں ہے۔

(۴) ان سب کے بعد آخری میدان جس میں بہر حال ہر ایک کو بالآخر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے وہ وہی ہے جس کا نام لوگوں نے "عمل کا میدان" رکھا ہے۔ دراصل "عملی زندگی" یا فکر معیشت کی زندگی ہی کا نام عمل کا میدان رکھا گیا ہے، اور زندگی کا یہی دور سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے، لیکن اس دور میں داخل ہو کر کرنے والے جو کچھ کرتے رہتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو وہی بات حقیقت معلوم ہوگی جسے قرآن میں

تکاثر فی الاموال والاولاد — اموال اور اولاد کی کثرت میں باہمی مقابلہ

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے

یعنی بات یہی ہوتی ہے کہ بڑھنے والے چند خاص افراد کو سامنے رکھ کر مقابلہ کا بازار گرم کرتے ہیں عملی میدان کی اس زندگی میں پہلے تو دولت و ثروت کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، تنخواہیں ملائی جاتی ہیں آمدنیوں کا موازنہ کر کے اغنیاء میں ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکروں اور کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ "اموال" کے بعد پھر "اولاد" کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں، اور معاملہ جب آگے بڑھتا ہے تو مقابلہ کے اس میدان کو پوتوں اور پرپوتوں نبیروں اور نواسوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔

الاموال والاولاد کے تکاثر کا یہی مشغلہ عموماً ہم میں اکثروں کی زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے دم توڑ دینے والے اسی مشغلہ میں پھنسے ہوئے دم توڑ دیتے ہیں، مشرق ہو یا مغرب، قدیم دنیا ہو یا جدید ہر جگہ یہی تماشا ہے جو بنی آدم کے گھرانوں میں کھیلا اور دیکھا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے ان پانچوں ادوار میں سے طفولیت کے پہلے دور کے مشاغل کی نوعیت اگر لعب (کھیل کود) کی تھی، یعنی گزرنے والے زندگی کے اس ابتدائی دور میں جو کچھ بھی کرتے رہتے ہیں، وہ لاحاصل اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، اسی لئے نگاہوں میں ان اعمال و افعال کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، تو چار دور جو اس کے بعد آتے ہیں، یعنی لہویت، زینت، تفاخر، الاموال والاولاد میں تکاثر، ان ادوار میں جو مشاغل انجام دیئے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے جانچا جائے یعنی سوچا جائے کہ کوئی حاصل، کوئی نتیجہ ان کا بھی ہے یا نہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ فرق پیدا کرنے والے پہلے دور کے طفلانہ اعمال اور باقی چار گانہ ادوار کے اعمال و افعال میں کیا فرق پیدا کر سکتے ہیں؟ چھپ چھپا کر لانے کے بعد غور کرنے والوں کو ایسا کون سا نتیجہ اور حاصل ہاتھ آتا ہے جسے واقعی حاصل اور نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے، اسی کے بعد قرآن ہی میں جو مثال بیان کی گئی ہے یعنی

كمثل غيث اعجب الكفار — مانند بارش کے کہ سرور کرتی ہے کسانوں کو
نباته ثم يهيج فتراه مصفرا — اس کی روئیدگی پھر ابھرنے لگتی ہیں پھر
ثم يكون حطاما۔ — روئیدگیاں پھر دیکھو گے کہ پیلی پڑ گئیں

• وہیں پھر ہو جاتی ہیں وہی چورا چورا [illegible]

جس کا حاصل یہی ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے زمین پر آتا ہے، روئیدگیوں کو یہی بارش اگاتی ہے ہریالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، پھر وہ زرد پڑنے لگتی ہیں، بالآخر گھاس بھوسہ بن کر ختم ہو جاتی ہیں، جیسے یہ سارا تماشا بارش کا ہوتا ہے، یوں ہی زندگی کی نمائش انسانی اجساد میں کسی جسد میں ہوتی ہے، زندگی اسی جسد کو طفولیت، شباب اور شیخوخت (پیرانہ سالی) کے ادوار گزارتے ہوئے اس نقطہ پر پہنچا دیتی ہے، جس پر زندگی کی اس نمائش کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جیسے یہ ہے کہ بارش کے اس تماشے سے خود بارش کو جیسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، انسانی جسد میں نمایاں ہو کر مختلف ادوار سے گزرنے والی زندگی ان تمام ادوار اور ان کی تمام نمائشوں سے خود اپنے لئے کس نتیجہ کو حاصل کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بارش اور نباتی شکلوں میں بارش کی نمائشوں سے بارش کا پانی جیسے کسی نتیجہ کو حاصل نہیں کرتا، بعینہ یہی حال اس زندگی اور الحیوة الدنیا کا ہے جس کا ظہور انسانی جسد میں ہوتا ہے اور ادوار پنجگانہ سے گزر کر موت پر جس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جیسے بارش کے بارش کی نباتی نمائشوں سے الکفار (کسان) لذت گیر ہوتے ہیں، کچھ یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم میں ایک کی زندگی اور زندگی کے ادوار دوسروں کے لئے ایک تماشا بنے ہوئے ہیں، لیکن خود زندگی والے کو اپنی زندگی اور اس کے ان ادوار سے کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا، یوں ہی لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں،

بچے بنتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بوڑھے بنتے ہیں اور مر جاتے ہیں، مرتے چلے جا رہے ہیں اور کاش یہ بات اسی پر ختم ہو جاتی، یعنی الحیوٰۃ الدنیا اور اس کی مختلف نمائشیں بے نتیجہ اور لاحاصل ہو ہو کر یونہی ختم ہوتی چلی جاتیں جیسے بارش اور اس کی نمائشیں خود بارش کے لحاظ سے بے نتیجہ ہی چھپتی جاتی ہیں، لیکن قرآن میں آگے جو اطلاع دی گئی ہے کہ

وفی الآخرۃ عذاب شدید — (اور اس پیچھے آنے والی دنیا کے بعد
ومغفرۃ من اللہ ورضوان — پچھلی زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت
(الحدید ع ۲) — بھی اللہ کی طرف سے اور "رضوان" بھی ہے
(یعنی حق تعالیٰ کی رضامندی)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ دنیا کی ان نمائشوں کو ختم کر کے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی، یعنی اس طور پر ختم نہیں ہو جاتی جیسے بارش کی نباتی نمائشیں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ بجائے ختم ہونے کے آدمی کی زندگی کو دو باتوں یعنی عذاب شدید (سخت مار) سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا اس کے سامنے مغفرت کا وہ سرچشمہ آتا ہے جس میں غوطہ لگانے والے ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر اپنے تمام احساسات و جذبات کے مطابق دائرۂ وجود کی اس مرکزی طاقت کو پا لیتے ہیں جس کی کوئی حد اور حساب نہیں ہے، قرآنی اصطلاح میں جس کا نام "رضوان" اور "رضوان اللہ" ہے۔

الحیوٰۃ الدنیا کی پست زندگی اپنے ادوار کے ساتھ جب ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نفیاً یا اثباتاً جو اس کا جواب نہیں دے سکتے، نہ ان کے حواس دے سکتے ہیں اور نہ ان کی عقل دے سکتی ہے، وہ اپنے اس جہل سے ظاہر ہے کہ اس علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو چیزوں کا غیب و شہادت کے جاننے والے نے عطا کیا ہے۔ پس پیغمبروں کو واقعی خدا کے پیغامبر جو لوگ مان چکے ہیں اور یہ جانتے بوجھتے ہیں کہ اس پست زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ان دو واقعات میں سے کسی ایک سے دوچار ان کو بہرحال ہونا پڑے گا، اور جب واقعہ یہی ہے تو پھر ان ابدی نہ ختم ہونے والے نتائج کے مقابلہ میں ہماری موجودہ "الحیوٰۃ الدنیا" اور یہ سارے بے حاصل ادوار اس کے سوا اور کیا رہ جاتے ہیں جو مذکورہ بالا آیات کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ

وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع — اور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف
الغرور — فریب کا ایک سرمایہ۔

آئندہ پیش آنے والے انتہائی اہم نتائج سے غافل بنا کر جس بے نتیجہ زندگی نے اپنے ان لاحاصل ادوار میں آدمی کو الجھا لیا ہو، خود ہی سوچنا چاہیے کہ "سرمایۂ فریب" یا "متاع الغرور" کے سوا اس کا نام اور کیا رکھا جائے۔

مجموعی قرآنی آیات کا مطلب ہوا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لاحاصل اور بے نتیجگی کی وجہ سے الحیوٰۃ الدنیا کا ابتدائی دور اگرچہ یہی دور ہے طفولیت اور طفولیت کے سارے مشاغل اگر صرف

کھیل کود ہی تو اس کے بعد آنے والے ادوار، چاہے کچھ نہ سوچنے والوں کی نگاہوں میں خواہ جتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن اپنی بے ثمری و لاحاصلی کی وجہ سے ان کو بھی لعب یا کھیل کود کے سوا اور کوئی دوسری بات آخر کیوں کہی جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کبھی پوری "الحیوٰۃ الدنیا" ہی کو لہو و لعب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ مشاغل اور کاروبار کے لحاظ سے زندگی کے مختلف ادوار میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ صرف باہر میں ہوتی ہیں، اندر "اندر" کا نقطہ نظر بہرحال ہیں جوانی میں بھی بڑھاپے میں بھی لوگوں کا وہی رہتا ہے جو بچپن میں ہوتا ہے، یعنی نتیجہ سے بے پروا ہو کر صرف لذت و مسرت کے وقتی تقاضے کو سب ہی پورا کرتے رہتے ہیں، الا یہ کہ اپنی الدنیا کا رشتہ پیغمبروں کی راہ نمائی میں جن لوگوں نے الدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دین سے رشتہ پیدا کر لینے کے بعد دنیا بھی بدل جاتی ہے، اس میں بھی انقلاب اور عظیم انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ سلجھانے والے دنیا کو بھی سلجھا نہیں سکتے، قطعاً سلجھا نہیں سکتے، جب تک وہ انسانیت کے "دین" کے سلجھانے میں کامیابی نہ حاصل کر لیں گے۔ دین کے بگاڑنے والوں کو آج نہیں محسوس ہو رہا ہے تو کل ماننا پڑے گا کہ انھوں نے انسان غریب، انسان کے دین کو بگاڑ کر اس کی دنیا بھی بگاڑ دی، اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس بگاڑ کے ظہور کا سلسلہ شروع ہو بھی چکا ہے، اور جو شروع ہو چکا ہے وہ بہرحال ختم ہو کر ہی رہے گا۔ تجربات یہی ثابت کرتے چلے جائیں گے، ان شاء اللہ یہی بتاتے چلے جائیں گے، ہم ہوں گے یا نہ ہوں گے لیکن اس وقت جو بھی ہوں گے ان کی آنکھیں دیکھیں گی، یقیناً دیکھیں گی، وہ سب کچھ دیکھیں گی جو اس وقت کہا جا رہا ہے۔

الحمد للہ یہ سارے معاشی جھگڑے، معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گزر کر اقوام تک کو میدانوں میں لے آئے ہیں، زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، آسمان آگ برسا رہا ہے، فتنہ اور فساد کے دھوئیں سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے، چیخنے والے چیخ رہے ہیں، چلانے والے چلا رہے ہیں، ازالہ کی ساری کوششیں جو ان لاحاصل اور بے نتیجہ جھگڑوں کے ختم کرنے کی راہوں میں کی گئیں، تجربہ ہر راہ کی ناکامی کا اعلان کر چکا ہے، لیکن معقول ازالہ کی جن کوششوں میں خلق شک درماندہ ہو چکے ہیں، اگر سوچا جائے انصاف کے ساتھ ہر قسم کی تنگ نظریوں سے الگ ہو کر سوچا جائے تو الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر بجائے ازالہ کے صرف امالہ کی یہ ہلکی سی تدبیر کہ مقابلہ کے سارے جذبات کا رخ "الحیوٰۃ الدنیا" اور اس پست زندگی سے ہٹا کر "الحیوٰۃ الاخریٰ" کی بلند و دائمی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے اور امالہ کی اسی تدبیر پر زور دیا جائے۔ اسی قدر زور دیا جائے جتنا کہ اب تک ازالہ کے لاحاصل سعی میں دیا جا چکا ہے۔ اور بجائے الدنیا کے الآخرۃ کو سامنے رکھ کر نسل انسانی کو دعوت دی جائے جیسا کہ قرآن نے اسی طریقۂ عمل کو اختیار کر کے

وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون — پس چاہیے کہ مقابلہ کریں اسی میں مقابلہ کرنے والے

کی دعوت دی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ایثار کی کوششوں کی راہوں سے جن مقاصد کے حصول میں دنیا
ناکام قطعاً ناکام ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی، ان ہی مقاصد میں ایثار کی اس معمولی تدبیر سے
کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ایثار ہی پر آمادہ نہ ہوں، یا زبان سے اقرار کر کے دل
کے منہ کو اور طرف پھیر لیں جس کی طرف پھیرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن منہ پھیرنے کے بعد ان
مقاصد میں کامیابی اصول ایثار کی تسلیم کا ایک ایسا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس میں تخلف کا امکان
ہی نہیں ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایثار کے اس اصول پر اعتماد اسی حد تک بڑھتا جائے گا،
جس حد تک مذہب پر انسانیت کے اعتماد کو آپ بڑھائیں گے، لیکن مذہبی اعتماد کے اضمحلال کا
جب تک وہ حال ہے جس میں دنیا کو آج مبتلا کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایثار کی اس تدبیر کا ذکر
مضحکہ کے سوا اور کیا ہے؟

اور یہ تھے اسلامی معاشیات کے وہ اصول کلیات جن کا قرآن میں اب تک میری جستجو
نے سراغ لگایا ہے، اس وقت تک تو جو باتیں سمجھ میں آئی ہیں وہ یہی ہیں، آئندہ اور چیزیں بھی
جو ملتی چلی جائیں گی، انشاءاللہ ان کا اضافہ کیا جائے گا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی نمونوں کو
دیکھ کر دوسرے ارباب فکر و نظر قرآن ہی سے دوسری چیزیں بھی نکال سکتے ہیں، جن پر میری نظر
اب تک نہ پہنچ سکی ہے۔

البتہ آخر میں ایک چیز قرآن ہی کی ایسی ہے کہ اس کا تذکرہ اگر نہ کر دیا جائے گا تو
قرآن پڑھنے والے ممکن ہے کہ بعض وسوسوں میں مبتلا رہیں؛

میرا مطلب یہ ہے کہ معاشی مدارج کے جس اختلاف کی تعبیر قرآنی اصطلاح کی رو سے میں
نے بسطی و قدری معیشت سے کی ہے، جیسا کہ بتفصیل بتا چکا ہوں کہ عام حالات میں معیشت کی
یہ دونوں شکلیں اتفاقی رنگ ہی کی ہوتی ہیں، یعنی کسی کے ساتھ عمل کے نتیجہ کے طور پر رزق کی تقسیم
ان دو پیمانوں پر نہیں ہوتی بلکہ الرزق کے یہ دونوں پیمانے امتحان و ابتلا کی دو شکلیں ہیں، اور چونکہ
دونوں امتحان ہیں یعنی ہر پیمانہ اپنے ساتھ کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے ان ہی ذمہ داریوں سے عہدہ
برآ ہونے کی کوشش بھی ان میں ہر ایک کا نصب العین ہونا چاہئے، پھر جیسے ہر امتحان کا قاعدہ
ہے کہ اس میں شریک ہونے والوں میں بعض کامیاب ہوتے ہیں بعض ناکام، یہی حال ان لوگوں کا
ہے جو معیشت کے ان دو مختلف پیمانوں پر روزی پا رہے ہیں، اسی سلسلہ میں جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ چکا
لیکن سوال یہ ہے کہ اس موجودہ پست زندگی (الحیوۃ الدنیا) میں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے کیا ہمیشہ ابتلائی
حیثیت ہی سے دیا جاتا ہے؟ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں اور ان کو جاننا ہی چاہئے کہ اجتماعی
طور پر اقوام و امم کی خوش حالیوں اور بدحالیوں کو مکافات اور مجازات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، قوموں
کے عروج و زوال کی تاریخ کا جتنا حصہ قرآن میں محفوظ ہے۔ وہ یہی بتانے کے لئے محفوظ کیا گیا ہے کہ
خدا اور اس کی مرضیات پر چلنے والوں سے خدا بھی راضی رہا اور خدا کے قوانین نے بھی ان سے

ہم نوائی کی، اور فطرت کے مقرر قوانین پر چلنے سے جنھوں نے بغاوت کی یعنی تشریعی قوانین سے تصادم
کی راہ جن قوموں نے اختیار کی، ان سے خدا اور خدا کے تکوینی قوانین متصادم ہونے لگے، اور اسی
تصادم کے بعد ان کے عروج کو زوال سے ترقی کو تنزل سے بدل دیا گیا، جیسا کہ میں نے عرض کیا
قرآن پڑھنے والوں کے لئے قرآن کا یہ دستور کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے، بلکہ چند کلیات
جن کے محور پر قرآنی تعلیمات گردش کرتی ہے ان میں سے قوموں کی حیات و ممات کا یہ ایک مسئلہ
اور بدیہی کلیہ ہے جس کے شواہد و نظائر کے بھی پیش کرنے کی حاجت نہیں، اس لئے میں بحث چلا
کہ فکر یا اجتماعیت یعنی معیشت کے بسطی و قدری پیمانوں کو قرآن میں ابتلا و امتحان کی جو دو شکلیں
قرار دی گئی ہیں تو اس کا تعلق اقوام و امم کے اجتماعی حالات سے نہیں ہے بلکہ اشخاص کی شخصی
زندگیوں کا یہ قانون ہے، یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طور پر عروج کی حالت میں کوئی قوم ہو یا زوال
کی، لیکن انفرادی حیثیت سے افراد میں روزی کی تقسیم کرنے کا یہ سلسلہ دونوں پیمانوں پر جاری رہتا
ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اجتماعی اور قومی نقطہ نظر سے ان کا حال کچھ بھی ہو، مگر کسی نہ
کسی رنگ میں بعض افراد ان کے امیر بھی نظر آتے ہیں اور بعض غریب بھی۔ یعنی بعضوں کی آمدنی تقاضا
ضرورت کے برابر اور اس کے ساتھ تنگی کی ہوتی ہے، اور بعضوں کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ ضرورت
و حاجت پر خرچ کرنے کے بعد وہ پس انداز بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، الغرض قدر و بسط کے ان
دونوں پیمانوں پر افراد میں پھر بھی روزی کی تقسیم ہی ہوتی رہتی ہے، کم از کم انسانیت کی جو تاریخ
اس وقت تک کی موجود ہے اور قوموں کو اس زمانہ میں بھی جن حالات میں پایا جاتا ہے ان کے
افراد کی معیشت کی یہی کیفیت نظر آتی ہے، عروج یافتہ قوموں میں جیسے یہ نہیں دیکھا گیا کہ ان میں
ہر ایک شخص بسطی رزق والا بن جاتا ہے، یعنی سب امیر ہی نہیں ہو جاتے بلکہ باوجود قومی عروج
کے افراد کی بڑی اکثریت جیسے عروج و ارتقاء کے ان ہی دنوں میں قدری پیمانے پر بھی روزی پاتی
ہے، اسی طرح زوال و انحطاط کے دنوں میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد اسی نکبت زدہ
قوم کے بسطی پیمانے پر رزق پا رہے ہیں؛

اور یہی بات تھی جو اس سلسلہ میں کہنا چاہتا تھا، یعنی اقوام و افراد میں جو فرق
قرآن میں کیا گیا ہے اس پر لوگوں کو متنبہ کر دوں؛

دوسری بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ انفرادی معیشتوں کا ابتلا و امتحان پر مبنی ہونا،
اگرچہ معیشت کا عام قرآنی قانون یہی معلوم ہوتا ہے، بسط ہو یا قدر جس پیمانہ پر بھی یہاں افراد کو
جو کچھ مل رہا ہے اسی کو یہی سمجھنا چاہئے کہ ان میں سے ہر پیمانے کی جو ذمہ داریاں ہیں، موجودہ زندگی
میں ان ذمہ داریوں کی تکمیل ہی آدمی کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اس نتیجے کے بھوگنے یا خمیازوں کے
بھگتنے کا وقت اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی میں آئے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابتلاء و
امتحان کے سوا معیشت کی ان دونوں شکلوں میں اور کچھ نہیں ہوتا، بعضوں نے اگر ایسا سمجھ لیا ہے تو

جو کچھ میں عرض کرتا چلا آیا ہوں، وہ غالباً کما حقہ اس کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ میں نے کسبی اور قدری معیشت کے ان دونوں پیمانوں کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے ان نتائج پر بھی جو متنبہ کرتا چلا آیا ہوں جن سے موجودہ زندگی ہی میں آدمی کو قرآن کے بیان کے بموجب دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس کا مقصد یہی تھا کہ موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا اور سزا کا حقیقی مشہد اگرچہ مجازات ومکافات کی آئندہ زندگی ہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض اعمال وافعال ایسے بھی ہیں جن کی سزا وجزا کا ظہور موجودہ زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے اور معاشی ذمہ داریوں کے متعلق اعمال وافعال بھی جیسا کہ قرآن کے حوالے سے مسلسل دکھاتا چلا آیا ہوں مجھے اسی قبیل کی چیزیں نظر آتی ہیں اسی بنیاد پر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ الرزق یا معیشت کے یہ دونوں پیمانے ابتلائی بھی ہیں اور ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مجازاتی ومکافاتی بھی ہوتے ہیں، اسی سلسلہ میں جو چیزیں لکھی جا چکی ہیں ان کو چھوڑیے تو آپ کو یہی نظر آئے گا، مثلاً قرآن کی آیت

فاما من اعطی واتقی
وصدق بالحسنی فسنیسره
للیسری۔

پس جس نے دیا اور ڈرا اور اچھی (اچھی باتوں کی) تصدیق کی، تو ہم جلد ہے کہ آسان بنائیں گے اس پر آسان زندگی کو

میں اعطاء (داد ودہش) جو تقویٰ اور الحسنیٰ کی تصدیق پر مبنی ہو، فرمایا گیا ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے لئے "الیسری" کو آسان کر دیا جائے۔ "یسری" (آسان زندگی) ایک عام اور مطلق لفظ ہے جو ہر قسم کی زندگی کو عام ہے، اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی گیا ہے کہ موجودہ زندگی ایسوں پر آسان کر دی جاتی ہے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ قرآنی آیات اور حدیثوں کے حوالے سے یہ بات جو گزر چکی ہے کہ مثلاً صدقے سے رزق بڑھتا ہے یا اسی قسم کی دوسری آسانیاں میسر آتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہے، بخاری کے حوالے سے میں نے کسی جگہ بتایا تھا کہ چٹان کے ڈھک جانے کی وجہ سے جو لوگ غار میں بند ہو گئے تھے، اپنے عمل کے وسیلے انھوں نے اسی زندگی میں نفع اٹھایا تھا یا باغ کی آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آب پاشی کے جو فوائد حاصل کرتا تھا، ان ساری روایتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ خیر وخیرات وصدقات وغیرہ کے نتیجے سے موجودہ زندگی میں بھی کسب والے کے لئے قدرت سہولت مہیا کرتی ہے یعنی یسری کو آسان کرتی ہے، اسی کے بالمقابل قرآن سے سورۂ نون میں باغ والوں کا جو مشہور تمثیلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ مسکینوں اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چاہا تھا کہ پھلوں کو صبح سویرے توڑ کر نکل جائیں، لیکن قبل اس کے کہ وہ باغ پہنچیں قدرت کی طرف سے ان کا باغ اور اس کے پھل برباد ہو چکے تھے تو اس قصے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نیکی کے بدلے کا ظہور اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح معاشی سرمایہ کی بربادی پر بدی اور بدنیتی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے احسن القصص (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام) حضرت والا کی مختلف

آزمائشوں کے تذکرے کے بعد جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ مصر نے خزائن الارض (زمین کی پیداواروں) کو ان کے سپرد کر کے سرزمین مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی تھی تو یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

وكذلك مكنا ليوسف في الارض
يتبوأ منها حيث يشاء۔

یوں ہی اقتدار بخشا ہم نے یوسف کو زمین (مصر) پر، ٹھکانہ بناتے تھے وہ (یوسف علیہ السلام) جہاں چاہتے تھے۔

حق تعالیٰ نے عمومی رنگ میں جو یہ اعلان کیا ہے:

نصيب برحمتنا من نشاء
ولا نضيع اجر المحسنين۔

پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جسے چاہتے ہیں اور نہیں ضائع کرتے ہیں ہم مزدوری ان لوگوں کی جو بھلائی کرنے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں اسی دولت وثروت اقتدار واختیار کو جو زمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مل گیا تھا، رحمتنا (یعنی ہماری رحمت اور مہربانی) کے لفظ سے اس کی تعبیر کی گئی، جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا ظہور کبھی دنیاوی دولت وثروت کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور آگے یہ فرما کر ہم محسنوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتے، اس سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دنیاوی نعمت وعزت جو مصر میں ملی تھی یہ ان کے احسانی اعمال وافعال کا بدلہ واجر تھا۔ خود یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک کا یہ فقرہ قرآن ہی کا جو منقول ہے یعنی مصر میں خدا نے ان پر جو نوازشیں فرمائیں اور ان کا بچھڑا ہوا خاندان وطن سے چل کر مصر میں ان کے پاس جب آ گیا تو آپ نے فرمایا:

قد من الله علينا انه
من يتق ويصبر فان الله
لا يضيع اجر المحسنين۔

ہم پر بڑا کرم کیا اللہ تعالیٰ نے جو ڈرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے احسانی اعمال وافعال کا صلہ ان آسانیوں اور سہولتوں کو قرار دے رہے تھے جو اس وقت ان کو مصر میں میسر آئی تھیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے اور یہی بات میرے اس مضمون کی سب سے زیادہ قابل توجہ بلکہ غالباً دل ہلا دینے والی بات ہے کہ الحیوۃ الدنیا کی یہی سہولتیں، یہی آسانیاں جنھیں ہم کسبی معیشت بھی کہہ سکتے ہیں، زندگی کی یہی شکل اقوام کے لئے بھی اور کہہ سکتا ہوں کہ افراد کے لئے بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی عصیان وتمرد کا قدرتی انتقام بھی اختیار کر لیتا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہی انتقام صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود دینے والے کا

بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک انتہائی شکل ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اسی عجیب وغریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو بچ نکالنے کے لئے جب پیغمبر اور رسل بھیجے جاتے ہیں تو ابتداءً انکار وسرکشی اختیار کرنے والوں کو ابتلا آت (جنگ وغیرہ کی سختیوں) اور افراد (قحط ووبا وغیرہ کی مصیبتوں) میں مبتلا کر کے جھنجھوڑا جاتا ہے لیکن جن کے دل سخت، سینے سیاہ ہوتے ہیں، وہ قدرت کی ان تنبیہوں کو مختلف تاویلوں کی راہ سے یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ تنبیہ نہیں ہے، بلکہ دنیا کے عام حوادث وواقعات ہیں، انسانی اخلاق وکردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے بہرحال ایک سے زائد مقامات پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لئے انہیں ڈھیل دی جاتی ہے، ڈھیل ہی نہیں بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں مثلاً سورۃ الانعام میں ہے،

فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا	جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن سے
علیهم ابواب کل شیء.	چوکائے گئے تھے وہ تو کھول دیا ہم نے
ان پر ہر چیز کے دروازے۔	

یا سورۃ الاعراف میں ہے،

ثم بدلنا مکان السیئة	پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی کو بدل دیا
الحسنة حتی عفوا.	تا اینکہ وہ لوگ خوب بڑھ گئے۔

وغیرہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ آسائیوں کے دروازے ان پر کھولے جاتے ہیں اور "کل شیء" یعنی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے ابواب و دروازے ان پر وا ہو جاتے ہیں، السیئة (برائیوں) کو الحسنة (بھلائیوں) سے بدل دیا جاتا ہے، گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی چلی جاتی ہے، وہ بڑھتے ہیں ابھر جاتے ہیں بڑھائے چلے جاتے ہیں، حتی عفوا کے یہی معنی ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی وعروج ارتقاء واعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد یہ فرمایا کہ جیسا کہ الانعام کی آیت کے آخر میں ہے،

حتی اذا فرحوا بما اوتوا	جب اترانے لگے اس چیز سے جو دیا گیا
اخذنا هم بغتة فاذا هم	ان کو تو پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک تب
مبلسون فقطع دابر القوم	وہ ایسی حالت میں رہ جاتے ہیں مایوس
الذین ظلموا والحمد لله	ہو کر، پس کاٹ دی گئی جڑ ان لوگوں
رب العالمین.	کی جنہوں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا

تھا، اور ستائش ہوگی صرف اللہ سارے جہان کے پالنے والے کی۔

یا الاعراف کی آیت کے آخر میں ہے،

حتی عفوا وقالوا قد مس	جب وہ بڑھ گئے تو بولے کہ ہمارے
اباءنا الضراء والسراء	گزشتہ نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ
فاخذنا هم بغتة وهم	نے چھوا تھا، پس پکڑ لیا ہم نے ان کو
لا یشعرون.	اچانک اس طور پر کہ ان کو خبر

بھی نہ ہوا۔

جس کا ماحصل یہی ہے کہ ان ساری ترقیوں اور اولو العزمیوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طور پر پکڑ لیتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تو ان کے آخری انجام کا حال ہے، لیکن سرکشی وطاغی اقوام کے ساتھ قدرت کا یہ انتقامی برتاؤ جو بظاہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ان لوگوں کے لئے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے، جنہیں انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب وغریب عبوری دور میں زندگی گزارنی پڑتی ہے اور جو حال اقوام کا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد کے ساتھ بھی قدرت کبھی اسی قسم کا سلوک کرتی ہے، یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو مزا وانتقاماً ان کی غفلتوں پر مزید غفلتوں پر تاکہ غفلتوں کا اضافہ ہوتا چلا جائے، مقصود تسلیل معیشت کی اس ٹولی کے ان حالات سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ اندھے بنائے جاتے ہیں اور دولت وثروت کی گولیاں ان کے کانوں میں اسی لئے ٹھونسی جاتی ہیں تاکہ بھلائی کی راہوں پر اب ان کی نظر نہ پڑے اور بھلائیوں کے سننے سے یہ بہرے بن جائیں، لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہی قدرت کے پیارے اور ان لوگوں میں ہیں جنہیں پیدا ہی کیا گیا ہے خدائی نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے، قرآن میں ایسی آیتیں مثلاً

فلا تعجبک اموالهم ولا اولادهم	پس حیرت میں نہ ڈالے تجھے ان کا مال
انما یرید الله لیعذبهم	اور ان کی اولاد اس کے سوا اور کوئی
بها فی الحیوة الدنیا وتزهق	دوسری بات نہیں ہے کہ خدا چاہتا ہے
انفسهم وهم کافرون.	کہ ان کو عذاب دے انہی چیزوں

سے (یعنی اموال واولاد کی کثرت سے) اس پست زندگی میں، اور فرسودہ ہو کر نکلے ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے ہیں۔

تسلیل معیشت کی اسی مثالی قالب کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے، صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ "اموال" اور "اولاد" کی یہ وہی قسم ہے جس سے قدرت ان لوگوں کی سزا کرتی ہے اور اس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں بدن سے ان کی جان فرسودہ ہو کر نکل جائے، اس طور پر نکل جائے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا پھر ان کو موقعہ نہ ملے۔

پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ "خود آگاہی" کے اسی نفسیاتی قانون کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ	بلکہ آدمی اپنے نفس کے حالات سے
ولو القی معاذیرہ۔	خود واقف ہے اگرچہ اس پر (اپنے)
(القیامۃ)	عذروں کا (پردہ) ہی کیوں نہ ڈالے۔

پس ان لوگوں کو جو سبیل چلاتے ہیں رزق پا رہے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ خدا اور رسول کی مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ اگر ایسا حال ہے کہ جس حد تک خدا کی مرضیات سے وہ ٹکراتے ہیں، اسی حد تک معیشت کے اس سبیل پیمانے میں کشادگی پیدا ہوتی جاتی ہے، تمرد اور سرکشی کے میدان میں ان کا قدم جتنا آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے اسی حد تک دنیا اور دنیا کی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی چلی جاتی ہیں تو ایسی حالت میں (العیاذ باللہ) انھیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ سبیل نعمت و معیشت کی یہ ڈوری ان کے سر پر اسی لئے ڈھیلی کی گئی ہے تاکہ وہ اسی میں الجھ کر چلیں اور اسی میں پھنسے ہوئے وہ مر جائیں۔ "الاموال" اور "الاولاد" کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور ایسا انتقام کہ بچنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں، خدا نخواستہ باوجود مسلم و مومن ہونے کے کوئی سزا کے اس حال میں اگر گرفتار ہو گیا ہو تو چاہیے کہ آیت کریمہ قرآنیہ

ولا تعجبک اموالہم واولادہم	اور حیرت میں نہ ڈالیں تجھے ان کے اموال
انما یرید اللہ ان یعذبہم	اور اولاد، اس کے سوا اور کوئی بات نہیں
بہا فی الدنیا وتزہق انفسہم	ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ سزا دے ان کو
وہم کافرون۔	انہی (اموال و اولاد سے) اور مریں وہ

جو کہ نکلے ان کی جان اس حال میں وہ ناشکرے تھے۔

کے ورد میں مشغول ہو۔ یہ اسی قسم کا معاملہ ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ایک نووارد کابلی بیچارہ چونکہ یہاں کی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے حلوائی کی دوکان سے مٹھائی اٹھا کر قیمت ادا کئے بغیر کھا گیا، پولیس نے گرفتار کر کے اس کی سزا یہ تجویز کی کہ سر منڈا کر گدھے پر سوار کر کے اسے شہر بدر کر دیا جائے، یہی کیا گیا، شہر کے ڈھیٹ لڑکے گدھے پر سوار اس کابلی کے پیچھے تالیاں پیٹتے جاتے تھے، اسی شکل میں وہ شہر سے باہر ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب کابلی اپنے وطن پہنچا، پوچھنے والوں نے پوچھا، "آغا! در ہندوستان رفتہ بودی، چہ دیدی؟" جواب میں اس نے جو بات کہی اس سے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے قرآن کی مذکورہ بالا آیت کے سمجھانے میں ایک دفعہ مدد حاصل کی تھی، کابلی نے جواب میں اپنے ارباب وطن کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی،

"ہندوستان خوب ملک است، حلوا خوردن مفت ست، و سر تراشیدن مفت ست، سواری خر مفت است، دف زدن طفلان مفت ست، ہندوستان خوب ملک است۔"

قوموں کی حد تک تو شاید سبیل معیشت کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچاننے والے بآسانی پہچان نہیں سکتے، آخر دنیا کی ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسولوں کی تعلیم کی بغاوت صرف بغاوت پر مبنی ہو، لیکن اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دولتیں لا رہی ہو جن میں دیکھا جا رہا ہو کہ کسی نہ کسی چیز کا دروازہ ان پر کھل گیا، اپنی ان ہی طغیانیوں میں وہ جس حد تک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اسی حد تک ابواب کل شیء (ہر چیز کے دروازوں) کے کھلنے کا سلسلہ بھی زور باندھتا چلا جا رہا ہو، ایسیوں کے متعلق ان لوگوں کی منطق جو خدا اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں، مذاہب و دیانات کے نظام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ اور خود بافتہ نظام نہیں سمجھتے، بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی ادارہ ہوتی دستور ان کے نزدیک مذہب ہے، ان کی منطق اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ایسی بات جس کے سوا کوئی دوسری بات کہی ہی نہیں جا سکتی، اگر قرآن وہی سمجھا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کے کسی ایسے مسئلے کے سمجھنے میں کسی کو کیا دشواری پیش آ سکتی ہے۔ البتہ اگر دشواری کچھ ہے تو ان کے لئے ہے یعنی مسکینوں، عقل کے مسکینوں کا جو طبقہ ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے اس کے رسولوں کو بھی مانتا ہے، لیکن اللہ کے باغیوں اور رسولوں کے دشمنوں پر ابواب کل شیء کے فتح کا جو استثنائی سلسلہ شروع ہوا ہے اور ان کی السیئۃ (بری حالت) جب الحسنۃ (بھلی حالتوں) سے بدل گئی تو اس انتقام کو وہ انعام اور اس سزا کو وہ باور کرنے لگے کہ یہ ان کے عمل کی جزا اور ان کے کرتوتوں کا یہ صلہ ہے اس قسم کے دماغوں کی ذہنی دستوں کے سمجھنے سے کم از کم میں تو قطعاً قاصر ہوں، یہ ہو سکتا تھا کہ ان باغیوں کے ساتھ وہ بھی مذہب سے بغاوت کا اعلان کر دیتے، جیسے وہ مرتد ہیں اور ارتداد کے اس اصول کو یہ بھی تسلیم کر لیتے تو جو کچھ کہا جا رہا ہے اگر اس وقت کہتے تو خیر اس کی گنجائش تھی، لیکن جس تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہو چلا ہے، تو اس کی توجیہ سے قطعاً عاجز ہوں اور دینے کے اس عجیب و غریب گروہ سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جہاں تک میں جانتا ہوں عموماً مسلمانوں میں لوگ یہی مان بھی رہے ہیں جو قرآن ان سے منوانا چاہتا ہے یا رہے سے انھوں نے بھی مذہب اور مذہبی زندگی کی واقعیت اور تیر چیزی کا اسی طرح انکار کر دیا ہے جیسے خود اس قسم کی سزا یافتہ قومیں اس کی منکر اور اس اصول سے باغی ہیں، لگڑنے کی زحمت ان کی ہے جو مذہب ہی سے منحرف ہو کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور اسی فیصلے سے وہ مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ باغی مذہب سے باغی، اقوام کا یہ حال قدرت کا انتقام اور قدرتی عذاب ہی کی ایک شکل ہے۔

بہرحال قوموں کی حد تک جیسا کہ میں نے عرض کیا کم از کم میرے نزدیک اس مسئلہ میں کوئی دشواری نہیں ہے، البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے، لیکن اس میں بھی دشواری جو کچھ ہے وہ دوسروں کے اعتبار سے ہے، یعنی دوسروں کو دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں وہ دوسروں کو باہر سے دیکھتے ہیں لیکن خود اپنے حالات و خیالات، اعمال و افعال ظاہر ہے کہ دوسروں پر نہیں تو خود اپنے آپ پر تو

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تحقیر و توہین بے عزتی و رسوائی کے ساتھ معاشی لعنتوں کو
جیسے اس جاہلی کابلی کی ذہنیت نے اپنے اعزاز و اکرام کا ذریعہ باور کر لیا تھا، اسی طرح بسلی نعمت رکھنے والوں کا
باطنی گروہ بھی آج اپنی سزا کو جزا اور قدرت کے انتقام کو انعام سمجھ رہا ہے، لیکن حقیقت کی پیش گاہ میں
پہنچ کر اس پر واضح ہوگا کہ ان میں ایک چیز بھی منفعت نہ تھی، جیسے مغالطہ خوردہ کابلی کی طرح اس نے
منفعت سمجھ لیا تھا، ایسی سزا جو مسلسل دوسرے سزاؤں کی سزا یافتوں کو مستحق بناتی چلی جاتی ہو، سزا کی
عام قسموں میں بدترین سزا ہو سکتی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین منہا۔

لیکن بسلی پیمانہ پر رزق پانے والوں کا حال اگر یہ نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ابتلائی لعنت
ہوگی یا ابتلائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت بھی ہوگی، خصوصاً بسلی معیشت کی ذمہ داریوں کی
تکمیل کی راہ میں اگر اس کی وجہ سے رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوتی چلی جائے، تو یقیناً یہ نشانی
ہے اس بات کی کہ اس کی یہ بسلی معیشت و امارت و ریاست و دولت سراسر رحمت ہے، یہی حال
جس کی نشان دہی حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کی زندگیوں میں قرآن مجید
نے کی ہے، وہی مصر جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کی سبب بنتی رہی، اور آج تک
اس کا یہی حال ہے، لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو
خدا کا یہ بندہ دینے والے کے قدموں پر سر جھکا کر ان لفظوں میں تذکرہ کرتا ہے،

رب قد آتیتنی من الملک	میرے مالک! مجھے آپ نے ملک و حکومت
وعلمتنی من تاویل الاحادیث	عطا کی اور باتوں کو ٹھیک ان کے ٹھکانے پر
فاطر السموات والارض	پہنچانے کا سلیقہ عطا کیا، آپ ہی ہیں آسمانوں
انت ولی فی الدنیا والآخرۃ	کے پیدا کرنے والے اور زمین کے، آپ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین	ہماری پشت پناہ، اور والی ہیں دنیا میں

بھی اور آخرت میں بھی، اٹھائیے گا دنیا سے اپنے مسلمان اور ملا دیجئے گا
بھلے نیکوں سے۔

اور یہی چیزیں آپ کو داؤد و سلیمان علیہما السلام کے تذکروں میں نظر آئے گی جن کا ایک حصہ قرآن میں
محفوظ ہو گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دینی دعوت[1] کو بنی آدم کے لئے آخری صورت میں دعوت بنانے کے لئے
ابتدا ہی سے سیاسی قوت کا زور جب اس کی بنیادوں میں بھر گیا اور اس کی وجہ سے بیچوں کو بسلی
معیشت گذارنے کا موقع تاریخ کا میں مسلسل ملتا رہا، تو صرف ابتدا ہی میں نہیں، بلکہ زمانے کے مختلف
ادوار و قرنوں میں ایسی ہستیاں معرض شہود پر برابر آتی رہیں، جن کی بسلی معیشت ان کے لئے رحمت
بنی رہی، اس کے لئے تاریخ اسلام کی ورق گردانی کی ضرورت ہے، میرے لئے یہاں اس کی تفصیل کا

---

[1] مراد اسلام کی اس دعوت سے ہے جسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو سب سے آخر میں دی گئی ۱۲

موقع نہیں، بلکہ قرآن کی سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تمثیلی قصہ کا ذکر ہے، میرے نزدیک اس
قصہ کے متعلق یہ سوال کہ ذوالقرنین کون شخص تھے، کہاں کے تھے، کب تھے، بجائے ان غیر ضروری امور کی تحقیق کے
اگر سوچا جاتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول و عرض پر اقتدار بخشا گیا کہ
گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک وہ پہنچ گئی تھی، اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کو حکومت
بخشی گئی تھی جن کی بولی کو ان کی زبان سے کوئی مناسبت نہ تھی، اور وہ لوہے کی اینٹیں بنا بنا کر بجائے
گارے کے رانگا کو پگھلا کر ان ہی اینٹوں کو ان سے جوڑ کر دیوار بناتے تھے، جس کے یہی معنی ہوئے
کہ ایسے ایجادات و اختراعات پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی جسے سائنس و کیمیا کے اس عہد میں بھی
حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائنٹیفک
دیوار کی تعمیر سے جب وہ فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر و ناز، تبختر و غرور کے جس میں عموماً ان حالتوں
میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، اسی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بندگی اور دینے والے کی
خدائی کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا

ھذا رحمۃ من ربی	یہ ہے میرے مالک کی مہربانی، پھر جب
فاذا جاء وعد ربی	آئے گا فرمان میرے مالک کا تو
جعلہ دکاء وکان وعد	ہو جائے گی یہ ٹکڑے ٹکڑے اور ہے
ربی حقا۔	وعدہ میرے مالک کا سچا۔

حالانکہ اسی کے بالمقابل اسی سورۃ میں اس شخص کی دماغی کیفیت سے جو باغ اور ان کے درمیان
کھیتیاں وغیرہ دی گئی تھیں اور درمیان میں بہنے والی نہروں سے جن کی سیرابی ہوتی تھی وہ اپنے باغ
میں داخل ہونے کے بعد بڑبڑاتا تھا تو یہ بڑبڑاتا تھا،

ما اظن ان تبید ھذہ ابدا	میں نہیں خیال کرتا ہوں کہ یہ باغ کبھی

بھی برباد ہو سکتے ہیں۔

بسلی معیشت اور اس کی مختلف شکلوں کو جیسے ان شکلوں کے خصوصیات و علامات سے پہچانا جا سکتا ہے
قدری معیشت میں بھی اسی قاعدے سے ہم کام لے سکتے ہیں، یعنی دوسروں کو نہ اندازہ ہو سکے یا نہ ہو سکے
لیکن جن پر گذرتی ہے وہ چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی معیشت کا قدری پیمانہ خدا نخواستہ دینے والے
کے ساتھ کسی شوخی اور گستاخی کا نتیجہ تو نہیں ہے، وہی قرآن کی سورۂ نون میں اور
سورۂ کہف کے قصہ یعنی باغ والوں کے باغ پر جو تباہی آئی تھی اور ان کی بسلی معیشت نے اچانک
قدری رنگ جو اختیار کر لیا تھا، یعنی قدری معیشت کی وہ مثالی شکل تھی، سورۂ کہف میں بھی ہے کہ
باغ کی تباہی و بربادی کے بعد وہی گستاخ آمیز خود اپنے اندر یہ احساس رکھتا تھا اور اس احساس کا
اظہار ان الفاظ میں کرتا تھا، قرآن ہی میں وہ منقول ہیں،

واحیط بثمرہ فاصبح یقلب کفیہ	احاطہ کر لیا گیا اس کے باغ کی پیداوار کا

عَلٰی مَا اَنْفَقَ فِیْهَا وَهِیَ خَاوِیَةٌ — (یعنی تباہ کردی گئیں) تو وہ ہاتھ ملتا
عَلٰی عُرُوْشِهَا وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ — ہتھیلیوں کو ان مصارف کو یاد کرکے جو
لَمْ اُشْرِکْ بِرَبِّیْ اَحَدًا۔ — باغ میں اس نے خرچ کئے تھے اور باغ
جیسے وہ اپنی ٹٹیوں اور چھتوں پر اوندھے پڑے تھے، کہتا تھا کہ اے کاش میں اپنے
رب کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بناتا۔

اسی طرح سورۂ ن میں جن باغ والوں کا ذکر ہے، باغ کی تباہی اور اس کے متعلق بھائیوں میں جو گفتگو ہوئی اس کو نقل کرنے کے بعد خود ان ہی کی زبانوں سے قرآن نے اعتراف جرم کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ — پھر ان میں بعض بعض کی طرف ملامت
یَّتَلَاوَمُوْنَ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ — کرتے ہوئے متوجہ ہوئے اور بولے کہ
اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ۔ — افسوس ہے ہم پر ہم ہی لوگ سرکش تھے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر گذرتی ہے وہ قدرتی معیشت کی اس انتقامی اور عتابی شکل کو خود پہچان لیتے ہیں اور ہوتا بھی ہے قدرتی معیشت کی اس شکل کا ظہور کچھ ایسے طریقے سے کہ گرفت کے شعور کو دبانا مبتلا ہونے والوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا ہے، حدیث بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا جو قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری و مسلم کی جیسی صحیح حدیثوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جس میں

لہ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کا جو قصہ قرآن میں اوپر بیان کیا گیا ہے، اس میں کوئی جز ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ شرک کا ارتکاب اس عام معنی کے لحاظ سے کیا تھا جسے عموماً لوگ شرک سمجھتے ہیں یعنی خالق کے ساتھ کسی مخلوق کو اس نے اپنا معبود بنا لیا تھا اور خدا کے ساتھ خدا کی کسی مخلوق کو بھی وہ پوجتا تھا پھر سوال یہی ہے کہ شرک فی الاخیر اپنے مالک کے ساتھ میں کسی کو شریک نہ بناتا ان الفاظ سے وہ اپنے کس جرم کی طرف اشارہ کر رہا تھا، بات وہی ہے کہ شرک کی یہ تو بالکل کھلی ہوئی اور بھدی شکل ہے جسے عام حالات میں لوگ شرک سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ اس شرک میں وہ مبتلا نہ ہوا ہو لیکن باغ میں داخل ہونے کے بعد اس کا یہ دعویٰ کہ ایسا باغ اور اس کی کاشت کبھی تباہ نہیں ہو سکتے، دراصل یہ ان اسباب اور باغبانی و کاشت کاری کے ان سامانوں کی طرف اشارہ تھا جن پر اعتماد کرکے مستقبل کے متعلق اتنا بڑا بول وہ بول رہا تھا اور اپنی پیداوار کی وہ افزائش و فراوانی، چستی و چالاکی، اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں کا نتیجہ یقین کرتا تھا جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ خدا کے ساتھ معیشت کے ان مظاہر کی فراہمی میں وہ خود اپنے آپ کو بھی شریک کر رہا تھا اور اس کا یہی دعویٰ شرک کا دعویٰ تھا خود اس کو بھی اس کا احساس تھا، اسی شرک کا دعویٰ کے جرم میں وہ پکڑا گیا اور اس کی اصلی معیشت قدرتی معیشت سے بدل گئی ہے۔ افسوس اکثر مدعی ہونے کے باوجود شرک کے اس خطرناک قرآنی جرم کی مسلمان بھی پروا نہیں کرتے ۱۲

ایک اندھا، ایک برص والا اور ایک گنجا تھا، تینوں کے امراض کا ازالہ بھی کیا گیا، اور غربت و افلاس کی جس قدرتی معیشت میں وہ گرفتار تھے ان سے بھی نجات عطا کی گئی اور جس قسم کا مال جو چاہتا تھا ہر ایک کو دیا گیا، بیان کیا گیا ہے کہ پھر ان میں ہر ایک کے پاس اسی شکل میں جس شکل میں وہ پہلے تھے فقیر کا بھیس بنا کر خدا کا فرشتہ آیا، یعنی اندھے کے پاس اندھا، برص والے کے پاس برص، گنجے کے پاس گنجے کی شکل بنا کر فرشتہ آیا اور ان میں ہر ایک سے اس نے دستگیری کی التجا کی، جس کے جواب میں دو نے (یعنی برص والے اور گنجے نے) تو جواب میں وہی بات کہی جو عموماً مانگنے والوں کو نہ دینے والا عموماً ایسے مواقع میں کہا کرتا ہے، یعنی دونوں نے کہا

اَلْحُقُوْقُ کَثِیْرَةٌ۔ — مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں (تمہیں
کہاں سے دوں)

روایت میں ہے کہ تب مانگنے والے نے برص والے سے کہا

کَاَنِّیْ اَعْرِفُکَ اَلَمْ تَکُنْ — غالباً میں تجھے پہچانتا ہوں کیا تو وہی کوڑھی
اَبْرَصَ یَقْذَرُکَ النَّاسُ — آدمی نہ تھا کہ گھن آتی تھی لوگوں کو تجھ
فَقِیْرًا فَاَعْطَاکَ اللّٰهُ۔ — سے اور تو تو ایک تنگدست تھا پھر دیا
اللہ تعالیٰ نے تجھے۔

اور یہی بات اس نے گنجے کو بھی یاد دلائی، لیکن کہ دونوں نے جواب میں کہا تھا

اِنَّمَا وَرِثْتُ هٰذَا الْمَالَ — نہیں، یہ دولت و ثروت تو مجھے اپنے
کَابِرًا عَنْ کَابِرٍ — بڑوں سے ملی اور بڑوں کو بڑوں سے
(یعنی پشتینی دولت ہے)

حدیث میں ہے کہ تب فرشتے نے دونوں کو یہ بددعا دی کہ

اِنْ کُنْتَ کَاذِبًا فَصَیَّرَکَ اللّٰهُ — اگر تو جھوٹا ہے تو جیسا تھا ویسا ہی ہو جائیگا
اِلٰی مَا کُنْتَ۔ — (روایت میں ہے کہ وہی ہو گیا)

اور یہی مجھے کہنا تھا کہ ایسے مواقع پر اگر ان دونوں کی اصلی معیشت قدرتی معیشت سے بدل گئی تو کھلی ہوئی دلیل ہوگی اس بات کی کہ اس کی قدرتی معیشت قدرت کے انتقام اور عتاب کی شکل تھی۔ بلکہ کہنا تو یہ ہے کہ معیشت کا اصلی رنگ دماغوں میں کبر و غرور کے بخار سے پیدا کرکے اگر ایسوں کو طغیانی اور سرکشی پر آمادہ کرے تو چنداں تعجب خیز نہیں ہے، قوت کا احساس اور اقتدار و اختیار کے دائرہ کی وسعت قدرتاً دلوں میں فرح و استکبار کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے اترانے اور اکڑتے ہوئے اگر ان کو دیکھا جائے تو حالات کے لحاظ سے یہ بعید نہیں لیکن قدرتی بھاگے پر روزی پانے والوں کو بھی جب ان حالات میں مبتلا پایا جائے تو یقیناً بغاوت کی یہ کیفیت اس کی دلیل ہوگی کہ ایسوں کی قدرتی معیشت اسی قسم کی قدرتی سزا ہے جو زیادہ تر

دوسری سزاؤں کی مستحق بنائی چلی جاتی ہے، وہی بدحال بسلی معیشت کی سزائی قالب کا تھا۔ سمجھنا چاہیے کہ قدری معیشت کی یہ حالت بھی سزا ہی کا ایک قالب ہے، ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے قیامت کے دن جن سے حق تعالیٰ نہ خطاب فرمائیں گے اور نہ ان کا تزکیہ کیا جائے گا اور حق تعالیٰ کی نظر شفقت وکرم سے جو محروم رہیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ وہ حسب ذیل لوگ ہوں گے،

شیخ زان وملک کذاب	بڈھا زانی، جھوٹا بادشاہ، اور محتاج
وعائل مستکبر۔	اکڑفوں دکھلانے والا۔

مطلب حدیث کا یہی ہے کہ گناہ یوں تو بجائے خود گناہ ہی ہے، لیکن ایسوں سے اسی گناہ کا صدور جن سے اس گناہ کی توقع نہ ہو، ان کے گناہ کی شدت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے، اس وقت مجھے دوسروں سے بحث نہیں، بلکہ بتانا یہ ہے کہ امیری ہی نہیں، بلکہ کبھی کبھی غریبی بھی سزا کی بدترین شکل ہوتی ہے اور یہ وہی غریبی ہے جس کی طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے

عائل مستکبر۔	محتاج اکڑفوں دکھلانے والا۔

کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، لیکن جیسے کہ قدری معیشت ان حالات سے دوچار ہوتی ہے، عام حالات میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو ہ امتحان ہی کی ایک شکل اسی طریقہ سے ہے، جیسے عام حالات میں معیشت کا بسلی رنگ بھی عموماً ابتلاء اور امتحان ہی کا ایک قدرتی اسلوب ہے، البتہ قدری معیشت کا ایک پاکیزہ ترین قدری رنگ وہ ہے جس سے سرفرازی کا استحقاق ہر بوالہوس کی قسمت میں نہیں ہوتا اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ معیشت کے اس قدری رنگ کو اختیار کرنے والے مختلف اغراض و وجوہ سے خود اختیار کرتے ہیں، سید الانبیاء والرسل علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی طرف

الفقر فخری۔	فقر ہی میرے لئے باعث فخر ہے۔

کے جس فقرہ کو منسوب کیا جاتا ہے محدثانہ تنقید کے معیار پر ممکن ہے کہ ان الفاظ کے انتساب کی صحت میں شک کیا جائے لیکن پیغمبر اور پیغمبر کے گھرانے کی زندگی بلکہ پیغمبر کے جانشینوں نے عملاً معیشت کے جس نقشہ کو دنیا میں پیش کیا، سب سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے جو مذکورہ بالا فقرہ کا مفاد ہے، بلکہ صحاح کی ایسی حدیثیں مثلاً

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میرے سامنے مکہ کی سنگریزوں والی زمین
عرض علی ربی لیجعل لی بطحاء مکۃ	پیش کی گئی کہ اسے سونا بنا دیا جائے تو میں نے
ذھبا فقلت لا یا رب ولکن اشبع	عرض کیا نہیں میرے رب! میں ایک دن
یوما واجوع یوما فاذا جعت	سیر ہوں اور ایک دن بھوکا رہوں اس لیے
تضرعت الیک وذکرتک واذا شبعت	چاہتا ہوں کہ جب بھوکا رہوں تو گڑگڑاؤں
حمدتک وشکرتک۔	آپ کے آگے اور یاد کروں آپ کو اور جب
(رواہ الترمذی واحمد وابن ماجہ، مشکوٰۃ)	سیر ہوں تو شکر کروں آپ کا۔

اور اس حدیث میں تو صرف بسلی معیشت سے ہی انکار فرمایا گیا ہے۔ اسی مشکوٰۃ میں ترمذی اور بیہقی وغیرہ کے حوالے سے یہ مشہور حدیث بھی مروی ہے، جس میں قدری معیشت کی اپنے لئے پیغمبر نے دعا فرمائی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ	حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
وسلم قال اللھم احینی	صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے کہ
مسکینا وامتنی مسکینا	الٰہی مجھے مسکین ہی زندہ رکھئے اور مسکین ہی
واحشرنی فی زمرۃ المساکین	موت دیجئے اور (قیامت کے دن)
	اٹھائیے مسکینوں کے گروہ میں،

صرف اپنے لئے بلکہ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ اپنے گھرانے اور آل کے لئے بھی آپ یہی دعا فرماتے تھے۔

اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا	اے پروردگار محمد کے گھرانے والوں کو
	روزی صرف قوت (یعنی خوراک بھر دیجئے)

اور قدری معیشت کا یہ وہ قالب ہے جس کی روح تک نہ ہر شخص کی نظر پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کوتاہ آستینوں کا وہ گروہ کر سکتا ہے جس کے تنگ سینوں، تنگ نگاہوں میں انسانی زندگی کی وہ وسعتیں سما سکتی ہیں جن کے اندر کائنات کا موجودہ محسوس نظام اور جو کچھ اس میں ہے چند حقیر تنکوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہائے! ترمذی کی مشہور حدیث جس میں اللہ تعالیٰ نے (پیغمبر) سے فرمایا،

اغبط اولیائی عندی لمؤمن	قابل رشک دوست میرا وہ مومن
خفیف الحاذ ذو حظ من	بندہ ہے جو کم آمدنی قلیل المعاش ہے
الصلوٰۃ احسن عبادۃ	لیکن نماز میں اسے حصہ ملا ہے
ربہ واطاعہ فی السر	رب کی پوجا خوبصورتی سے کرتا ہے
وکان غامضا فی الناس	اور خلا (یعنی) پوشیدہ حالات
لا یشار الیہ بالاصابع	میں اس کی اطاعت کرتا ہے اور لوگوں
وکان رزقہ کفافا	میں گم شدہ رہا (یعنی اپنے آپ کو
فصبر علی ذلک۔	نمایاں نہ کیا) اس کی طرف انگلیاں

نہیں اٹھائی جاتیں، روزی اس کی بس ضرورت کے مطابق ہے اور اس پر صبر کئے رہا۔

اس کے بعد مشکوٰۃ ہی میں رسول کو تلاش کرنے والوں کو اپنا پتہ بتلاتے ہوئے بھی فرماتے۔

ابغونی فی ضعفائکم	ڈھونڈا کرو مجھے ضعیفوں اور کمزوروں
(ابوداؤد)	یعنی غریبوں میں،

آخر میں اسی خفیف الحاذ (کم ایپر سامان) والے مومن کی طرف اپنی مبارک انگلیوں سے اشارہ فرماتے ہوئے کہ بے چارہ کچھ دن دنیا میں جیا اور پھر آہ کر

عجلت منیتہ قلت بواکیہ — پھر جلدی آگئی موت اس کی، بہت کم
قل تراثہ۔ — تھیں اس پر رونے والیاں، ترکہ بھی
چھوڑا اس نے کم ہی۔

قابل رشک زندگی کے اس بلند مینارے پر وہی قدم جما سکتا ہے جس پر آدم اور آدم کی اولاد کی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہو کہ

ظاہر شش رنگ آرد بیرنگ — باطنش باشد میان ہفت چرخ

دیکھا ہے کہ سکتا ہے اور اسی نے کہا بھی؛

مالی وللدنیا ما انا والدنیا — میرا اور دنیا سے کیا تعلق، میرا حال اور
الا کراکب استظل تحت — دنیا کا حال تو ایسا ہے جیسے ایک سوار
شجرۃ ثم راح وترکھا — جو چھاؤں میں کھڑا ہوا کسی درخت کے
(الترمذی جامع) — پھر درخت اور اس کی چھاؤں کو چھوڑ کر چل دیا۔

صدق مولنا العزیز۔

ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان — اور پچھلا گھر ہی ہے زندگی کا گھر۔

العبد الاحقر الفانی
السید مناظر احسن گیلانی غفر اللہ ولمن رباہ
گیلانی (بہار) مرکز الہدایت والارشاد حرسہا [illegible]

تاریخ اختتام مسودہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ ۱۷ مئی ۱۹۴۳ء ۱ تیر ۱۳۵۲ف روز چہار شنبہ
تاریخ اختتام مبیضہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ ۹ ستمبر ۱۹۴۳ء یکم آبان ۱۳۵۲ف روز پنجشنبہ

اسلامی معاشیات
کے
قانونی ابواب

اس وقت تک آپ کے سامنے اسلام کے معاشی تحقیقات جو زیادہ تر قرآن مجید کی آیات ہی سے ماخوذ ہیں پہلی جلد کی شکل میں پیش ہوئے ہیں۔ اب ان ہی تحقیقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام میں جو قوانین نافذ کئے ہیں فقہ اسلام نے قرآن اور سنت کی روشنی میں جن کو پیدا کیا ہے ان کی تفصیل اس حصہ میں آپ کو ملے گی۔

مناظر احسن گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات

حصہ دوم

قانونی ابواب

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اس وقت تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہو لیں، ان ہی چار گانہ سوالات میں ایک بڑا اہم سوال یہ بھی ہوگا کہ

عن مالہ من این اکتسبہ	آدمی سے پوچھا جائے گا اپنے مال کے
وفیم انفقہ۔	یعنی اس مال کو کن ذرائع سے اس نے

حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

کہا جائے تو معاشیات کے قانونی یا فقہی مسائل کا تعلق ان ہی دو باتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں خیال کیجئے کہ دولت کے دخل و خرچ کے متعلق اسلام نے مسلمانوں کو جو عملی ضابطہ دیا ہے، اب آپ کے سامنے اس کی تفصیل پیش ہوگی، دولت عباسیہ کے پہلے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف نے بھی اپنی سیاسی و معاشی کتاب "کتاب الخراج" جو خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش سے لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی قاضی صاحب نے تمہید کلام میں اسی حدیث کو اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اس معاشی ضابطہ کے اساسی قوانین کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام رحمہم اللہ اجمعین نے جزئیات کے متعلق دفتر کے دفتر جو تیار کر دیئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس مختصری کتاب میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے

تاہم میں کوشش کروں گا کہ ایک خاص ترتیب سے اس سلسلے کے اہم مسائل کو اپنی اپنی جگہ پر درج کر دوں، ہو سکتا ہے کہ راہ بن جانے کے بعد آئندہ کام کرنے والے اس پر اضافہ کریں۔

معاشیات کے دو اسکول

پہلا اسکول واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ اور تجربے کے سوا خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا گیا ہے جو مالیات یا تحصیل دولت و صرف دولت دونوں کو ہر قسم کی اخلاقی و مذہبی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے کمانا چاہیے خواہ کسی ذریعہ سے ہو، اڑانا چاہیے خواہ خرچ کی جو راہیں بھی ہوں۔

اس سلسلہ میں یہاں تک دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ جن کی زندگی بظاہر دینی اور شرعی ہوتی ہے، یعنی نماز، روزہ، درود وظائف، حج و قربانی ان تمام امور کے وہ پابند ہوتے ہیں، لیکن یہی لوگ جو اس قسم کی مذہبی پابندیوں کو اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں، مالیات کے مسئلہ میں ہر قسم کی بے قیدیوں کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کرتے ہیں، اس مکتب خیال یا مسلک کا تذکرہ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ذکر میں کیا ہے، یعنی حضرت شعیب نے جب ان پر معاشی قوانین کی پابندیوں کو عائد کرنا چاہا تو ان کو جواب دیا گیا کہ

قالوا یا شعیب اصلوتک	انہوں نے کہا شعیب! کیا تمہاری نماز یہ
تامرک ان نترک ما یعبد	حکم کرتی ہے کہ جن معبودوں کو ہمارے
اٰباؤنا او ان نفعل فی اموالنا	باپ دادا پوجتے تھے انہیں ہم چھوڑ دیں
ما نشاء۔ (سورۂ ہود ع ۹)	اور یہ کہ ہم اپنے اموال (دولت) کے متعلق

جو چاہیں کریں (اس میں وہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے)

صرف یہی نہیں بلکہ قوم شعیب کے معاشی ماہرین نے ان کے طرز عمل پر اظہار تعجب کیا اور ان کی عقل و فہم جس کا ایک مدت سے تجربہ تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان روشن خیالوں نے طنز کے لہجہ میں کہا کہ

انک لانت الحلیم الرشید	تم تو بڑے بھاری بردبار باوقار سمجھدار
(سورۂ ہود)	کے آدمی ہو۔

بہر حال معاشیات کا یہ تو ایک آزاد مکتب خیال ہے تحصیل دولت کے ذرائع پر یہ ظاہر ان کے نزدیک کسی قسم کی قید عائد کرنا سوجھ بوجھ عقل و دانائی کے خلاف ہے بلکہ جس کو جس وقت جس ذریعہ سے بھی حصول دولت کا موقع ملے بدعقلی ہوگی کہ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے یا روپیہ رکھتے ہوئے اپنی خواہش خواہ جس بات کی ہو آدمی پوری نہ کرے۔ قرآن نے جن الفاظ میں ان کے اس معاشی نظریہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب جو عموماً لوگوں کے خیال میں پوجا پاٹ یا صلوٰۃ میں منحصر ہے۔ معاشی کاروبار میں اس کی دخل اندازیوں کو وہ ناپسند

کرتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کہا کہ تمہاری نمازیں کیا اس سے بھی روک سکتی ہیں کہ ہم اپنے اموال کے متعلق جو چاہیں کریں۔

دوسرا مکتب خیال اس کے مقابلہ میں معاشیات ہی کا ایک دوسرا اسکول بھی ہے جو دوسرے پہلوؤں کی طرح انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو بھی چند خاص حدود میں رکھنا چاہتا ہے، یعنی وہی بات جو حدیث میں آئی کہ من این اکتسبہ وفیما انفقہ (کہاں سے کمایا اور کس راہ میں خرچ کیا) دونوں پر نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے، تقریباً ہر زمانے میں اس طبقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ عملی طور پر خواہ اس اصول کے ماننے والوں کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو، لیکن نظری حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو اکثریت کم از کم زبان سے اس نگرانی کی ہمیشہ حامی رہی ہے۔ اسی لئے چوری، ڈاکہ، رشوت، خیانت، دھوکا وغیرہ ذرائع کسب کو اچھی سوسائٹیوں میں ہمیشہ بری نظروں سے دیکھا گیا ہے، خصوصاً اسی بنا پر دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک میں حد بندی عائد کرنے والے معاشی قوانین پائے جاتے ہیں، اسلام کا تعلق بھی ثانی الذکر طبقہ سے ہے اور اس وقت میں انھیں پابندیوں کی کلی حیثیت سے تفصیل کرنا چاہتا ہوں جو ان دونوں امور یعنی من این اکتسبہ یا دوسرے لفظوں میں "دخل" اور فیما انفقہ یا "خرچ" پر اسلام نے عائد کئے ہیں، دونوں سوالوں پر دو مستقل عنوانوں کے نیچے بحث کی جائے گی۔

دخل

دخل یعنی مال و دولت کے کمانے اور ان سے استفادہ کے ذرائع پر اسلام نے جو قیود عائد کئے ہیں، ان کی تفصیل کے سمجھنے کے لئے چاہیئے کہ اجمالاً پہلے دنیا کی چیزوں کی اس تقسیم کو سمجھ لیا جائے جو معاشی حیثیت سے اسلام میں اختیار کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کی معاشی تقسیم واقعہ یہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اگرچہ مالی مسائل کو مختلف ابواب کے ذیل میں منتشر کرکے بیان کیا گیا ہے، لیکن تمام ابواب کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر منطقی طریقہ سے چاہیں تو ہم ان کو یوں تقسیم کر سکتے ہیں، یعنی ان چیزوں کا بنی آدم میں کوئی مالک ہے یا نہیں، اگر مالک نہیں ہے تو قبضہ کرنے کے بعد بھی آدمی ان کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں، اسی طرح جن چیزوں کا کوئی مالک ہے ان کی بھی دو صورتیں ہیں، مالک کی مرضی کے بغیر اسلام ان پر دوسروں کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اگر دیتا ہے تو اس کی کتنی صورتیں ہیں، اور نہیں دیتا ہے تو پھر ان چیزوں کے مالک ہونے کے قانونی ذرائع کیا ہیں اور اسلام ان قانونی پابندیوں کو ان چیزوں کے مالک ہونے کے لئے کیوں ضروری قرار دیتا ہے۔ چونکہ ان تمام منطقی شقوں کے نیچے کچھ نہ کچھ چیزیں داخل ہیں اس لئے میں ہر ایک پر الگ الگ بحث کرتا ہوں۔

ایسی چیزیں جن کا اسلامی نقطہ نظر سے کوئی مالک نہیں ہے" ہدایہ میں ہے۔

الاستقاء بماء البحر	سمندر و دریا کے پانی سے استفادہ کی

كالانتفاع بالشمس والقمر والهواء (کتاب الشرب ج ۴)	نوعیت وہی ہے جو آفتاب ماہتاب اور ہوا سے استفادہ کا حکم ہے (یعنی ہر شخص کو ان سے استفادہ کا عام حق حاصل ہے)

جس سے معلوم ہوا کہ سمندر یا دریا وغیرہ ان کا پانی اور آفتاب ماہتاب وغیرہ اور ان کی روشنی اسی طرح ہوا اور فضا کا کوئی مالک نہیں ہے۔ اسی طرح ہوا کے پرندے جنگل کے جانور، سمندر کے حیوانات ان سب کا کوئی مالک نہیں ہے اور یہی حال جنگل، پہاڑ وغیرہ کے درختوں اور دیگر نباتات کا ہے کہ نہ ان کا کوئی مالک ہے اور نہ ان کے پھلوں کا بلکہ ہر شخص کے لئے وہ شرعاً مباح اور جائز ہیں، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں اخروٹ، بادام وغیرہ کے خودرو جنگلی درختوں اور شہد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اذا كان فى المفاوز والجبال على الاشجار او فى الكهوف فلا شئ فيه وهو بمنزلة الثمار تكون فى الجبال والاودية۔	جب یہ چیزیں صحراؤں اور پہاڑوں میں درختوں پر یا پہاڑ کے غاروں میں ہوں تو ان پر کچھ نہیں (یعنی حکومت ان پر کوئی محصول عائد نہیں کر سکتی) اور ان کا حال ان پھلوں کا سا ہے جو پہاڑوں اور وادیوں میں ہیں۔

باقی اراضی یعنی زمین کی بھی اسلام میں چند قسمیں ہیں، صاحب ہدایہ نے ان اقسام کو اس طرح بیان کیا ہے۔

والارض فى الاصل نوعان مملوكة والارض مباحة غير مملوكة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة ايضاً نوعان نوع هو من مرافق البلد محتطباً لهم ومرعى لمواشيهم ونوع ليس من مرافقها وهو المسمى بالموات۔	زمین کی دراصل دو قسمیں ہیں ایک زمین جو کسی کی ملک ہو، ایک قسم، دوسری قسم مباح یعنی کسی کی ملکیت میں نہ ہو، پھر جو زمین کسی کی ملک ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں، آباد اور غیر آباد، اسی طرح غیر مملوکہ مباح زمین کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا شمار بلدہ (آبادی) کی سہولت آفرینیوں سے ہو یعنی وہ لکڑی حاصل کرنے کی جگہ ہے، مویشیوں کی چراگاہ ہو، اور دوسری وہ جس کا شمار شہری سہولت آفرینی میں سے نہ ہو، اسی کا نام الموات ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ زمین کی بعض قسمیں غیر مملوک بھی ہوتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان پر کسی کا قبضہ نہیں تو ان کے مملوک ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، سوال اس کے بعد یہ ہے کہ ان چیزوں کے تملیک کی کیا شکل ہے عام طور سے ان چیزوں کے مالک ہونے کا طریقہ اسلام نے بھی وہی اختیار کیا ہے جو دنیا میں مروج ہے۔ ابوداؤد میں سمرہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

من سبق الی ما لم یسبق الیہ مسلم فہو حق بہ۔

جس پر کسی مسلمان کا پہلے قبضہ نہ ہوا ہو وہ قبضہ کرے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔

فقہاء نے اس حدیث کی بنا پر یہ قانون پیدا کیا، جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔

من سبقت یدہ الیہ ملکہ۔

یعنی پہلی دفعہ جس کا قبضہ اس پر ہوگا وہی اس کا مالک ہو جائے۔

مثلاً کہتے ہیں کہ

من احتطب احتطابا فہو لہ ومن اصطاد صیدا فہو لہ۔

جنگل میں جو لکڑی کاٹے اور شکار کو جو شکار کرے وہ اسی کا ہوگا۔

لیکن باوجود اس عام قانون کے چند چیزیں ایسی ہیں جن کو اسلام میں بعض خاص فوائد کے ساتھ اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن پر کسی کا قبضہ ہی نہیں ہو سکتا اور ان کو وہ اپنی حفاظت میں نہیں لے سکتا مثلاً آفتاب و مہتاب، ہوا وغیرہ ان کا تو ظاہر ہی ہے کہ آدمی مالک نہیں ہو سکتا، ہدایہ میں ہے کہ

الانتفاع بالشمس والقمر والہواء فلا یمنع من الانتفاع بہ علی ای وجہ شاء۔

آفتاب، ماہتاب، ہوا سے فائدہ اٹھانے سے کوئی روکا نہیں جا سکتا جس طرح چاہے ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

اسی بنا پر فقہاء کا یہ مسئلہ ہے کہ دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کوئی اگر مالک ہو اور اوپر والی منزل کا کوئی اور پھر اوپر والی منزل اگر گر جائے تو اس وقت یا جب تک نہیں بنی یہ اوپر والی منزل تھی اس کو کوئی بیچ نہیں سکتا ابن ہمام نے اس کی وجہ فتح القدیر میں یہ لکھی ہے کہ مکان کو بلند کرنے کا جو حق اس کو حاصل تھا وہ

حق متعلق بالہواء ولیس الہواء مالا یباع (ج ۵ صفحہ ۲۰۰)

ایک ایسا حق ہے جو ہوا کے ساتھ قائم ہے اور ہوا کوئی مال نہیں ہے جسے بیچا جائے

اشتراکی سرمایہ پانی، آگ، گھاس

لیکن علاوہ ان چیزوں کے اور بھی چند امور ہیں جن پر خواہ کسی کا قبضہ بھی کیوں نہ ہو جائے لیکن عام مفاد کے لئے اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ انفرادی طور پر ان کا کوئی مالک نہیں ہو سکتا، بلکہ انہیں عام پبلک پراپرٹی قرار دینا چاہتا ہے اس سلسلہ میں عموماً کتابوں میں اگرچہ تین ہی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے یعنی مشہور حدیث ہے

الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار (صحاح)

لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساجھی اور شریک ہیں یعنی الماء (پانی) الکلاء (گھاس)، النار (آگ) میں۔

اسی حدیث کی بنا پر پانی، گھاس، آگ میں تمام انسان یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے۔

اشتراکی سرمایہ کے ملحقات

لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے قانون کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو انفرادی ملکیت قرار دینے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ

ملک احد بالاحتجار وملک منعہ فضاق علی الناس فان اخذ العوض عنہ اغلاہ فخرج عن الموضع الذی وضعہ اللہ من تعمیم ذوی الحوائج من غیر کلفۃ۔ (المغنی)

(ص ۱۵۰ ج ۲)

اگر احاطہ بندی کر کے کوئی اس کا مالک ہو جائے گا تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام سخت تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے گراں دے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو جو مقام عطا کیا تھا وہاں سے وہ چیز ہٹ جائے گی یعنی عام حاجتمندوں کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری ہوتی جاتی رہے گی۔

اسی لئے علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلہ میں حسب ذیل چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

المعادن الظاہرۃ وہی التی یوصل ما فیہا من غیر مؤنۃ ینتابہا الناس وینتفعون بہا کالملح والماء والکبریت والقیر والمومیاء والنفط والکحل والیاقوت ومقاطع الطین واشباہ ذلک۔

ظاہری معادن ان کو کہتے ہیں جن تک بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی حاصل ہو سکے لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری ہو، اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں، مثلاً نمک، گندھک، قیر، مومیائی، نفت (مٹی کا تیل) سرمہ، یاقوت یا مٹی نکالنے کی جگہ ہو۔

علامہ لکھتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ چیزیں۔

لا تملک بالاحیاء ولا یجوز اقطاعہا لاحد من الناس ولا احتجارہا دون المسلمین لان فیہ ضرارا بالمسلمین وتضییقا علیہم۔

نہ آباد کرنے اور حکومت سے جاگیر لینے کی وجہ سے ان امور کا کوئی مالک ہوتا ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

فقہاء نے اس قانون کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث سے مستنبط کیا ہے جو ابو داؤد، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ابیض بن حمال نامی صحابی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

الماء الذی یکون فی الاوانی والظروف والثانی الذی یکون فی الآبار والحیاض والعیون والثالث ماء الانهار الصغار التی تکون لاقوام مخصوصین والرابع ماء الانهار العظام کجیحون وسیحون ودجلة والفرات۔

وہ ہے جو برتنوں اور ظروف میں ہو، دوسری قسم وہ ہے جو کنوؤں یا حوضوں اور چشموں میں ہو، تیسری قسم وہ ہے جو ان چھوٹے دریاؤں اور ندیوں میں ہو جن کا تعلق خاص خاص قوموں سے ہو، چوتھی قسم وہ ہے جو بڑے بڑے دریا جیسے جیحون اور سیحون، دجلہ و فرات وغیرہ میں ہو۔

بڑے بڑے دریا کا پانی

پانی کے ان چار اقسام کے متعلق بالاتفاق سب کا یہ مذہب ہے کہ جو پانی بڑے بڑے دریا مثلاً جیحون و سیحون یا ہندوستان میں گنگا جمنا کرشنا گوداوری کا ہے پورے ملک کے تمام باشندوں کا پانی ہے۔ ہر شخص کو اس سے خود پینے کا جانوروں کو پلانے کا اور کھیتوں باغوں کے سینچنے کا قانونی حق ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

الانهار العظام کسیحون وجیحون ودجلة والفرات ونحوها فلا ملک لاحد فیها ولا فی رقبة النهر ولا لاحد حق خاص فیها ولا فی الشرب بل هو حق عامة المسلمین فلکل احد ان ینتفع بهذه الانهار بالشفة والسقی۔

بڑے بڑے دریا مثلاً سیحون اور جیحون و دجلہ و فرات اور اسی قسم کے جو دریا ہیں کسی کی ذاتی ملک نہیں ہو سکتے، اور نہ ان کے پانی کا کوئی ذاتی مالک ہو سکتا ہے، اور نہ اس رقبۂ زمین کا جس میں ان دریاؤں کا پانی بہتا ہے اور نہ کسی خاص شخص کا ان کے ساتھ کوئی ذاتی حق متعلق ہو سکتا ہے نہ پانی کا ذاتی حق ان دریاؤں کے متعلق کسی خاص شخص کو حاصل ہو سکتا ہے بلکہ یہ عام مسلمانوں کا حق ہے اسی لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ ان دریاؤں سے وہ نوشیدنی اور آبپاشی دونوں قسم کے منافع اٹھا سکتا ہے۔

بڑے دریاؤں سے نہروں کا نکالنا

صرف یہی نہیں بلکہ ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر اگر کوئی اپنی زمین میں لائے اور کسی دوسرے کی زمین وغیرہ اس کے اس فعل سے برباد نہ ہوتی ہو یا باشندگان ملک کو اور کسی قسم کا نقصان نہ پہنچتا ہو تو کسی کو کوئی حق نہیں ہے کہ نہر کھودنے سے اس کو روکے حتیٰ کہ حکومت بھی یہ نہیں کر سکتی۔ ہدایہ میں ہے۔

له ان یشق الیه نهرا من هذه الانهار ولیس

اس کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنی زمین تک ان دریاؤں سے نہر کاٹ کر لے جائے

للامام ولا لاحد منعه عنه یضر بهما ولم یضر

اور نہ امام (حکومت) ہی کو اس کا حق ہے اور نہ کسی اور کو کہ اس فعل سے اس کو روکے بشرطیکہ اس نہر کی وجہ سے کسی کو ضرر نہ پہنچے۔

ان دریاؤں کے پانی کی قوت سے بجلی وغیرہ چلانا یا موٹ چرس ان پر قائم کرنا

اسی طرح ہر باشندۂ ملک کو اس کا بھی حق ہے کہ اس قسم کے دریاؤں اور ندیوں پر

ان ینصب علیه ارحی ودالیة وسانیة (ہدایہ)

کہ ان پر پن چکی اور رہٹ موٹ وغیرہ قائم کرے۔

البتہ حکومت اور پبلک دونوں کو اس کا حق ہے کہ اس کے ان افعال سے خود نہر یا دریا کو کوئی نقصان نہ پہنچے اس کی نگرانی کریں۔ ہدایہ ہی میں ہے۔

کل واحد بسبیل من الانتفاع لکن بشریطة عدم الضرر بالنهر کالانتفاع بطریق العامة وان اضر بالنهر فلکل واحد من المسلمین منعه۔

اگرچہ ہر شخص کو نفع گیری کا حق حاصل ہے بشرطیکہ اس کی نہر کی وجہ سے کسی کا کچھ نقصان نہ ہوتا ہو یہی حکم سڑک کا ہے جو عام شاہراہ کا ہے۔ لیکن اگر اس سے نہر کو نقصان پہنچتا ہو تو ہر مسلمان کو حق ہے کہ اس فعل سے اس کو روک دے۔

دریاؤں کے سوا پانی کے اقسام

اسی طرح پانی کی دوسری اور تیسری قسم یعنی مخصوص افراد کی زمین میں جو نہریں جاری ہیں یا مخصوص زمینوں کے تالاب اور کنوؤں کا پانی اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ

حق الشفة ثابت

نوشیدنی کا ہر حق پبلک کے ہر فرد کو اس میں حاصل ہے

یعنی خود پینے یا اپنے جانوروں کو پانی پلانے کا حق تو اب بھی عام پبلک کو حاصل ہے۔ البتہ چونکہ مملوکہ زمینوں سے اس پانی کو تعلق ہے۔ اس لئے زمین کے مالکوں کی اجازت کے بغیر دوسروں کو اس پانی سے باغوں یا کھیتوں کے سینچنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہدایہ میں ہے۔

فان اراد رجل ان یسقی بذلک ارضا احیاها کان لاهل النهر ان یمنعوه عنه اضر بهم اولم یضر۔ (ہدایہ ص ۴۳۰ ج ۴)

اگر کوئی اپنی آباد کردہ زمین کو اس قسم کے پانی سے سینچنا چاہے تو نہر والوں کو حق ہے کہ اس کو روک دیں، خواہ نقصان ہو یا نہ ہو۔

کنوؤں تالابوں کے پانی کے فروخت کا حکم

مگر بایں ہمہ اس قسم کے پانی کے بیچنے یا اجارہ کی بھی اجازت نہیں ہے فقہاء اس باب میں ایک حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔

نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع نقع البیر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کنویں کے سوت کے پانی کو کوئی فروخت کرے۔

"صحیح البیر" کا ترجمہ صاحب ہدایہ نے "فضل الماء" یعنی کنووں کا زائد از ضرورت پانی کیا ہے بہر حال اس حدیث کی وجہ سے پینے پلانے سے تو کسی کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن اگر ہر شخص کو ایسی نہروں یا تالابوں یا باولیوں سے آبپاشی کی عام اجازت دے دی جائے تو جیسا کہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں

کل احد یعتاد سقی اراضیه	ہر شخص [؟] کے اس پانی سے نفع
فیسقی منه زرعه واشجاره	اٹھانا چاہے گا اور اس سے اپنے
فیبطل حقه اصلا۔	کھیت اور باغ کو سیراب کرے گا

بس نہر والوں کا حق مارا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے پانی میں اشتراکیت کا نظریہ صرف "حق الشفة" یعنی نوشیدنی تک محدود ہے، پھر فقہاء نے اس کی مختلف شکلوں کے احکام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً اگر کنواں یا تالاب کا مالک پبلک کو اپنی زمین میں آنے سے روکے اور کہے کہ تم کو تو پانی پر تمہارا حق ہے لیکن میری مملوکہ زمین کے احاطہ میں داخل ہونے کی تو اجازت نہیں ہے تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا اگر نوشیدنی کی ضرورت پبلک کسی اور ذریعہ سے پوری کر سکتی ہے تو جھگڑنے کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر کنوئیں کے مالک کو مجبور کیا جائے گا کہ یا تو وہ لوگوں کو اپنے کنوئیں سے پانی لینے دے ورنہ کوئی نظم کرے کہ لوگوں تک ان کا قانونی حق پہنچ جائے یعنی ان کے اور ان کے جانوروں تک پانی پہنچ جائے۔ اس حق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ دونوں باتوں میں سے کسی پر راضی نہ ہو تو پبلک کو حق ہے کہ باضابطہ مسلح ہو کر اس سے جنگ کریں اور اپنا حق حاصل کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی قسم کی ایک صورت پیش آئی تو آپ نے فرمایا۔

هلا وضعتم فیهم السلاح (ہدایہ)	تم نے لوگوں کے درمیان ہتھیار کیوں نہ ڈالا۔

پانی کی وہ قسم جو بک سکتی ہے

یعنی پانی کی چوتھی قسم یعنی جب برتنوں یا مشکوں میں پانی بھر لیا گیا ہو تو اس قسم کے پانی میں انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ اب اس پانی کی حیثیت ایسی ہو گئی کہ

کما استولی علی الحطب	کوئی جنگل کی لکڑیوں، گھاس اور شکار پر
والحشیش والصید۔	قبضہ کر لے (تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے)

کہ ان چیزوں سے استفادہ کا حق اگرچہ پبلک کے ہر فرد کو حاصل ہے لیکن جب ان پر کسی کا قبضہ ہو گیا تو قبضہ کرنے والے کی وہ ملک ہو جاتی ہیں اسی طرح برتن اور مشک کا پانی بھی مملوک ہو جاتا ہے

فیجوز بیعه۔	اور ایسی صورت میں (مالک کو برتن) کے پانی کا فروخت کرنا بھی جائز ہے)

اس قسم کے پانی کی بیع و فروخت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ

السقاؤن یبیعون المیاه	برتنوں میں جس پانی کو محفوظ کر لیا گیا ہو

المحرزة فی الظروف بیه	اس کو بہشتیوں کی جماعت ہمیشہ بیچتی رہی
جرت العادة فی الامصار	ہے۔ تمام شہروں اور ملکوں میں یہ
فی سائر الاعصار من غیر نکیر	عام رواج ہے اور کسی نے اس پر
(بدائع)	اعتراض نہیں کیا۔

اس لئے اس پانی کے متعلق حکم ہے کہ

فلا یحل لاحد ان یاخذ	جائز نہ ہوگا کہ پانی کے مالک کی اجازت کے
منه فیشربه من غیر اذنه	بغیر کوئی اس کو لے اور پئے۔

البتہ ایسی صورت میں کہ پیاس سے کسی کی جان پر بن آئے اور دوسرے کے برتن میں زائد از ضرورت پانی ہو تو غیر مسلح لڑائی کر کے پانی زبردستی چھین کر پی سکتا ہے۔

شدید ضرورت کی چیزوں میں اشتراکیت کا نقطہ نظر

اور یہ حکم کچھ پانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہلاکت کے اندیشے کی صورت میں زائد از ضرورت چیز دوسرے سے آدمی زبردستی چھین کر استعمال کر سکتا ہے خواہ کھانا ہو یا اسی قسم کی دوسری چیز۔ ہدایہ میں ہے کہ

وکذا الطعام عند اصابة المخمصة	یعنی یہی حکم کھانے کا بھی ہے شدت
(ص ۴۲۲ ج ۴)	بھوک میں۔

مملوکہ پانی میں بھی اشتراکیت کا اثر

لیکن پانی برتن والا ہی کیوں نہ ہو حدیث میں چونکہ (الماء) مطلق پانی میں عام لوگوں کو شریک قرار دیا گیا ہے اس لئے فقہاء اسلام نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلا ضرورت اگر کسی کی مشک یا برتن سے آدمی پانی چرا لے تو چوری کی شرعی سزا قطع ید کا حکم اس پر نہ لگایا جائے گا خواہ اس پانی کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس کے چرانے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے کتابوں میں ہے

لو سرقه انسان فی موضع	اگر کسی ایسے مقام میں جہاں پانی مشکل
یعز وجوده وهو یساوی	سے میسر آتا ہو اور کوئی برتن کے پانی
نصابا لم تقطع یده	چرا لے تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا خواہ پانی
(کتاب الخراج جلد ۴ ص ۳۰۱)	کی قیمت اسی قدر کیوں نہ ہو جس پر ہاتھ کٹتا ہے

کیونکہ بہر حال ایک گونہ شرکت کا شبہ اس میں پیدا ہو گیا ہے اور شبہ سے اس قسم کی سزائیں ٹل جاتی ہیں۔

مچھلیوں کا حکم

پانی ہی کے ذیل میں مچھلیوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح ہوا کے پرندوں کا کوئی مالک نہیں ہے اور جو ان پر قبضہ کرے گا وہی مالک ہو جاتا ہے۔ بعض اسی طرح کسی تالاب یا باغ یا کھیت میں یہ پرندے چرتے چگتے ہیں یا رہتے ہیں کوئی ان کو فروخت نہیں کر سکتا حتیٰ کہ حکومت کو بھی اس کا اختیار نہیں ہے کہ اس قسم کی خشکی یا تری کے جانوروں کو کسی کی انفرادی ملکیت قرار دے۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے

الامام لا یملک ان یخص	امام (حکومت) کو اس کا بھی اختیار نہیں کہ

واحد او دون واحد بذالک
حق لواحد دون واحد؟ ان
یاخذ شیئا صید البینه
من بر او بحر لا یملک المامور
قبل الاخذ والاصطیاد۔
(ہدایہ ص ۲۰۰ ج ۴)

کہ کسی خاص شخص کو ان امور کی خصوصی
ملکیت عطا کرے تو اگر کسی کو امام
حکم دے کہ فلاں خاص شکار کو پکڑے خواہ
خشکی کا ہو یا دریا کا تو جسے حکم دیا گیا
ہے وہ شکار پکڑنے سے پہلے اس کا
مالک نہیں ہو سکتا۔

سوال ہوتا ہے کہ جب ہوا کے جانوروں کا یہ حکم ہے تو مچھلیاں جن کی حیثیت پانی میں وہی ہے جو ان وحشی پرندوں کی ہوا میں ہے ان کو بھی کوئی بیچ سکتا ہے یا نہیں — قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں ایک خاص باب اس مسئلہ میں باندھا ہے۔ خود ان کا اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کا خیال بھی ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں بیان کی ہے کہ یہ غیر مملوک شئی کی بیع ہے۔ بلکہ ممانعت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ خریدار کے متعلق دھوکہ کھا جانے کا اندیشہ ہے کہ پانی کے اندر کا حال اس کو کیا معلوم ہو سکتا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ فتویٰ قاضی صاحب نے نقل کیا ہے کہ

لا تبیعوا السمک فی الماء
فانه غرر

مچھلی کو پانی کے اندر بیچا کرو کہ اس
میں دھوکہ ہے۔

اسی قسم کے الفاظ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں۔ لیکن اسی کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اسی کتاب الخراج میں یہ بھی مروی ہے۔ برس نامی مقام میں جو عراق میں واقع ہے۔

انه وضع علی اجمة برس
اربعة آلاف درهم
وکتب لهم کتابا فی قطعة
أدم۔
(کتاب الخراج ص ۹۵)

برس نامی مقام کے ابھرا آبی نیستان پر
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار ہزار درہم
مقرر فرمایا اور چمڑے کے ایک ٹکڑے پر
ان کو اس کا پٹہ لکھ کر دیا (اجمہ کے لفظ کی
تحقیق آگے آرہی ہے)

صرف یہی نہیں کہ حکومت نے اس خزانۂ آب کو چار ہزار درہم میں بندوبست کیا بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے بھی اس کتاب میں یہ مروی ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمن نے جو ان کے صوبہ دار تھے انھوں نے

یسئله عن بیع صید الآجام

نیستانوں (آبی جنگلوں) کے شکار کے متعلق
دریافت کیا کہ کیا ان کو فروخت کیا جائے۔

جواب میں عمر بن عبد العزیز نے فرمان بھیجا۔

ان لا باس به وسماه الحبس
(کتاب الخراج ص ۱۰۱)

اس کے فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے
اور اس کا نام انھوں نے الحبس رکھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی مچھلیوں کے متعلق ابتداء سے کچھ اختلاف چلا آتا ہے خود قاضی ابو یوسف نے

لکھا ہے کہ اگر کسی ایسے گڑھے میں مچھلی ہو جو بغیر شکاری تدبیروں کے ہاتھ آجائے تو اس کے بیچنے میں حرج نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ان کے الفاظ یہ بھی ہیں

ومثله اذا کان یوخذ
بغیر صید کمثل سمک فی
الجب۔
(کتاب الخراج ص ۱۱۱)

اور یہی سوال ان مچھلیوں کا ہے جو بغیر
شکاری تدبیروں کے پکڑی جاتی ہوں
جیسا کہ ان مچھلیوں کا ہے جو
کنوئیں میں ہوں۔

ان تمام اقوال کے دیکھنے سے فیصلہ کی صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمندروں، دریاؤں، ندیوں وغیرہ کی مچھلیاں جو بند اور محدود پانی میں نہیں رہتی ہیں۔ ان کو نہ حکومت بیچ سکتی ہے اور نہ شکار کرنے سے پہلے کوئی اور بیچ سکتا ہے۔ بلکہ وہ عام پبلک کی چیز ہے۔ ملک کے ہر باشندے کو ان کے شکار اور ان سے استفادہ کا حق ہے۔ البتہ اگر محدود اور بند پانی مثلاً تالابوں وغیرہ میں ہوں تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتویٰ کے مطابق ان کے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً ایسی مچھلیاں جنہیں اس زمانہ میں لوگ اپنے مخصوص تالابوں میں خرید کر پالتے ہیں یعنی ان کے بچے جنہیں زیرہ کہتے ہیں خرید کر تالابوں میں چھوڑ دیتے ہیں جو گویا قبضہ کرنے اور مملوک بنانے کے بعد ان کو تالابوں میں چھوڑا جاتا ہے بظاہر ان کے فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آبادیوں کے اطراف وجوانب کے تالابوں یا جھیلوں میں جو قدرتی خودرو مچھلیاں پائی جاتی ہیں، اگر زمیندار اور جاگیردار ان کو گاؤں کے عام باشندوں کو شکار کرنے کی بغیر کسی معاوضہ کے اجازت دے دیا کریں تو کم از کم حنفی مذہب کی رو سے اسلام نے عوام کا جو معاشی حق قائم کیا ہے اس سے محروم کرنے کے وہ مجرم نہ ہوں گے۔

مچھلیوں کے سوا دوسری آبی پیداواروں کا حکم

مچھلیوں کے ساتھ سمندر، دریا، ندی وغیرہ کی دوسری پیداواروں کا بھی سوال اسلامی فقہ میں اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے امام ابو حنیفہ کا تو کھلا ہوا فیصلہ ہے کہ خواہ جس قسم کی چیز بھی ہو اس کی کتنی ہی قیمت ہو خواہ عنبر ہو یا موتی ہو، یا اس کے سوا کوئی اور چیزیں ہوں سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے۔ یعنی ملک کے عام باشندوں کا وہ مشترک سرمایہ ہے جس کا جی چاہے انہیں نکال سکتا ہے اور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حکومت تک کو اس سے کسی قسم کا محصول لینے کا حق نہیں ہے۔ قاضی ابو یوسف نے اس کا بھی کتاب الخراج میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور لکھا ہے کہ

قد کان ابو حنیفة وابن ابی لیلی
یقولان لیس فی شیئ من ذلک
شیئ لانه بمنزلة السمک

ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا خیال تھا
کہ سمندری پیداواروں (مثلاً عنبر موتی
وغیرہ) میں سے کسی پر کوئی محصول یا
ان کی قیمت نہیں وصول کی جا سکتی، ان سب کا حکم وہی ہے جو مچھلیوں کا ہے

لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک فرمان کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے خود یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ دریا کی وہ چیزیں جو بطور زیور یا خوشبو کے استعمال ہوتی ہیں (مثلاً موتی مرجان عنبر وغیرہ) اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

فی ذلک خمس واربعة	حکومت ان پیداواروں سے خمس
اخماسه لمن اخرجه	(پانچواں حصہ) وصول کرے گی

اور باقی چار خمس (حصے) اس شخص کے ہوں گے جس نے اسے نکالا۔

لیکن ان کے سوا اور تمام چیزوں کے متعلق ان کا بھی وہی خیال ہے جو امام کا ہے خود فرماتے ہیں۔

فاما فی غیرهما فلا شیء	جو چیزیں بطور زیور (حلیہ) اور خوشبو
فیه۔	کے استعمال ہوتی ہیں ان کے سوا

سمندر کی اور چیزوں پر کچھ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے جس فرمان سے انھوں نے حلیہ اور عنبر کو مستثنیٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یعلی ابن امیہ کو حضرت عمرؓ نے بحر (سمندر) کے علاقوں یا بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تھا یعلی نے بارگاہ خلافت میں یہ لکھ کر پوچھا،

عنبرة وجدها رجل فیسأله	عنبر (مچھلی جس سے عنبر نکلتا ہے) ایک
عنها وعما فیها۔	شخص کو ملی ہے۔ وہ اس مچھلی اور

جو کچھ اس کے اندر سے برآمد ہوگا اس کے متعلق پوچھتا ہے۔

جواب میں یہ فرمان گیا کہ

فیما اخرج الله جل شانه	سمندر سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو پیدا
من البحر الخمس۔	کرتے ہیں ان میں خمس (پانچواں حصہ)
(کتاب الخراج)	حکومت کا حق ہے۔

اس فرمان کے راوی ابن عباسؓ ہیں، خود بھی فرماتے ہیں۔

وذلک رأیی۔	اور میری بھی یہی رائے ہے۔

بہرحال یہ سارے مباحث تو انہار (یعنی پانی) کے تھے جس میں آنحضرتؐ نے ملک کے عام باشندوں کو شریک قرار دیا ہے۔ گزشتہ بالا مسائل گویا اسی اشتراکی نظریہ کی تفصیل تھی۔

سیال معدنیات کے احکام

پانی اور پانی کے خزانوں اور چشموں کے ذیل میں چونکہ بعض سیال معادن کو فقہاء اسلام نے اسی ذیل میں شمار کیا ہے۔ حتیٰ کہ قاضی ابو یوسف نے تو کتاب الخراج میں صاف طور پر لکھ دیا ہے۔

لیس فی النفط والقیر	جہاں تک مٹی کے تیل
والزیبق والمومیا ای معان	(نفط) اور قیر (تارکول) مومیائی میں
شیء من ذلک عین فی الارض	کچھ نہیں ہے۔ بشرطیکہ زمین سے ان کا

شیء تعلمه کان فی ارض عشر	کوئی چشمہ ابلتا ہو خواہ چشمے عشری زمین
او فی ارض خراج (کتاب الخراج ص ۴۳)	ہوں یا خراجی زمین میں۔

لیکن یہ ایک اجمالی بیان ہے ورنہ جیسے پانی کے مختلف اقسام کے مختلف احکام تھے ان معدنی چیزوں کا بھی یہی حال ہے گنجائش کی حد تک ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں (اس مسئلہ کا پہلے بھی کچھ ذکر آچکا ہے) لیکن اس وقت ہم اس کو شرح الکبیر للمقنع الحنبلی سے نقل کرتے ہیں۔ اس میں ہے۔

لا تملک المعادن الظاهرة	ایسے معادن جنہیں معادن ظاہرہ
کالملح والقار والکحل	کہتے ہیں مثلاً نمک، اور قار (تارکول)
والجص والنفط بالاحیاء	سرمہ گچ، نفط (مٹی کا تیل) وغیرہ کے
ولیس للامام اقطاعه۔	جیسے معدنوں کا کوئی شخص ذاتی طور پر
(۳۶۶)	مالک نہیں ہو سکتا نہ احیاء اور آباد

کرکے ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے اور نہ حکومت کو حق ہے کہ کسی خاص شخص کو جاگیر میں یہ چیزیں عطا کرے یہ متن کی عبارت ہے۔ شرح اس کی یہ کی گئی ہے کہ

فالمعادن الظاهرة وهی التی	ایسے معادن جو ظاہری معادن کہلاتے
یوصل الی ما فیها من غیر	ہیں جن کی تعریف یہ ہے کہ (۱) ان تک
مؤنة ینتابها الناس	بغیر کسی محنت و مشقت کے رسائی ہو (۲)
وینتفعون بها کالملح والکبریت	لوگوں کی اس پر آمد و رفت جاری ہو (۳)
والقیر والمومیا والنفط	اور اس سے عام لوگ نفع اٹھاتے ہوں
والکحل والیاقوت ومقاطع	مثلاً نمک گندھک قیر (تارکول) مومیائی
الطین واشباه ذلک	نفط (مٹی کا تیل) سرمہ یاقوت اور مٹی نکالنے
لا یملک بالاحیاء ولا یجوز	کی جگہ (کانیں) اور اسی قسم کی چیزیں
اقطاعه لاحد من الناس ولا	آباد کرکے بھی کوئی ان کا مالک نہیں
احتجازه دون المسلمین	ہو سکتا اور نہ کسی کے لئے یہ جائز ہے
لان فیه ضررا بالمسلمین	اور نہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کو ان کے
وتضییقا علیهم۔	استفادہ سے روکا جائے کیونکہ مسلمانوں کا
(المغنی ابن قدامہ ص ۱۰۱)	نقصان ہے اور ان پر تنگی و تضییق عائد کرنا ہے

نمک کا مسئلہ گزشتہ بالا عبارتوں سے جہاں اور باتیں ثابت ہوتی ہیں وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمک کی کان بھی پبلک کا مشترک سرمایہ ہے نہ وہ انفرادی ملکیت ہو سکتی ہے اور نہ حکومت اس پر کوئی محصول عائد کر سکتی ہے اور اسی بنا پر بعض علماء نے ہندوستان میں پچھلے دنوں یہ عام فتویٰ دیا کہ اسلامی حیثیت سے نمک سازی پر محصول لگانا یا حکومت کو نمک بنانے سے لوگوں کو روکنا جائز نہیں ہے

مجھے سیاسی مصالح سے بحث نہیں، لیکن علماء کے متعلق یہ ضرور خیال آتا ہے کہ مسئلہ کو ہمیشہ اس کے تفصیلات کے ساتھ پبلک میں پیش کرنا ان کی دیانت کا اقتضا ہونا چاہیے۔ نمک کی ایسی کانیں جن میں مندرجہ ذیل صفات پائی جاتی ہوں، یعنی (۱) لوگوں کی رسائی بلا خرچ نمک تک ہوتی ہو (۲) عام لوگوں کی آمد و رفت اس کان تک لگی ہوئی ہو اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں۔ بلا شبہ نمک کی ایسی کانوں کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر وہی ہے۔ لیکن اگر بجائے اس کے صورتِ حال یہ ہو کہ

كان بقرب الساحل	سمندر کے کنارے کوئی ایسی جگہ ہو
موضع اذا حصل فيه	جب سمندر کا پانی اس میں آ کر جمع ہو جائے
الماء صار ملحا.	تو نمک بن جاتا ہو۔

تو اس کے متعلق فقہاء کا عام فتویٰ یہ ہے کہ

ملك بالاحياء وللامام	تو اس کا آدمی مالک ہو جاتا ہے احیاء
اقطاعه.	(آبادی) کے ذریعہ سے بھی اور امام

(حکومت) اس کو افراد کو جاگیر بھی دے سکتی ہے۔

اس قسم کی زمینوں کی "احیاء" یا زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

تهيئة لما يصلح له من	جس کام کی اس میں صلاحیت ہو اس کے
حفر ترابه وتمهيده وفتح	لئے اس کو تیار کرنا، یعنی اس کی مٹی
قناة اليه تصب الماء اليه	کھودنی، اس کو کشادہ کرنا، سمندر سے

نالی نکال کر اس گڑھے تک لانا تاکہ سمندر کا پانی اس میں آ کر گرے۔

نمک بنانے کے لئے سمندر کی ساحلی زمینوں کو بندوبست کرنے کا حکومت کو اختیار کیوں ہے اور ان میں انفرادی ملکیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ

لانه لا يضيق على المسلمين	کیونکہ سمندر کے کنارے اس قسم کے
باحداثه بل يحدث	کارخانے کے قائم کرنے سے مسلمانوں میں
نفعه بفعله فلم يمنع	کوئی تنگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کا
منه كبقية الموات.	نفع آباد کرنے والے کے عمل سے ظاہر
(المغنی ص ۵۲۵ ج ۵)	ہوتا ہے۔ پس اس کو اس فعل سے نہیں

روکا جائے گا جیسے موات کی دوسری زمینوں کے آباد کرنے سے وہ نہیں روکا جا سکتا۔

اور غالباً ہندوستان میں نمک سازی کا جو مسئلہ پیدا ہوا تھا وہ یہی صورت تھی۔

<u>عام معدنیات کا حکم</u>: اور صرف نمک ہی نہیں بلکہ اس کے سوا بھی جن معدنی امور کا ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس حکم کو بھی ہر قسم کی کانوں کے لئے عام حکم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ حکم ان ہی معدنی چیزوں تک محدود ہے جو خود بخود باہر آ گئی ہوں

اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہوں، ورنہ ایسے معادن جن کو فقہی اصطلاح میں معادن باطنہ کہتے ہیں اور جن کی تعریف شرح کبیر میں یہ کی گئی ہے۔

هي التي لا يوصل اليها	یہ ان کانوں کو کہتے ہیں جن کی پیداوار تک
الا بالعمل والمؤنة	رسائی بغیر عمل اور مشقت و محنت
(ص ۱۵۱ ج ۶)	کے نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

لم تكن ظاهرة فحفرها	یعنی ابتداءً قدرتی طور پر وہ معدن ظاہر نہ تھا
انسان واظهرها.	پھر کسی نے کھود کر اس کو نکالا اور نمایاں کیا۔

اس قسم کے معادن کی مثال میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے

كمعادن الذهب والفضة	جیسا کہ سونے، چاندی، سیسہ، بلور وغیرہ
والرصاص والبلور.	کی کانوں کا حال ہے۔

بہرحال ایسے معادن جن سے استخراج بغیر عمل جد و جہد اور مصارف کے نہیں ہو سکتا خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، اگرچہ بعض فقہاء ان میں بھی انفرادی ملک کے قائل نہیں ہیں، ان کا مذہب ہے کہ حکومت کسی انفرادی شخصیت کے ساتھ ان کو بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔ لیکن صاحب مغنی نے لکھا ہے کہ

والصحيح جواز ذلك	درست یہی ہے کہ ان کا فرد کا
	بندوبست کرنا جائز ہے۔

یعنی "انفرادی ملکیت" بن سکتی ہے اور حکومت کو اس کا اختیار ہے کہ کسی واحد شخص کے ساتھ اس کو بندوبست کر دے۔ "جواز" کے ثبوت میں ابوداؤد کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے

ان النبي صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن
اقطع بلال بن حارث	حارث کو قبیلہ کے معادن خواہ پست
معادن القبلية جلسيها	علاقوں میں ہوں یا بلند علاقوں میں بطور
وغوريها.	جاگیر کے عطا فرمایا۔

اور اس سے ثابت ہوا کہ صرف جامد معادن ہی نہیں بلکہ سیال معادن مثلاً پارہ، پٹرول، تارکول وغیرہ ایسے معادن جن کے کھودنے اور نکالنے میں مصارف اور محنت پڑتی ہو وہ انفرادی ملکیت بن سکتے ہیں، اور حکومت ان کو بندوبست کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو ان معدنی پیداواروں پر کسی قسم کے محصول عائد کرنے کا بھی حق ہے؟ یا بغیر کسی رائلٹی کے ملک کے باشندے ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب تو آئندہ حکومت کی آمدنی کی ذیل میں دیا جائے گا لیکن اسلامی معاشیات کی وسعت نظری کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس مسئلہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو فقہ کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

اعلم ان ما یستخرج من المعدن ثلاثة انواع جامد یذوب وینطبع کالنقدین والحدید وجامد لا ینطبع کالجص والنورة والکحل والزرنیخ وسائر الاحجار کالیاقوت والملح ومالیس بجامد کالماء والقیر والنفط۔
(فتح القدیر ج ۱)

کانوں سے جو چیز نکلتی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے ایک جامد چیزیں جو پگھل سکتی ہوں اور چھاپ قبول کر سکتی ہوں مثلاً سونے، چاندی، لوہے وغیرہ کا معدن آگے دوسری قسم وہ ہے جو جامد اور غیر سیال تو ہو لیکن چھاپ قبول نہ کر سکتی ہو جیسا کہ سرمہ، ہڑتال، بلکہ ان تمام چیزوں کا حال ہے جن کا شمار پتھروں کے ذیل میں کیا جاتا ہے، مثلاً یاقوت نمک، تیسری قسم ہے وہ ہے جو جامد نہ ہو بلکہ سیال ہو، مثلاً پانی، تارکول، مٹی کا تیل۔

ان تینوں قسموں کا بیان کرنے کے بعد آئندہ جو چیز انھوں نے لکھی ہے وہ دنیا کی حکومتوں کی خیرہ اس سے آنکھیں کھل جائیں اور موجودہ حکومتوں کی رعایا میں کسی حکومت کے اس نقطۂ نظر کو سن کر معلوم نہیں کس قسم کے جذبات مشتعل ہونے لگیں، ابن ہمام نہایت سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک

لا یجب الخمس الا فی النوع الاول۔

خمس (پیداوار کا پانچواں حصہ) صرف پہلی قسم سے حکومت وصول کر سکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ قسم اول کے سوا اور تمام معدنی پیداوار ہر قسم کے محصول سے آزاد ہیں اور یہ تو امام ابوحنیفہؒ کا خیال ہے۔ امام شافعیؒ نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا ہے۔

وعند الشافعی لا یجب الا فی النقدین۔

بجز سونے چاندی کے اور کسی پر خمس واجب نہیں ہے۔

اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق بعض تفصیلات اور بھی ہیں پر جن کا یہاں موقع نہیں یا فی الحال اتنا اجمالی بیان کافی ہو سکتا ہے۔ حدیث "الناس شرکاء" میں جن جن چیزوں کو پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا گیا ہے اب تک ان میں سے پہلے جزء "الماء" کو اور اس کے متعلقات کی گویا یہ تفصیل تھی۔ باقی دو چیزیں اور رہ گئے یعنی "الکلاء" اور "النار"۔ اب ان کے متعلق مسائل کی تشریح کی جاتی ہے۔

الکلاء (گھاس) کے مسائل کی تفصیل

حدیث میں چونکہ "الکلاء" کا لفظ آیا ہے جس لئے اس کی تحقیق ہونی چاہیے کہ الکلاء کے مفہوم کا تعین کیا ہیں۔ صاحب مغرب نے اپنی کتاب مغرب فی لغات میں اس لفظ کو لیا ہے اور اس پر ایک طویل بحث کی ہے، امام محمدؒ کا قول تو یہ نقل کیا ہے کہ

الکلاء ما لیس له ساق وما قام علی ساق فلیس بکلاء۔

الکلاء (گھاس) وہ نباتات ہیں جو تنے پر قائم نہ ہوں اور جو تنے پر قائم ہو وہ کلاء نہیں ہے۔

یعنی ساق اور تنہ پر جو نباتات کھڑے ہوتے ہیں ان کی مثال میں توبیخ اور عرفج و غیرہ جنگلی درختوں کو شریک کیا ہے۔ لیکن مطرزی صاحب مغرب نے خود اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے۔

والظاهر انه يقع على الساق وغيرها۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کلاء کا اطلاق تنے والے اور بے تنہ دونوں قسم کے نباتات پر ہوتا ہے۔

جو بیان کی ہے کہ فقہاء "الکلاء" کی شرح میں عموماً یہ کہتے ہیں کہ

ما ترعاه الدواب رطباً كان او يابساً۔

جنہیں عموماً چوپائے چرتے ہوں خواہ خشک حالت میں یا تر۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ جانور عموماً بے تنہ والی گھاسوں کو بھی چرتے ہیں اور بعض تنہ رکھنے والے جنگلی جھاڑ مثلاً ببول، توبیخ، عرفج وغیرہ کی پتیاں بھی چرتے ہیں اس سے "الکلاء" کو بجائے گھاس کے ہر اس نبات کے لئے عام رکھنا چاہیے جسے جانور چرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ابوعبید کی کتاب الاموال سے بھی اپنی تائید میں بعض چیزیں نقل کی ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہیے کہ اپنے بھائی کو پانی اور شجر (درخت) میں گنجائش دے اور اس درخت سے مراد وہی چرے جانے والے درخت ہی ہو سکتے ہیں البتہ "الکلاء" کے بجائے یہاں الشجر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ حکم گھاس اور ان درختوں کو بھی عام ہے جنہیں چوپائے اور مویشی چرتے ہیں۔ نیز ایک مشہور حدیث "حمی" (رکھت) کے باب میں ہے کہ ابیض بن حمال نے اراک (پیلو) کے متعلق دریافت کیا کہ اس کو حمی (رکھت) یعنی اپنے اونٹوں کے لئے اس کے جنگل کو کوئی مخصوص کر سکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما لم تنله اخفاف الابل۔

ہاں، اگر اونٹوں کے قدم اگر وہاں نہ پہنچتے ہوں تو جائز ہے۔

ابوعبید نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حکم نبوی کے ان درختوں سے متعلق ہو سکتا ہے جو کسی کی ملکیت ہوں یعنی مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی صرف اپنے مویشیوں کے لئے کوئی مخصوص نہیں کر سکتا کیونکہ غیر مملوکہ زمین کے پیلو کو حمی (رکھت) بنانے کا تو کسی کو کیا اختیار ہے خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے ہوں جن اونٹوں کی دسترس سے باہر ہوں یا نہ ہوں۔ پس مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مملوکہ زمین کے پیلو کو بھی رفاہیت عامہ کے خیال سے حمی نہ بنانا چاہیے اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ "الکلاء" کا لفظ تنہ دار اور غیر تنہ دار ہر قسم کی چری جانے والی روئیدگیوں کو عام ہے اور یہی واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مویشیوں کی چرائی میں سہولت پیدا کرنی ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو حتی الوسع پبلک کا عام مشترک سرمایہ قرار دیا جائے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں چراگاہوں کی چند مثالیں بیان کی ہیں۔

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ کسی گاؤں یا آبادی کی کوئی چراگاہ اور جنگل جھاڑ اور گاؤں کا کوئی بھی باشندہ اس زمین کا مالک نہیں ہے بلکہ

فقد عرفت انها لهم فهي لهم على حالها.

تم کو یہ معلوم ہو چکا کہ یہ چراگاہ (یا جنگل جھاڑیاں) ان گاؤں والوں کی ہیں پس وہ اسی طرح لوگوں کی اپنے حال پر رہیں گی۔

گاؤں والوں کی اس زمین میں اجمالی ملک ثابت ہوگی اب دیکھا جائے گا کہ اس گاؤں کے باشندوں کی مویشیوں وغیرہ کے لئے کوئی دوسری چراگاہ یا کچھ ارضہ وغیرہ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ایسی صورت میں۔

فليس لهم ان يمنعوا الكلاء والانعام ولا اصحاب المواشي ان يرعوا تلك المروج ويستقوا من تلك المياه.

گاؤں والوں کو اس کا حق نہ ہوگا کہ عام مویشی والوں کو اس قسم کی چراگاہوں اور مرغزاروں میں چرائی سے روکیں اسی طرح مویشی والوں کو اس کا بھی حق ہے کہ یہاں جو پانی ہو اس سے استفادہ کریں (خود پئیں جانوروں کو پلائیں)

اور اگر یہ شکل نہیں ہے بلکہ

لم يكن لاهل هذه القرية الذين لهم هذه المروج وفي ملكهم موضع مسرح ومرعى لدوابهم ومواشيهم غير هذه المروج.

اس گاؤں والوں کے لئے جن کی یہ چراگاہیں ہیں ان کے لئے بجز ان کے چرائی کی کوئی دوسری جگہ نہ ہو اور نہ کوئی دوسری چراگاہ ہو جس میں ان کے جانور اور مویشی چر سکتے ہوں۔

اور اس کے ساتھ صورت حال یہ ہو کہ

متى اذنوا للناس في رعي تلك المروج والاحتطاب منها اضر ذلك بهم وبمواشيهم ودوابهم.

اگر عام لوگوں کو ان زمینوں سے مویشی چرانے اور ہر شخص کو لکڑی کاٹنے کی اجازت دیدیں گے تو بات ان کے لئے اور ان کے مویشیوں اور چوپاؤں کے لئے نقصان کا (باعث ہوگی)

قاضی ابو یوسف کا ایسی حالت میں یہ فتویٰ ہے کہ

كان لهم ان يمنعوا من اراد ان يرعى فيها او يحتطب منها.

اس قسم کے گاؤں کے باشندوں کو بھی حق ہے کہ عوام کو اپنی چراگاہوں میں چرانے سے روکیں اور اس سے منع کریں کہ کوئی اس کی جھاڑیوں سے لکڑیاں کاٹے۔

بہر حال حدیث نے "الکلاء" کو جب پبلک کا مشترک سرمایہ قرار دیا ہے تو ایسی صورت میں انفرادی ملکیت تو

اس پر طاری نہیں ہو سکتی لیکن "اشتراک" میں کچھ حد بندی اس وقت ہو سکتی ہے جب دوسرے گاؤں والوں کی شرکت سے خود اس گاؤں والوں کا نقصان ہو جن کی طرف یہ چراگاہ منسوب ہے اور یہ حال تو ان چراگاہوں کا ہے جن کی زمین کسی شخص کی واحد ملکیت میں نہیں ہے بلکہ یا تو ان کا کوئی مالک ہی نہیں ہے یا سارے گاؤں کی وہ ملکیت مشترک ہے۔ لیکن اگر کسی شخصی اور انفرادی ملکیت والی زمین میں "الکلاء" ہو تو باوجود زمین کے مالک ہونے کے "الکلاء" کا وہ قانوناً مالک نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے

اما الكلاء الذي ينبت في ارض مملوكة فهو مباح غير مملوك.

الکلاء (گھاس) جو کسی مملوکہ زمین میں ہو (اس سے استفادہ کا حق ہر شخص کو حاصل ہے) یعنی مباح و جائز ہے اور اس الکلاء کا کوئی مالک نہیں ہے۔

اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پانی کا ہے کہ اگر اس الکلاء کے سوا لوگوں کو اپنے مویشیوں کے لئے چرائی میسر آسکتی ہو تو پبلک کا حق ہے کہ اس کو مجبور کریں کہ ان کے مویشیوں کو اپنی زمین میں آنے دے یا گھاس کٹوا کر لوگوں کے حوالہ کرے اور دونوں شکلوں پر راضی نہ ہو تو بزور اپنے حق کو اس سے لوگ حاصل کریں۔

یہ حکم تو الکلاء کا اس وقت تک ہے جب تک زمین میں لگا ہوا ہے لیکن زمین سے الگ کر لینے کے بعد جو اس پر قبضہ کرے گا وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ ٹھیک جو حال پانی کا تھا کہ برتن میں محفوظ کر لینے کے بعد انفرادی ملکیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ہدایہ میں ہے۔

اذا قطعه صاحب الارض واخرج في ملكه.

جب اس کا مالک الکلاء کو کاٹ لے اور نکال لے تو پھر اس کا وہ مالک ہو جاتا ہے

"صاحب الارض" (مالک زمین) کی قید اتفاقی ہے بلکہ جو بھی کاٹ کر اس پر قبضہ کرے گا مالک ہو جائے گا اور اب اس کو وہ اسی طرح بیچ سکتا ہے جیسے برتن اور مشک کے پانی کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ فقہ کا عام مسلک تو یہی ہے لیکن حنفی فقہا نے بعد کو اس میں کچھ تفصیل بھی کی ہے یعنی دیکھنا چاہیئے کہ "الکلاء" قدرتی طور پر پیدا ہوا ہے یا مالک زمین نے مصنوعی تدبیروں سے اس کو اگایا ہے دوسری صورت میں ان کا خیال ہے کہ

اذا استقاه وقام عليه ملكه. (ہدایہ)

اگر زمیندار (صاحب الارض) نے اس الکلاء کو سینچا ہے تو ایسی صورت میں اس کی ملکیت قائم ہو جائے گی۔

حدیث کے ظاہر معنی پر اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

الصحيح جواب ظاهر الرواية لان الاصل فيه هو الاباحة.

ظاہر روایت میں اس مسئلہ کا جو جواب دیا گیا ہے وہی درست ہے۔ کیونکہ "اصل" تو یہی ہے کہ "الکلاء" سے استفادہ کا عام حق دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں فقہاء ایک اور مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی میں ایک لفظ "مرج" ہے جس کی جمع "مروج" ہے۔ یہ اردو کے "رمنہ" یا "کچھ" کے ہم معنی ہے۔ غالباً فارسی کا "مرغزار" "مرجزار" بھی اسی کی کوئی صورت ہے۔ لیکن ایک اور لفظ "اَجمہ" کا ہے جس کی جمع آجام ہے۔ علامہ مطرزی مغرب میں اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں الاجمة الشجر الملتف یعنی (گھنے درختوں) کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ لغوی معنی ہوئے۔ پھر فقہاء جس محاورہ میں اس کو استعمال کرتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں۔

وقولهم جميع السمك في الآجام يريدون البطيحة التي منبت القصب والبردي

مچھلیوں کا آجام میں رہنا، یہ فقہاء کہتے ہیں تو آجام سے مراد وہ دلدل زمین ہوا کرتی ہے جو نرسل یا کلک کے اُگنے کی جگہ ہے۔

بنا بریں معلوم ہوتا ہے کہ نشیب والی ریتلی زمینوں کے گہرے حصوں میں برساتی پانی جو جمع ہو جاتا تھا اور اس کے ارد گرد یا خود اس میں "نیستان" بن جاتا تھا اس کو آجام کہتے ہیں۔ چونکہ پانی بھی اس میں جمع ہو جاتا تھا اس لئے اس میں مچھلیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آجام در اصل آبی نیستان کو کہتے ہیں۔ فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کیا ان کا شمار بھی مروج اور جنگلوں کے ذیل ہوگا اور انفرادی ملکیت اس کی درست ہو سکتی ہے یا نہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس کا کلیہ یہ لکھا ہے کہ اس زمین کو دیکھنا چاہیے جس میں اجمہ ہے۔ اگر زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں ہے تو نیستان (اجمہ) بھی کیا تمام غیر مملوکہ زمینوں کا حکم یہ ہے کہ

فان لم تكن في ملك احد ملك فلا باس ان يحتطب منه جميع الناس كاشجار الجبال والمروج والاودية والشجر ما لم يغرسه الناس ولا باس بان ياكل من ثمارها ويتزود ما لم يعلم ان ذلك في ملك انسان وكذلك الكلأ الذي يوجد في الجبال والغياض.
(الخراج)

اگر اس زمین میں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہے تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہر قسم کے لوگ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کے لے جائیں جیسے پہاڑوں، مرغزاروں، درختوں اور وادیوں اور ندیوں وغیرہ کے درختوں اور ان کے پھلوں کا حال ہے کہ جب تک کسی خاص شخص نے ان کو نہ لگایا ہو ہر شخص کو ان سے استفادہ کا حق ہے اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اس قسم کے درختوں کے پھلوں کو آدمی کھائے یا توشہ کر لے جائے۔ عام استفادہ کا حق اسی وقت تک ہے جب تک ان پھلوں اور درختوں کے متعلق معلوم نہ ہو کہ کسی خاص شخص کی ملکیت میں ہیں۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں جو گھاس پایا جاتا ہے ان کا بھی یہی حال ہے۔

لیکن اگر زمین کسی کی مملوکہ ہے تو جز "لکڑی" کے سوا اس کی اور پیداواروں میں تصرف کرنے کا حق مالک کی

اجازت کے بغیر جائز نہ ہوگا۔ خواہ زمین کے مالک نے اسے بویا ہو یا خودرو ہو۔ بدائع میں ہے۔

ليس لاحد ان يحتطب من اجمة رجل الا باذنه لان الحطب والقصب مملوكان لصاحب الاجمة بنبات على ملكه وان لم يوجد منه الانبات اصلا.

ایسا اجمہ (نیستان) جو کسی خاص شخص کی ملک میں ہو اس کے متعلق کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی لکڑیاں کاٹے، کیونکہ لکڑی اور نرسل دونوں اجمہ کے مالک کی ملک ہیں جو زمین سے پیدا ہوئی ہیں مالک زمین کی ملک میں اگرچہ ان کے اُگانے میں مالک زمین نے کوئی کام نہ کیا ہو یعنی خودرو ہوں جب بھی اسی کی ملک قرار پائیں گے۔

بہرحال اس باب میں کلیہ وہی ہے جو صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ

الاصل ان يكون من المملوك مطرحا الا ان الاباحة في بعض الاشياء ثبت على مخالفة الاصل بالشرع والشرع ورد بها في اشياء مخصوصة فيقتصر عليها.

اصل یہ ہے کہ مملوکہ چیز سے جو چیز پیدا ہوگی وہ بھی مملوکہ ہی ہوگی۔ لیکن اس اصل کے خلاف بعض چیزوں میں شریعت نے "اباحت" کا قانون نافذ کیا ہے۔ یعنی استفادہ کا حق ہر شخص کو دیا ہے لیکن اباحت کا یہ قانون چند مخصوص چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے حکم بھی ان ہی تک محدود رہے گا۔

تیسرے اشتراکی سرچشمہ آگ کے احکام

اب تیسرا جز "نار" رہ گیا ہے۔ جسے حدیث میں عام پبلک کی مشترک چیز قرار دیا گیا ہے۔ فقہاء نے اس کی بھی کچھ تفصیل کی ہے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں

النار اسم الجوهر المضئ المحرقة علوا.

آگ ایک تابناک روشن جوہر کا نام ہے جو ہمیشہ اوپر کی طرف متحرک رہتی ہے۔

اور اسی بنا پر فقہاء کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ

فليس لمن اوقد نارا ان يمنع غيره من الاصطلاء بها لان النبي صلى الله عليه وسلم اثبت الشركة فيها.

پس جس نے آگ سلگائی ہو اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ دوسروں کو تاپنے سے روکے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں "شرکت" ثابت فرمائی ہے۔

اور اصطلاء یعنی تاپنے کا ذکر تو بطور مثال کے کیا گیا ہے۔ ورنہ مقصد یہ ہے کہ حرارت ہو یا روشنی یا اسی قسم کا کوئی کام استفادہ کی ان تمام صورتوں کا حق ہر شخص کو ہے اور آگ یا لیمپ روشن کرنے والے کو

اس کا حق نہیں ہے کہ وہ استفادہ کے اس حق پر کوئی معاوضہ لے۔ مگر اس کے بعد سوال آگ سے نہیں بلکہ اس لکڑی یا بتی یا اس چیز سے ہے جس میں آگ پیدا کی جاتی ہے کہ کیا اس کا شمار بھی مشترک سرمایہ میں ہو جائے گا۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں۔

فاما الجمر فليس بمباح	لیکن انگارہ تو وہ آگ نہیں ہے جو مباح ہو
وهو مملوك لصاحبه	وہ جس کا اس کا مالک ہے اس لئے وہ اس کو
فله حق المنع كسائر	روک دینے کا حق اسے حاصل ہے جیسے کہ اور
املاكه.	ملکیتوں میں بھی حق اس کو دیا گیا ہے۔

اگرچہ جزئیات کا اور طویل سلسلہ موجود ہے لیکن اس باب میں اسلام کے جو اصلی نقطہ نظر ہے ایک حد تک ان کی بحث ختم ہو گئی۔ اب اس سلسلہ کی صرف ایک چیز رہ جاتی ہے یعنی "شوارع عام"۔

عام شوارع اور راستوں کے احکام

جن کی حیثیت اسلام ہی میں نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے تمام قوانین اور دستوروں میں آبادی کے عام باشندوں کے مشترک مفاد کی ہے اسلامی مقننین نے بھی اس کی اس حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ بغیر کسی اختلاف کے فقہ کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ

ما كان من الشوارع	راستے اور بے، شہر کے میدان ہوں کہ
والطرقات والرحاب	جو آبادیوں کے درمیان ہوتے ہیں
بين العمران فليس لاحد	ان کے متعلق کسی کے لئے جائز نہیں ہے
احياؤه.	کہ ان کو آباد کرے۔

یعنی کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ بطور انفرادی ملکیت کے ان پر قبضہ کر کے ان کو اپنی ملکیت بنائے مثلاً ان پر مکان بنائے یا اس قسم کا کوئی تملیکی تصرف کرے۔ مندرجہ بالا عبارت کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف سڑکوں اور کوچوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "الرحاب" یعنی شہروں کے بیچ کی میں جو میدان مختلف مزدوروں کے لئے مثلاً کھیلنے کودنے کے لئے یا اس زمانے میں جو سیرگاہیں بنادی جاتی ہیں یہ بھی پبلک کے مشترک مفاد میں داخل ہو جاتی ہیں اور ان میں بھی کسی شخص واحد کو مالکانہ تصرفات کا حق نہیں ہے۔ اس قانون کی تفصیل کرتے ہوئے فقہا نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ حکم صرف انہی سڑکوں یا گلیوں یا میدانوں تک محدود نہیں ہے جن پر تصرف کرنے سے عام مخلوق کو تکلیف ہوتی ہو بلکہ تکلیف ہو یا نہ ہو زمین کا ہر وہ حصہ جو عام گزرگاہ کی حیثیت کسی آبادی میں اختیار کر چکا ہے سب کے لئے یہ حکم عام ہے۔ ابن قدامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

سواء كان واسعا او ضيقا	خواہ کشادہ ہوں یا تنگ اور خواہ ان میں
وسواء ضيق على الناس	تنگ کرنے سے لوگوں پر تنگی پیدا ہوتی
او لم يضيق.	ہو یا نہ ہوتی ہو۔

سلطانوں میں شاہراہوں اور شہر کے ان مقامات میں عام باشندوں کے مفاد کو کس حد تک اہمیت حاصل ہے

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس حکم کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب مغنی لکھتے ہیں۔

لان ذلك مشترك فيه	کیونکہ عام مسلمانوں میں یہ چیز مشترک
المسلمون وتتعلق به مصلحتهم	ہے اور ان کی مصلحتیں اسی سے متعلق ہیں یہ تو
فاشبه مساجدهم	گویا مسلمانوں کی مسجدوں کی طرح کا مسئلہ ہے

عام راستوں کا اسلام میں احترام

مندرجہ بالا فقرہ میں فاشبه مساجدهم کے الفاظ قابل غور ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہری حقوق کا مسلمانوں نے کتنا احترام کیا ہے اور یہی بات تو ہے کہ جب خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اماطة الاذى عن الطريق یعنی راستوں سے ان چیزوں کا ہٹانا جو راہ گیروں کے لئے باعث تکلیف ہوں۔ اس فعل کو من الايمان (یعنی ایمان کا جز) قرار دیا ہے۔ اور اس بنا پر مشہور حدیث الطهور شطر الايمان (پاکیزگی اور صفائی ستھرائی ایمان کا ایک بڑا حصہ ہے) میں دوسری چیزوں کی تطہیر و ستھرائی کے ساتھ مکانوں اور سڑکوں کی صفائی کو بھی داخل سمجھنا چاہئے جب راستوں کی صفائی کی ان حدیثوں میں اتنی اہمیت ہے تو فقہ نے شوارع و طرق کو مسلمانوں کے حقوق کے اعتبار سے اگر اشبه بالمساجد قرار دیا ہے تو ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اور اس خیال کی بھی تغلیط ہوتی ہے کہ بلدیات اور میونسپلٹی وغیرہ کے اصول و قوانین جدید مغربی تمدن کے نتائج ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی میں گفتگو ان خاص احکام کے متعلق کر رہا تھا جو شہروں اور آبادیوں کی عام گزرگاہوں وغیرہ کے متعلق ہیں کہ ان میں کسی قسم کی انفرادی ملکیت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ نہ خود ان کو اپنی ملک کوئی بنا سکتا ہے اور نہ حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ البتہ اس قسم کی سڑکوں اور گزرگاہوں پر بیٹھ کر عام طور سے جو لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں، فقہا نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ان كان مجالس يضيق على	اگر گزرگاہوں کی وہ نشست گاہیں ایسی
المارة لم يجعل له الجلوس	ہوں کہ آمدورفت کرنے والوں کو تنگی ہوتی ہو
فيه ولا يجعل الامام تمكنه	تو وہاں بیٹھ کر خرید و فروخت جائز نہ ہوگا
بعوض ولا غيره	اور نہ حکومت کے لئے جائز ہے کہ ایسے
(مغنی)	مقامات کسی کو قبضہ معاوضہ لے کر دے۔

ہاں اگر راستے کشادہ ہے کہ راہ گیروں کو کوئی تنگی نہیں پیدا ہوتی تو ایسی صورت میں

يجوز الارتفاق بالقعود	ان گزرگاہوں میں جو کشادہ اور وسیع
في الواسع من ذلك للبيع	مقامات ہوں ان پر بیٹھ کر خرید و فروخت کی

واقعہ یہ ہے کہ آج جن قوانین کا تعلق صحت و صفائی، آرائش وغیرہ سے ہے اسلامی فتاویٰ میں ان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جاننا چاہئے کہ فقہ کی کتابوں سے ان قوانین کا ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

واشترائم على وجه لا يضيق على احد ولا يضر بالمارة.

آسانی حاصل کرنا اس وقت جائز ہے جب کہ جانے والوں کی راہ میں تنگی نہ پیدا ہوتی ہو، نہ کسی اور کو۔

اس قسم کا استفادہ لوگوں سے شہر کے عام باشندے خود بھی کر سکتے ہیں اور حکومت کو بھی ایسی صورت میں (یعنی جن میں ضرر کا اندیشہ نہ ہو) اختیار ہے کہ سڑکوں بلکہ مسجدوں کے احاطہ وغیرہ میں جسے رحاب المساجد کہتے ہیں، اس قسم کے کاروبار کے لئے جگہ دے سکتی ہے۔

ابن قدامہ نے الطرق الواسعہ اور رحاب المساجد کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

وللامام اقطاعها لمن يجلس فيها.

امام (حکومت) ان مقامات کو بیٹھنے والوں کے لئے مخصوص کر سکتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی تشریح کر دی گئی ہے۔

ولا يملكها المقطع بل يكون احق بالجلوس فيها من غيره.

لیکن حکومت جس کے نام سے اس کو مخصوص کرے وہ اس کا مالک نہ ہوگا صرف دوسروں کے اعتبار سے بیٹھنے کا وہ زیادہ مستحق ہوگا۔

اسی طرح اگر اس قسم کے مقامات پر حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی خرید و فروخت کے لئے بیٹھ جائے تو

السابق احق به ما دام فيه فان ترك متاعه فيه لم يجز لغيره ازالته لان يد الاول عليه وان نقل متاعه كان لغيره ان يقعد فيه لان يده قد زالت.

جس نے آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کیا ہو تو وہی اس کا حقدار ہوگا جب تک اس پر قابض رہے گا، اگر اس قسم کے مقامات میں اپنے سامان کو چھوڑ کر چلا جائے تو کسی دوسرے کو اس کا حق نہ ہوگا کہ اس کے سامان کو اس جگہ سے ہٹائے کیونکہ ابھی پہلے آدمی کا اس پر قبضہ باقی ہے۔ اور اگر اپنے سامان کو وہاں سے ہٹا لے تب دوسرے کو حق ہے کہ اس مقام پر بیٹھ جائے کیونکہ پہلے آدمی کا قبضہ اس سے اٹھ گیا۔

بہرحال مشہور حدیث منیٰ مناخ من سبق[1] کی بنا پر ایسی صورت میں جس نے پہلے قبضہ کر لیا اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقامات میں کوئی دکان کے لئے کیا مکان یا چبوترہ وغیرہ بنا سکتا ہے؟

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

[1] منیٰ کے میدان میں جو جہاں اپنے اونٹ کو پہلے بٹھا دے گا وہی اس جگہ کا حقدار ہوگا ۱۲

ليس له البناء لا دكة ولا غيرها لانه يضيق على الناس ويعثر به العابر بالليل والضرير بالليل والنهار ويبقى على الدوام فربما ادعى ملكه بسبب ذلك.

کسی کو ان مقامات میں کسی قسم کی تعمیر کا حق نہیں ہے حتیٰ کہ چبوترہ یا چبوترہ کے سایہ کو بھی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس قسم کی چیزوں سے عام لوگ تنگی میں پڑ جائیں گے اور گزرنے والوں کے لئے خطرہ ہے کہ رات کے وقت اس سے ٹھوکر کھائیں اور پھسل کر گریں، اسی طرح شب و روز ضرر کا اس سے اندیشہ ہے اور چونکہ ایسی چیزیں دوامی ہوتی ہیں اس لئے اس کا بھی خطرہ ہے کہ آئندہ چل کر اس کی ملکیت کا دعویٰ کر بیٹھے۔

لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ

له ان يظلل على نفسه بما لا ضرر فيه من بارية وتابوت وكساء ونحوه لان الحاجة تدعو اليه من غير مضرة فيه.

ان مقامات میں بیٹھ کر خرید و فروخت کرنے والوں کو اس کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر کوئی سایہ کی چیز کھڑی کریں جس میں کسی کو ضرر نہ پہنچے۔ مثلاً چٹائی یا ٹاٹ یا کمبل یا اسی قسم کی چیزوں سے سایہ کریں اور یہ اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ اس کی اسے حاجت ہے اور دوسروں کو اس میں ضرر نہیں ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں، ان کا زیادہ تر تعلق شوارع عام یا عام گزرگاہ وغیرہ سے ہے لیکن خاص راستے اور کوچے جنہیں صرف کسی خاص مکان یا چند مکانوں کے رہنے والے ہی اپنی آمد و رفت کے لئے استعمال کرتے ہوں، ان کے احکام عام راستوں سے مختلف ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ایسی غیر مملوکہ چیزیں جن میں قبضہ کے بعد بھی انفرادی ملکیت پیدا نہیں ہوتی ان کی مختصر تفصیل کو اس نقطہ پر ختم کرکے اب ان غیر مملوکہ امور کے بھی کچھ احکام سنتے چلئے جن میں قبضہ کے بعد انفرادی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بنجر غیر آباد زمینوں کی ملکیت کے قوانین

اسلامی قانون میں ممالک محروسہ کی ایسی غیر آباد زمین اور علاقے جن کا کوئی مالک نہ ہو خواہ وہ کبھی آباد نہ ہوئی ہوں یا آباد ہونے کے بعد اس طرح ویران ہوگئی ہوں کہ ان کا کوئی مالک باقی نہ رہا ہو، ان کا اسلامی نام (موات) یا مردہ بنجر زمین ہے۔ بالعموم خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی زمینوں کی مالک حکومت ہے اور اس لئے حکومت کی اجازت کے بغیر عام طور سے دنیا میں یہی دستور مروج ہے کہ حکومت یا بادشاہ وقت کی اجازت کے بغیر ایسی زمینوں

پہاڑوں، جنگلات وغیرہ پر کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ان کو اپنی ملک بنا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں بالکل مختلف ہے وہ اس قسم کی تمام زمینوں کو بھی ملک کے عام باشندوں کا مشترک سرمایہ قرار دیتا ہے اور بجز ان چند مستثنیٰ زمینوں اور معادن کے جن کا ذکر گزشتہ فصل میں بتفصیل ہو چکا ہے۔ رعیت کے ہر فرد کا یہ قانونی حق ہے کہ ان کو بغیر کسی معاوضہ (رائلٹی) ادا کئے قبضہ کر کے اپنی ملک بنالے۔ اس باب میں مسلمانوں کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان ایک ابدی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس کے راوی تقریباً تمام محدثین ہیں، مثلاً امام مالک، امام ترمذی، ابوداؤد وغیرہ سب کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ

من احیا ارضا میتة فهی له۔	کسی مردہ غیر آباد زمین کو جو آباد کرے گا یہ زمین اسی کی ہوگی۔

اسی بنا پر علامہ مقدسی نے مغنی میں تمام ائمہ اسلام کا یہ اجماع نقل کیا ہے کہ

عامة فقهاء الامصار علی ان الموات یملک بالاحیاء۔ (مغنی ج ۶)	فقہاء امصار کا عام اس پر اتفاق ہے کہ احیاء (آباد کرنے) کی وجہ سے موات آباد کرنے والے کی ملک بن جاتی ہے۔

خواہ یہ "ارض موات" ایسی زمین ہو جو کبھی کسی کی مملوک نہ ہوئی ہو اور اس کے آباد ہونے کی نوبت نہ آئی ہو جیسا کہ وہی لکھتے ہیں ایسی زمین کہ

ما لم یجر علیه ملک احد ولم یوجد فیه اثر عمارة فهذا یملک بالاحیاء بغیر خلاف بین القائلین بالاحیاء۔	کسی کی ملک اس میں قائم نہ ہوئی ہو اور اس میں کسی آبادی کی علامت نہ پائی جاتی ہو تو بالاتفاق آباد کرنے کی وجہ سے کوئی اس کا مالک ہو جاتا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے جو آباد کرنے کو ملک کا سبب کہتے ہیں

ایسی اراضی

ما یوجد فیه آثار ملک قدیم جاهلی کآثار الروم ومساکن ثمود ونحوهم فهذا یملک بالاحیاء۔	جس میں کسی قدیم جاہلی ملک کی علامتیں پائی جاتی ہوں مثلاً روم کے آثار یا قوم ثمود کے مسکن کا حال ہے جو ایسے علاقات ہوں تو آباد کرنے سے ان کا بھی آدمی مالک ہو جاتا ہے۔

چونکہ اس قسم کی زمین اسلامی عہد سے قبل ہی سہی لیکن بنی آدم کی مملوک چیزوں میں ہو چکی تھی اس لئے شبہ ہو سکتا تھا کہ دوسرے کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنے یا اس کو ملک بنانے کا کسی دوسرے کو کیا حق ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے فرمان میں اس کی بھی تصریح فرما دی ہے کہ

عادی الارض لله ولرسوله ثم هو بعد لکم۔	عادی اراضی (یعنی اقوام قدیمہ کے مکانات یا ان کے آباد کئے ہوئے بنجر علاقے)

یہ اللہ اور اس کے رسول کی ملک ہیں، پھر ان کے بعد اے مسلمانو تمہاری ملکیت ہے۔

یعنی اس قسم کی زمین کو جب اس کے مالک چھوڑ کر لاپتہ ہو چکے ہوں اور اسلامی حکومت کے زیر نگرانی آگئیں تو اب وہ اپنے پرانے مالکوں کی ملک سے نکل کر اللہ و رسول کی ملک میں داخل ہو گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے پھر ان کو عام مسلمانوں کے حوالہ فرما دیا۔ البتہ ارض موات کی ایک قسم اور رہ جاتی ہے جو اسلامی عہد میں کسی خاص شخص کی ملکیت تھی لیکن ان کا مالک ان کو غیر آباد کر کے لاپتہ ہو گیا۔ ایسی زمینوں کے متعلق اگرچہ بعض ائمہ اسلام کی رائے مختلف ہے مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک وغیرہ کا ان اراضی کے متعلق بھی یہی فتویٰ ہے کہ

انها تملک بالاحیاء وهو مذهب ابی حنیفة ومالک (مغنی)	آباد کرنے سے وہ بھی مملوک ہو جاتی ہیں، یہی ابوحنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔

بہرحال اس قسم کی تمام "اراضی" جن کا فقہ کی اصطلاح میں "موات" نام ہے۔ دراصل یہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ جائداد ہے اور ملک کا ہر باشندہ اس کو اپنی انفرادی ملکیت بنا سکتا ہے جس کی اسلامی قانون کی رو سے دو صورتیں ہیں۔

اقطاع یا جاگیروں کا حکم ایک کو اقطاع کہتے ہیں یعنی خود حکومت اس علاقہ کو کسی شخص کے ساتھ بندوبست کر دے اور یہ امام کے صوابدید پر ہے کہ جس کو چاہے جتنی زمین کا اقطاع کر دے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایت ہے جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے کہ

اقطع رسول الله صلی الله علیه وسلم بلال بن الحارث المزنی ما بین البحر والصخر۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو دریا سے پہاڑ تک جاگیر دیا تھا (یہ اصطلاح حتی ساحل سمندر سے کسی خاص حصہ تک کی دریائی ارضی کی ہندوستان میں جیسے ریگستان وغیرہ بعض علاقوں میں ہوتے ہیں)

ابو عبید نے اپنی مشہور کتاب "کتاب الاموال" میں اس قسم کے قطائع (جاگیرات) جو بارگاہ رسالت اور عہد خلافت سے مختلف لوگوں کو عطا ہوتے رہے ہیں، ذکر کیا ہے جن سے خاص کر بلال بن حارث کی جاگیر کا ذکر قصداً اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ بڑے سے بڑا علاقہ بھی حکومت اپنے صوابدید سے جاگیر میں عطا کر سکتی ہے لیکن حکومت کے صرف اقطاع سے اس علاقہ کا وہ شخص مالک نہیں ہو جاتا ہے جب تک کہ احیاء کر کے اس پر قبضہ نہ کر لے، علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

فان اقطعه الامام شیئا	اگر موات زمین کو امام (حکومت)

والموات لمن يملك بعد ذلك — کسی کی جاگیر میں دے تو جس شخص اس سے
لكن يصير احق به. — وہ اس زمین کا مالک نہیں ہو جاتا البتہ
(مغنی) — دوسروں کے وہ اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔

اپنے اس دعویٰ کی اصولوں نے دلیل یہ پیش کی کہ عقیق میں جو جاگیر اعلیٰ بلال کے نام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقطاع کی تھی چونکہ احیاء پر قادر نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لے لی۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

لو ملكه لم يجز استرجاعه — اگر صرف اقطاع سے بلال مالک ہو جاتے
تو حضرت عمرؓ کو اس کی واپسی جائز نہ ہو سکتی تھی۔

اسلامی جاگیروں کا مطلب یہاں جاگیر کا یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ لاخراج کر دی جاتی ہے بلکہ موات کی اراضی کے عطا کرنے کے بعد اس پر "عشر" یا "خراج" بھی لگایا جا سکتا ہے اور اس معاملہ میں مختلف زمینوں کا حکم مختلف ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ خراج کے باب میں صرف امام (بادشاہ وقت) کو اتنا اختیار دیا گیا ہے کہ ملک و رعایا کے مصالح کی بناء پر مثلاً وقت پر فوجی امداد جاگیردار سے حاصل کی جائے گی یا اور کوئی ایسی مصلحت ہو تو جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے۔

يكون للامام ان يرى الصلاح — اگر امام اسی میں مصلحت دیکھے کہ زمین کا
في تفويض خراج الارض — خراج جاگیردار کو عطا کر دیا جائے تو امام
صاحب الارض فيجوز له — ایسا کر سکتا ہے اور جاگیردار کو بھی اجازت
يسعه ان يقبله. — ہے کہ وہ اس عطیہ کو قبول کرے۔

لیکن امام کے سوا حکومت کے کسی عہدے دار کو خواہ اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خراج کی معافی بلکہ تخفیف تک کا اختیار نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک ذیلی بات تھی۔ جاگیروں کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود تھا ورنہ اس کے تفصیلی مسائل تو بہت سے ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ اصل بات یہی جا رہی تھی کہ "اراضی موات" میں انفرادی ملکیت ایک تو اس احیاء (آباد کرنے) سے حاصل ہوتی ہے جو قطع کے ذریعہ سے کسی کو ملی ہو اور عام طور سے غیر آباد زمینوں کے بندوبست کرنے کا دنیا میں یہی طریقہ مروج ہے۔ اگرچہ مختلف حکومتوں کا طریق بندوبست کے شرائط اور نتائج میں مختلف ہے۔ لیکن اراضی موات کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ جو اسلام میں ہے دوسری حکومتوں کی رعایا کے لئے شاید وہ عجیب ہو۔

ملک کی غیر آباد زمینوں کے مالک ہونے کا دوسرا طریقہ میرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان یعنی،

من احيا ارضا مواتا فهي له — موات اراضی کو جو آباد کرے گا اسی کی وہ ہو جاتی ہے۔

کی بناء پر فقہاء امت کی اکثریت کا یہ فتویٰ ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمینوں اور علاقوں (اراضی موات) سے جتنا حصہ بغیر کسی معاوضہ اور واپسی کے چاہے۔ احیاء کر کے اسے اپنی ملک اور جاگیر بنالے۔ صرف امام ابو حنیفہؒ اس مسئلہ میں منفرد ہیں کہ حکومت سے بھی اجازت احیاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن عام فقہاء اسلام حکومت کی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں حتیٰ کہ امام صاحب کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مذکورہ بالا نبوی وثیقہ کی بناء پر لکھا ہے،

ان اذن رسول الله صلى الله — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت
عليه وسلم جائز الى يوم القيمة — تمام قیامت تک نافذ رہے گی۔

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان فهی له (وہ آباد کرنے والے کی ملک ہے) موجود ہے تو اس میں اب کسی دوسرے شخص سے پوچھنے اور اجازت حاصل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ البتہ حکومت کو صرف اس کی نگرانی کرنی چاہیئے کہ اس سے مفاد عامہ کو کوئی ضرر تو نہیں پہنچا۔ قاضی ابو یوسف نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں ليس لعرق ظالم حق کے الفاظ سے اسی "ضرر" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ کسی غیر آباد زمین میں (یعنی موات) میں اگر کوئی درخت نصب کرے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے تو پھر اس ظلم کا حق اس کو نہ دیا جائے گا۔

عام فقہاء اسلام سے امام صاحب کے اس اختلاف کے متعلق قاضی ابو یوسف سے پوچھا گیا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ "نبوی وثیقہ" کے ہوتے ہوئے حکومت کی اجازت کی قید امام صاحب نے کیوں بڑھائی۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا جواب امام صاحب کی طرف سے نقل کیا جاتا ہے کہ آخر بیت المال کے متعلق بھی تو عام قانون یہی ہے کہ

هو بيت مال المسلمين — یعنی اس کے مالک مسلمان ہیں۔

اور باوجود اس کے کہ امام بیت المال کا مالک نہیں ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ

للامام تعيين مصارفه — امام کو بیت المال کے رقوم کے مصارف
وترتيبه . (مغنی) — کی تعیین و ترتیب کا حق ہے۔

اسی طرح زمین کے متعلق بھی امام کو نظم و ترتیب میں بھی دخل دینا چاہیئے۔ ورنہ رعایا میں باہمی کشمکش کی ترشح کے بعد جھگڑے کا خطرہ رہے گا۔ لیکن لوگوں نے امام صاحب کی اس توجیہ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ پوچھا گیا ہے کہ کیا ہوا کے ہر پرندے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی حکومت کی اجازت درکار ہے؟ آخر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اراضی موات کو تمام مسلمانوں کے لئے مباح قرار دیا اور سند دے دی کہ جو اس کو آباد کرے گا اسی کی وہ زمین ہو جائے گی۔ اس کے بعد حکومت سے

اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔

بہرحال یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ موات کی اراضی کو احیاء کے ذریعہ سے اپنی ملک کر جاگیر بنا لینے کا اختیار صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی رعایا کے ہر فرد کو ہے مسلم ہو یا غیر مسلم اور یہ امر صرف قیاسی تجویز نہیں ہے بلکہ فقہ کی کتابوں میں ہمیشہ اس کی تصریح کر دی جاتی ہے مقدسی لکھتے ہیں۔

لا فرق بين المسلم	موات زمین کو آباد کر کے اپنی ملک بنا لینے میں
والذمي في الاحياء وبه	مسلم اور ذمی (غیر مسلم رعایا) میں کوئی فرق نہیں
قال ابوحنيفة۔	یہی امام ابوحنیفہ کا بھی مذہب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا کوہستانی، جزیرہ ہو یا خشکی کا خطہ، جنگل ہو یا بیابان، ملک کا ہر باشندہ جتنی زمین چاہے موات اراضی میں سے آباد کر کے ان کو اپنی ملک کر جاگیر مفت بنا سکتا ہے۔

قاضی ابویوسف کے الفاظ یہ ہیں

كل ما عالج في اجمة او	اجمہ (بن یا جنگل) ہو یا تری کا علاقہ ہو یا
من بحر او من جزيرة او	خشکی کا، اگر کسی خاص انسان کی ملکیت
لا يكون فيه ملك لانسان	وہ نہیں ہے اور محنت مشقت کر کے جس نے
فاستخرجه رجل وعمل فهو له	اس کو درست کیا اور آباد کیا تو اس کا ہو جائیگا
بمنزلة الموات۔	جیسے موات اراضی کا حال ہے۔

مثلاً دجلہ و فرات جیسے دریاؤں میں عموماً بڑی بڑی زمین باہر نکل آتی ہیں۔ اگر ان کے آباد کرنے میں کسی کا ضرر نہ ہو تو ان کا حکم بھی مثل ارض الموات ہے۔

یعنی اس جزیرہ کا آباد کرنے والا قانوناً مالک ہو جائے گا۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ "احیاء" یا آباد کرنے کا لفظ جو اس سلسلہ میں برابر استعمال ہو رہا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ محض کھیتی کرنا یا بنانا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے۔

احياء كل واحدة من	ان میں ہر چیز کی احیاء کا مطلب یہ ہے کہ
ذلك تهيئتها للانتفاع الذي	جو نفع اس سے مقصود ہو اس کے لئے
اريدت به۔	اس کو تیار کیا جائے۔

یعنی آبادی صرف زراعت یا باغبانی پر منحصر نہیں ہے۔ مکان بنا کر یا دوابگاہ (مویشی رکھنے کی جگہ) یا لکڑی وغیرہ جیسی چیزوں کو رکھنے کی جگہ بنانا یہ سب احیاء میں داخل ہے۔ علامہ مقدسی نے بطور مثال کے چند چیزوں کا ذکر کیا ہے مقصد کے سمجھانے کے لئے ہم بجنسہٖ نقل کرتے ہیں،

فاما الدار فاحياؤها يبني	گھر کے احیاء کا مطلب یہ ہے کہ اس کی
حيطانها مما جرت	دیواریں کھڑی کی جائیں یعنی جس طرح
به العادة وتسقيفها	اس ملک میں دیواروں کے بنانے کا رواج ہو

لانها لا تكون مسكنا الا	ویسی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو اور اس کی
بذلك واما الحظيرة	چھت پاٹ دی گئی ہو، کیونکہ رہنے کے
فاحياؤها بحائط	قابل بغیر اس کے نہیں ہو سکتا، اسی طرح
جرت به عادة مثلها	حظیرہ (احاطہ) کی احیاء کا مطلب یہ ہے کہ
ليس من شرطها التسقيف	جس قسم کی دیوار گھیر کر احاطہ بنانے کا رواج
لان العادة ذلك من	اس ملک میں جاری ہو ایسی، چھت پاٹنے کی
غير تسقيف سواء اراد	ضرورت اس کی احیاء میں نہیں ہے کیونکہ
حظيرة المواشي او الخشب	عام طریقہ یہی ہے کہ ان احاطوں کے لئے

چھت نہیں پاٹتے خواہ مویشی کے لئے احاطہ بنایا جائے یا لکڑی کا گودام بنایا جائے۔

الغرض آباد کرنے کی جو غرض ہے اس کا سامان مہیا کرنا یہی اس کی احیاء ہے۔ مثلاً کھیتی ہے تو اس کا جوتنا ہرائی کا استحکام کرنا یہی اس کی احیاء ہے مقدسی لکھتے ہیں کہ زراعت کی احیاء کی صورت یہ ہے۔

ان يسوق اليها ماء	کہ کوئی اس کی طرف کسی نہر سے یا کنوئیں سے
من نهر او بئر وان كانت	پانی لے جائیں، اور اگر زمین ایسی ہو جس
مما لا يمكن زرعها	میں کھیتی نہ ہو سکتی ہو مثلاً کثرت سے اس
لكثرة احجارها كارض	میں پتھر ہوں جیسا کہ حجاز کی زمین کا حال
الحجاز فان يقلع احجارها	ہے تو اس کی احیاء کے معنی یہ ہوں گے کہ
وينقيها حتى يصلح	پتھروں کو زمین سے باہر نکالا جائے اور
للزرع وان كانت غياضا	زمین صاف کی جائے حتی کہ کھیتی کے قابل
واشجارا كارض الشعرى	ہو جائے اور اگر غیر (ساحات) زمین میں
فان يقلع اشجارها	جنگل جھاڑ جھنڈ درخت ہوں جیسا کہ شعریٰ
ويزيل عروقها التي	کی زمین کا حال ہے تو اس کی احیاء کے
تمنع الزرع۔	معنی یہ ہیں کہ درخت اکھاڑے جائیں

اور ان جڑوں کو کھود کھود کر نکال دیا جائے جن سے کھیتی میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہو۔

بہرحال ہر چیز خواہ مزروعت کی احیاء خود اس ضرورت کے حسب حال ہوتی ہے اور جیسا کہ علامہ مقدسی نے لکھا ہے کہ اس باب میں اعتبار زیادہ عرف عام اور رواج کا ہے۔ آباد کرنے کا اطلاق جس کام پر کیا جاتا ہو وہی اس کی احیاء ہے۔

رعایا کی اسلام میں تبلیغی قوت

اس کے بعد خواہ اقطاعی (حکومت کی بندوبست کی ہوئی) جاگیر ہو یا خود کسی نے ارض موات پر قبضہ کر کے احیاء کر لیا ہو یہ آباد کرنے والے کی انفرادی ملک بن جاتی ہے۔ اقطاعی جاگیرات کا حکم احیاء کے بعد جو ہو جاتا ہے قاضی ابویوسف لکھتے ہیں،

فلا یحل لمن جاء من	بعد کو جو خلفاء ہوں ان کے لئے جائز
بعدھم من الخلفاء ان	نہ ہوگا کہ (کسی امام کی عطا کی ہوئی جاگیر)
یرد ذلک ولا یخرجہ من	اس شخص سے واپس لیں جس کے قبضہ میں
ید من ھو فی یدہ وارثا	وہ جاگیر خواہ بطور وراثت کے پہنچی ہو یا
او مشتریا۔ (ص ۳۴)	کے ذریعہ سے اس تک پہنچی ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ جس نے آباد کی ہو خود اس کے پاس یا اس آباد کرنے والے سے کسی کو وراثت میں ہو یا آباد کرنے والے سے کسی نے خریدی ہو، کسی سے بھی حکومت اس کی مملوکہ زمین چھین نہیں سکتی امام صاحب نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ

فاما ما اخذ الولاة من	اور حکومت کے ولاۃ (صوبہ داروں،
ید واحد فاقطعوھا	گورنروں) وغیرہ کا جو طریقہ ہے کہ جاگیر کو
آخر فھو بمنزلۃ الغاصب	ایک شخص کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کو
غصب واحد او اعطی	جاگیر میں دیدیتے ہیں تو اس کی صورت
آخر (کتاب الخراج ص ۳۴)	(وہی) ہے جو غاصب اور زبردستی چھیننے والوں

کی ہوتی ہے یعنی ایک شخص سے اس کی مملوکہ چیز زبردستی چھین کر دوسرے کو دیدے۔

دوسری جگہ مزید صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اما من اخذ من واحد	اور وہ جو ایک شخص سے جاگیر چھین کر دوسرے
واقطع آخر فھذا بمنزلۃ	کو جاگیر میں دی جاتی ہے تو اس کی حیثیت
مال غصبہ من واحد	اس مال کی ہے جو ایک شخص سے چھین کر
واعطی واحد (ص ۳۴)	دوسرے کو دے۔

اسی طرح اراضی موات کو آباد کر کے جس نے اپنی مملوکہ جاگیر بنالی ہے اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں

ولیس للامام ان یخرج	امام (حکومت) کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ
شیئا من ید احد (ص ۳۵)	کسی کے قبضہ اور ملک سے زمین کو چھین لے۔

اسی دفعہ کی تعبیر دوسرے الفاظ میں دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

فلا یحل الامام ولا یسعہ	امام (حکومت) کے لئے جائز نہیں ہے
ان یقطع من الناس	اور نہ قانوناً اس کے لئے اس کی گنجائش
حق مسلم ولا معاھد	ہے کہ کسی مسلمان یا جس سے اسلامی حکومت نے
ولا یخرج من ید احد	معاہدہ کیا ہو اس کے حق کو اس سے منقطع کرے
ذلک شیئا۔	نہ کر سکتی ہے کہ اس کے قبضہ سے کوئی چیز نکالے

دوامی بندوبست | یعنی یہ حکم حکومت کی مسلم غیر مسلم ہر قوم کی رعایا کے لئے عام ہے گویا ان زمینوں کی

حیثیت بندوبست دوام کی ہو جاتی ہے اور جاگیردار کو اختیار رہے گا خواہ وہ خود اس کو آباد کرے یا کسی اور ذریعہ سے آباد کرائے قاضی صاحب لکھتے ہیں،

فمن احیاھا وھی کذلک	جس نے اس زمین کو آباد کیا ہو اور وہ
فھی لہ ویزرعھا ویزارعھا	اس حال میں ہو تو اس زمین کا مالک
ویواجرھا ویکری منھا الانھار	اس کا آباد کرنے والا ہوگا اسے حق ہے
ویعمرھا بما فیہ مصلحتھا۔	کہ اس میں خود کاشت کرے یا کسی سے
(ص ۳۶)	کاشت کرائے یا کسی کو کرایہ پر دے۔

اسے اس کا بھی حق ہے کہ اپنی زمین میں نہر کھودے اور اس کا بھی کہ جس قسم کی عمارت اور آبادی جس میں مصلحت ہو اپنی زمین میں قائم کرے۔

البتہ اس پر حکومت کی جو مالگزاری عائد کی گئی ہو صرف اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے۔

فان کانت فی ارض العشر	اگر اس کی یہ زمین عشر کی زمین ہو
ادی عنھا العشر وان کانت	تو اس سے عشر ادا کرے گا، اور اگر
فی ارض الخراج ادی عنھا	خراجی زمین ہو تو اس سے خراج
الخراج۔	ادا کرے گا۔

تحجیر کا مطلب اور حکم | عشر و خراج کی عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے اس کی تفصیل مناسب موقع پر آگے آتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی غیر آباد زمین کے حدود میں صرف پتھر نصب کر کے یا کانٹوں وغیرہ سے گھیر کر اس کو اپنی مملوکہ زمین قرار دینا صحیح نہیں ہے، فقہاء میں اس عمل کا نام تحجیر ہے چونکہ یہ زمین کا احیاء نہیں ہے۔ اس لئے ملکیت تو پیدا نہ ہوگی البتہ بہ نسبت دوسروں کے اس کے حق کو گونہ ترجیح ہوگی۔ مگر وہ بھی ایک خاص مدت تک جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اپنی حکومت کی رعایا کی معاشی سہولتوں کے کتنے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ آج جبکہ دنیا میں کوئی ایک انچ زمین پر بھی بلا معاوضہ قبضہ نہیں کر سکتا اس سے اس وقت کا اندازہ لگانا چاہیے اور اسی لئے میں نے اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل سے کام لیا کیونکہ اسلامی حکومت کا نظام جب سے ناپید ہو گیا ہے۔ لوگ ان واقعات کو بھول گئے ہیں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان تک میں حکومت مغلیہ کے آخری دور تک زیادہ تر اسی قسم کی معاشی سہولتیں آباد کاروں کو حاصل تھیں۔

بہرحال یہ احکام تو غیر مملوکہ امور سے متعلق تھے۔ اب بحث ان چیزوں پر کرنی چاہیے جو کسی کی ملک میں داخل ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مالک کی مرضی کے بغیر ان پر قبضہ کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ پھر ایسی مملوکہ چیزیں جن پر مالک کی مرضی کے بغیر بھی قبضہ کر کے ان کو اپنا مملوک بنایا جا سکتا ہے اس کی بھی اسلام میں دو شکلیں ہیں۔

مالک کی مرضی کے بغیر کسی چیز پر قبضہ کرنا

(۱) اسلامی حکومت کی رعایا کا اگر مال ہو تو مالک کی مرضی کے بغیر صرف دو شکلوں میں اس پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے ایک کی فقہی تعبیر لقطہ ہے۔

لقطہ کا مطلب

یعنی گرا پڑا ہوا مال اگر کسی کو مل جائے تو بعض صورتوں میں یہ جائز ہے کہ آدمی اس پر قبضہ کر لے بلکہ اس خرد و مادہ ساتھ میں ان کو اپنے تصرف میں بھی لا سکتا ہے۔ لیکن جب کبھی اصل مالک کا پتہ مل جائے اور وہ اس کا مطالبہ کرے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔ چونکہ اس باب کا تعلق معاشیات سے نہیں ہے کہ یہ آمدنی کی نہایت نادر شکل ہے۔ اس لئے اس کی تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں۔

قانونی شفعہ

دوسری شکل شفعہ کی ہے یعنی املاک و شرکت یا پڑوس کی وجہ سے اسلام نے ملک کے باشندے کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ آدمی دوسرے کی خریدی ہوئی چیز کو زبردستی دام ادا کر کے اپنی ملک بنا لے مثلاً کسی مکان یا زمین میں دو آدمی یعنی زید و عمر شریک ہیں۔ اگر عمر کے حصہ کو خالد خرید لے تو زید کا یہ قانونی حق ہے کہ جس دام میں خالد نے اس کے شریک کے حصہ کو خریدا ہے ادا کر کے خالد کی رضامندی ہو یا نہ ہو خرید لے قانون اس جبری خریداری کو نافذ کرائے گا معلوم نہیں اس باب میں دنیا کے دوسرے قوانین کا کیا حال ہے لیکن اس قانون کی وجہ سے اسلامی حکومت کی رعایا کو دکانوں، کھیتوں، باغوں وغیرہ کے متعلق کتنی آسانیاں بہم پہنچتی ہیں اور پہنچ سکتی ہیں۔ اس کا اندازہ تجربہ سے ہو سکتا ہے۔ خصوصاً حنفی مذہب میں اس قانون کو ملکی شرکت سے آگے بڑھا کر مرافق (مثلاً راستہ، نالی آبپاشی وغیرہ) کی شرکت اور جوار (پڑوس) کی شرکت تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ فقہ کا یہ ایک طویل باب ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے اس مسئلہ میں صرف اتنا بیان ہی کافی ہو سکتا ہے۔

غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات

(۲) غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں۔ اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومت کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ[1] اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانون جنگ سے ہے اسی سلسلہ میں غنیمت، فئی، متعلقات فئی وغیرہ کی آمدنیاں ہیں۔ علاوہ ان کے یا دو کا نفت وغیرہ کے جاسوسی فوجوں کو حکومت سے ملتے تھے۔ چونکہ لڑنے والے ہر سپاہی کو غنیمت سے بھی حصہ ملتا تھا اس لئے مسلمانوں میں آمدنی پیدا کرنے کا یہ بھی ایک بڑا آسان اور یقینی ذریعہ تھا اور ان کی معاشی فراخبالیوں پر اس قانون کا کافی اثر مرتب ہوتا تھا۔ چونکہ اس آمدنی کا تعلق معمولی کاروبار سے نہیں ہے بلکہ اس کی اکثر شکلوں کا

[1] العیاذ باللہ کا فقرہ میں نے اپنے نفس کی تنبیہ میں لکھا ہے تاکہ معلوم ہو کہ مسلمانوں پر ایک وہ وقت بھی گذرا ہے جب غیر اسلامی اقوام کے تسلط کو اپنے اوپر ناقابل برداشت تصور کرتے تھے۔ پھر آسمان نے وہ رخ پلٹا اور جس کا سوچنا بھی ناگوار تھا اسے دیکھنا پڑا اور کیسا دیکھنا!

تعلق حکومت سے ہے۔ اس لئے اس باب کی بھی تفصیل کی یہاں حاجت نہیں۔ البتہ اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں پہلے طے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کی رعایا کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے مباح اور جائز ہے۔ یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے اور ان سے اگر کوئی مسلمان اس مال کو خریدے تو قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ اسی لئے اس کا لینا جائز ہوگا۔

غنیمت و فئی کی حلت کی وجہ

پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لئے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا بھی مال مباح و جائز ہے یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں۔ یہ غنیمت (یعنی غیر اسلامی حکومت کے لوگوں سے جو مال بزور حاصل کیا جائے) اور فئی (جو مال غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کا بغیر کسی جنگ و جدال کے مسلمانوں کے قبضہ میں آ جائے) ان دونوں قسم کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی بنا پر ہو جاتے ہیں کہ ان لوگوں کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لئے مباح اور جائز قرار دیا ہے۔

غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم

اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہو گیا۔ یعنی غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے مثلاً ربوا (سود) یا قمار یا اس قبیل کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آ جائے تو کیا قانوناً مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے اور مباح و جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اسی پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس قسم کا مال مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے اور یہی ان کا مشہور مسئلہ ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

لا ربوا بین الحربی والمسلم

الحربی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) والمسلم (اسلامی حکومت کا باشندہ) میں ربوا سود نہیں ہے۔

کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ بین الاقوامی قانون کا ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشا سے واقف نہیں ہیں اس لئے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے یہ حرام ہونا چاہیے۔ حربی یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی! مگر یہی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ کر کے اسے اپنی ملک بنانا ہے۔ اس قانون سے پہلے ایک اور قانون کا ذکر کتابوں میں کیا جاتا ہے کہ

لا ربوا بین العبد والمولیٰ   یعنی درمیان غلام اور اس کے آقا کے ربوا (سود) کا معاملہ نہیں ہے۔

یعنی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے گا تو وہ ربوا نہ ہوگا یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربوا اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے۔ جیسا اس کو بعض ایک اعتراض کیا ہے۔ بلکہ بات وہی ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا ہے۔ پس آقا نے غلام سے جو کچھ لیا وہ اس کا مال نہیں اپنا مال لیا اور اپنا مال کسی پر کیوں حرام ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی اپنی آمدنی کے مختلف مدوں کو مختلف مصارف کے لئے معین کر دیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات کسی ایک ضرورت کے لئے دوسری مد کی آمدنی سے قرض کے نام سے لیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس قرض میں وہ کچھ سود بھی لگا کر اس مد میں جمع کر دیا کرے جس سے اس نے قرض لیا تھا تو کیا واقعی لفظاً سود ہے وہ سود ہو جائے گا اس نے تو اپنے ہی روپے کو اپنے مال میں ملایا ہے خواہ کسی نام سے ملائے۔ قانوناً فقہاً کوئی اس کو سود نہیں کہہ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے یہاں کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علماء[1] سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ بعض غیر قانونی دماغوں کو شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بناء اس پر ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے تو پھر اس ملک میں فریب چوری ڈاکہ وغیرہ جو خرابیاں ہیں ان کے ناجائز ہونے کی وجہ کیا ہے ان ذرائع سے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا۔ حالانکہ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے وہیں دوسرا فقرہ من غیر غدر (یعنی خلاف معاہدہ) لین دین نہ ہو کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے اس کے قانون میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعے لین دین کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے اور اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آباد ہیں کہ حکومت وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے اب اگر چوری ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندے کا روپیہ کوئی لے گا تو غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا وہ مرتکب ہے۔ بخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ پس یہ حکومت وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہیں ہے اور نیز کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضے میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو تھا

ہندوستان میں مسئلہ ربوا (سود) کا حکم

[1] جن میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزی میں فتویٰ ایک سے زیادہ مقامات میں موجود ہے یہاں بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتویٰ اس وقت صادر کئے تھے جب لال قلعہ میں تیموری سلاطین نام نہاد شاہ ہند کے نام سے موجود تھے۔ لیکن چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لئے شاہ صاحب نے فقہ حنفی کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند میں کر دیا تھا ۱۲

قبضے کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نقطۂ نظر ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ! اور یہی اس معاشی مسئلہ کی بنیاد ہے۔ افسوس کہ علمائے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ورنہ ادھر سو ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہوگئے خاص صورت حال یہ ہوئی کہ ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ صرف لیتا رہا اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ زیادہ تر علماء پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت حال کا علاج موجود تھا۔ لیکن افسوس کہ ایک جز پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔ اور اب تو شاید مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔

اس مسئلہ کا ذکر چاہئے تو تھا کہ میں سود کے باب میں کرتا جیسا کہ عموماً فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہی بات سمجھو کہ اس کا تعلق ربوا کے باب سے نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی معاشی تعلقات کا یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے اسی لئے یہ بحث یہاں آ گئی ہے بخلاف اس باب کے جہاں خود مسلمانوں کے باہمی مالی و معاشی معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ غیر ضروری مقام پر درج ہونے کی وجہ سے امام صاحب[1] کا یہ فقہی نظریہ لوگوں کے سامنے نہیں آتا۔ بہرکیف مذکورۂ بالا چند استثنائی صورتوں کے سوا باہمی لین دین کو قرآن نے

عن تراض منکم   باہمی رضامندی سے لین دین ہو

سے مقید کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی مرضی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہائے اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں باہمی رضامندی کی قید تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین میں مسلم ہے چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکہ، غصب وغیرہ کو جرم اسی بناء پر قرار دیا گیا ہے کہ ان تمام شکلوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے لیکن اسلام نے اس عام قانون کے سوا ان معاملات اور مال کے لین دین کے متعلق چند امور کا اضافہ بھی کیا ہے جن میں پہلی اصل تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن میں

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔   باطل طریقے سے باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو۔

کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور دوسری اصل قرآن ہی میں

[1] اسی لئے بہت لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع، قیاس ان الفاظ میں کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کریں تو ہم تو مشکور ہوں ۱۲

کسبًا و یتعاد السوال فھو اثم لہ	وہ بھیک کا اپنا پیشہ بنالے گا تو وہ
(المسوی المصفیٰ ۲۹۱)	بھی گنہگار ہوگا۔

قمار اور اس کی مختلف صورتوں کی حرمت

اکل مال باطل ہی کی ایک شکل وہ ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ میری مراد قمار اور اس کی مختلف شکلوں سے ہے جس کا رواج اس وقت تک دنیا کے ان علاقوں میں بھی موجود ہے جو کسی معاشی قوت کو بیکار چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ آخر جوئے میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے معاوضہ میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے صرف یہی نہیں کہ یہ اکل مال بالباطل ہے بلکہ گو بظاہر ہارنے والا اپنی مانی ہوئی شرط کی بنا پر ہارتا ہے اور اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ رضامندی سے اس نے اپنا مال جیتنے والوں کو دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ اتنا غیظ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر بھی ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جوا (قمار) کے متعلق جو یہ ارقام فرمایا ہے۔

لانہ اختطاف لاموال الناس	کیونکہ جوئے میں لوگوں کے اموال کو
ضمنہم معتمد علی اتباع جہل	اس طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت
وحرص و منیۃ باطلۃ ورکوب	حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے اتباع
غرر بعثہ علی ھذا الشرط	آدمی گرفتار ہوتا ہے۔ اور دھوکے پر
ولیس لہ دخل فی التمدن	سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے
والتعاون فان سکت المغبون	اور حرص غلط آرزو وغیرہ اس کو ان
سکت علی غیظ وخیبۃ وان	شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہے
خاصم خاصم فیما التزمہ	جن کو شہری زندگی کی تعمیر اور باہمی
بنفسہ واقتحم بقصدہ والغابن	امداد میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر
یستلذہ ویدعوہ قلیلہ الی	ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو
کثیرہ ولا یدعہ حرصہ ان	اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی
یقلع عنہ وعما قلیل یکون	و نامرادی کی چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن کو
المترۃ علیہ۔	وہ اپنے قصد و ارادہ سے گھسیٹ لایا ہے

جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کاروبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کی دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص باز نہیں رہتی کہ اس فعل سے رک جائے آخر تھوڑا ہی وقت بیت جاتا ہے کہ خود ہی یہ مصیبت زدہ ہو جاتا ہے

لہ گداگری کے مسئلہ و مسائل کی تھوڑی سی تفصیل آئندہ بھی اپنے مقام پر آنے والی ہے۔ فلینتظر ۱۲

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس بد عادت کا رواج ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ

افساد للاموال و	ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ
مناقشات طویلۃ و	پیدا ہو جاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں
اھمال الارتفاقات	کے سلسلے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ وہ حصول
المطلوبۃ واعراض	معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع
عن التعاون المبنی	ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے
علیہ التمدن۔	ہیں، لوگ اس باہمی امداد و اعانت

سے لاپروائی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

فرماتے ہیں۔

المعاشۃ یغنیک عن	دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ
الخبر مثل ما بحثت من اھل	اس باب میں تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے
القمار الا ما ذکرناہ۔	جوئے بازوں میں تم نے ان امور کے سوا
(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۲)	جن کا میں نے ذکر کیا۔ کہیں بھی کسی اور

چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا تھا ان کو ممنوع قرار دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی بعض صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہہ سکتے ہیں۔ اور متمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ (کپڑے کو پھینک دیا جاتا جس پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا) ملامسہ (جس کپڑے پر مثلاً ہاتھ پڑ گیا جبراً خریداری اس کی ضروری تھی) از ایں قبیل اور صورتیں بھی تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کر دی گئیں۔ مقصود یہی ہے کہ ہر شخص ملک اور ملک کے باشندوں کی کچھ خدمت کر کے کھائے اور کمائے تاکہ ملک کی دولت عامہ کی پیدائش میں ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو اور یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کا استعمال مختلف طبی، اخلاقی، اجتماعی اغراض سے اسلام نے اپنے ماننے والوں پر حرام کر دی ہیں ان چیزوں کی تجارت بھی اس نے ممنوع قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے۔

ان اللہ اذا حرم شیئاً	حق تعالیٰ نے جب کسی چیز کے استعمال
حرم ثمنہ۔	کو حرام قرار دیا تو اس کے دام کو بھی
	حرام قرار دیا۔

کیونکہ ایسی چیزوں کے بیچنے والے جب اس سے نفع ہی نہیں اٹھا سکتے تو ان کا جو مال ان
چیزوں کے معاوضہ میں لیا گیا وہ باطل ہی لیا گیا۔ اس ذیل میں فقہاء اسلام نے بعض چیزوں کی تجارت
ممنوع قرار دی ہے۔ تاہم انھوں نے کوشش کی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں نفع کا پہلو کسی راہ سے بھی پیدا
ہو سکتا ہے۔ ان کے استفادہ کی بھی راہ نکالی جائے مثلاً میتہ (مردار) حرام ہے لیکن باوجود اس کے مردہ
جانوروں کی کھال دباغت کے بعد بلکہ ان کی ہڈیاں، اون، کھر، سینگ، پٹھوں وغیرہ کی تجارت جائز
ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمادات و نباتات، حیوانات بلکہ ہر وہ چیز جس میں استفادہ کی کوئی صورت نکل سکتی ہو
فقہاء نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کی معاشی سہولتوں کے لئے ان کی تجارت کی اجازت دی جائے
یہی وجہ ہے کہ بجز چند چیزوں کے جن کی حرمت قطعی ہے یا جو نجس العین ہیں یا خود رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کی بیع کی ممانعت فرما دی ہے۔ عموماً عام چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے اور تقریباً
تجارت لین دین کے وہ تمام طریقے جو دنیا میں مروج ہیں اگر اکل بالباطل اور لا تظلمون ولا تظلمون
کی زد میں نہ آتے ہوں، اسلام نے ان کی اجازت دے رکھی ہے۔ مثلاً نقد دے کر ضرورت کی چیزیں
خریدنا، چیز دے کر چیز لے لینا یا دام بعد کو دینا جسے نسیہ (ادھار) کہتے ہیں۔ یا دام پہلے دینا اور
چیز بعد کو لینا جسے سلم[1] کہتے ہیں (بعض خاص شروط جن کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی نہ کسی پر ظلم ہو جاتا
تھا) سلم کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ فقہاء اسلام نے اسلامی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہر شکل کے
احکام اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔ پھر اس لئے تاکہ خرید و فروخت کرنے والوں کو سوچنے، خود
کہنے کا، دیکھنے بھالنے کا موقع ملے یا عیب و نقص کی وجہ سے واپسی کا امکان پیدا ہو تجارت میں
خیار[2] کا قانون بھی رکھا گیا ہے۔ الغرض ممکن سے ممکن آسانیاں جو ہو سکتی ہیں سب فراہم کر دی
گئی ہیں اور قرآن میں،

احل اللہ البیع۔ — تجارت کو اللہ نے حلال فرمایا ہے۔

کے ذریعے گویا مذکورہ بالا صورتوں کی حلت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر دنیا میں لین دین کی ایک خاص
شکل جس کا نام ربوا یا سود ہے، اور آج تک دنیا کے بڑے بڑے معاشی اس کے متعلق حیران ہیں۔ اس کے
جواز و عدم جواز کی بحث تقریباً تاریخ کے نامعلوم زمانے سے چھڑی ہوئی ہے۔ اسلام نے فیصلہ کر دیا
کہ اس کو قطعی طور پر حرام کر دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے معاشی پہلو کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے اس کا
اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسلام میں یوں تو اخلاقی، اجتماعی یا ملی یا کسی اور نقطۂ نظر سے جرائم کی ایک

---

[1] البتہ اس کی چوتھی شق یعنی دام بھی ادھار دیئے جائیں اور چیز بھی ادھار دی جائے دونوں کی ادائیگی کا وعدہ ہو تو اسے بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں جس پر یہ نکالی کی ناجائز صحت ہے کہ دونوں کے معلوم و مجہول ہونے سے ادائیگی کے وقت بے شمار جھگڑوں کا دروازہ کھل سکتا ہے کہ حدیثوں میں اس بیع کو ناجائز قرار دیا گیا ہے ۱۲

[2] خیار اس شرط کو کہتے ہیں کہ خریدار کو یا بیچنے والوں کو بھی چند دنوں تک اس کا اختیار رہے کہ معاملہ کریں یا نہ کریں ۱۲

تفصیلی فہرست پائی جاتی ہے۔ لیکن زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ صرف ایک اسی معاشی
جرم پر قرآن نے بجائے کسی ایک سزا کے چار چار سزاؤں کی دھمکیاں دی ہیں۔ یعنی سود خوار آسیب زدہ
مخبوط کی شکل میں کھڑا ہوگا۔ اس کی دولت کا وہ حصہ جو سود کے ذریعہ سے حاصل ہوگا محق اور برباد
کر دیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور سب سے آخر میں یہ کہ سود خوار کو حکم دیا گیا کہ یا وہ اس معاشی جرم
سے باز آئے ورنہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلان جنگ دے دے۔ یہ بات کہ اسلام نے تجارت کے
اس طریقہ کو کیوں جرم قرار دیا ہے اس کی توجیہ آسان نہیں ہے بلکہ سچی بات یہی ہے کہ اگر سود کی
خرابیاں اتنی واضح اور کھلی ہوتیں تو قرآن میں غالباً اس کا ذکر بھی ہوتا یا ہوتا تو جیسے اور جرائم مثلاً
چوری، ڈاکہ، فریب، جھوٹ وغیرہ کا ذکر ہے اس کا بھی اسی نوعیت سے تذکرہ کیا جاتا۔ لیکن اتنی اہمیت
جو اس کو دی گئی ہے اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام کیا بلکہ انسانوں کے خاص حلقوں کی بھی
رسائی اس کے دور رس نازک خطرناک نتائج تک نہیں ہو سکتی۔ ہزار ہا ہزار سال سے عقلی معاشیات والے سود
کے افادہ و اضرار پر بحث کر رہے ہیں لیکن آج تک کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ
اس مسئلہ میں انسان کو عقل سے بھی کسی بالاتر ذریعہ سے اس کے متعلق آخری فیصلہ واضح لفظوں میں
سنا دیا جاتا اور یہی قرآن نے کیا۔

حرمت سود کی وجہ — تاہم اگر اکل بالباطل اور لا تظلمون ولا تظلمون قرآن کے ان دونوں
معاشی بنیادوں کو ہم سامنے رکھ لیں تو شاید کچھ اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں تک ایک حد تک پہنچ سکتے ہیں
مثال سے اس کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے سارے کاروبار لین دین میں معاملہ کے فریقین میں
ہر ایک دوسرے کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کرتا ہے مثلاً تاجر کپڑے دیتا ہے۔ خریدار روپیہ ادا کرتا ہے کرایہ کی
شکلوں میں مثلاً موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو جس وقت تک کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال
کرتا رہتا ہے۔ موٹر کے تمام کل پرزے اپنے صفات کارکردگی کو بتدریج کھوتے رہتے ہیں یا سال بھر
کے بعد مکان کو جب کرایہ دار واپس کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ مکان اور اس کے تمام عناصر و اجزاء اپنی اس
حیثیت پر باقی نہیں رہتے جو کرایہ دینے کے وقت ان کی تھی۔ الغرض کرایہ کی شکلوں میں بھی اگرچہ اصل چیز
یعنی موٹر، مکان وغیرہ مالک کو واپس ہو جاتی ہے۔ لیکن صفات کی قربانی[3] ان میں بھی ضرور ہو جاتی ہے

---

[3] زراعت کا معاملہ جنھوں نے سائنس اور کیمیائی معلومات کی روشنی میں نہیں کیا ہے۔ ان کو زمین کے متعلق بظاہر
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر کوئی کھیتی کرنے کے لئے کرایہ پر کسی کی زمین لے اور چند سال اس میں کاشت کرنے
کے بعد اسے واپس کر دے تو جس حال میں اس نے زمین لی تھی اسی حال میں واپس کر رہا ہے، حالانکہ یہ واقعات
سے جہل کا نتیجہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ بھی جس زمین سے پیداوار حاصل کی جاتی ہے تو اس کے
بہت سے کیمیائی مفید اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کسانوں کو کاشت کاری میں ہر سال کھاد وغیرہ کا دینا
ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جاہل کسان اس راز سے ناواقف ہونے کی وجہ سے (بقیہ برصفحہ آئندہ)

اس کے مقابلہ میں جس نے بجائے موٹر کے آپ سے دو ہزار روپے قرض لئے اور دس سال بعد واپس کئے لینے کے وقت آپ اپنے روپوں کو اسی طرح ٹھوک بجا کر لیں گے جس طرح آج سے دس سال پہلے دیئے گئے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں روپے کے صفات پر کہنگی اور فرسودگی طاری ہوگئی اور اس کی وجہ نقدیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ایک دوسرے روپیہ کی کامل طور سے قائم مقامی کرتا ہے جس کے معنی یہی ہوئے کہ قرض دینے والے کی طرف سے نہ اصل مال کی قربانی ہوتی ہے اور نہ مال کے صفات کی اب اگر دس سال تک جو روپیہ آپ کا مقروض کے پاس رہا اس کے معاوضہ میں آپ ہر مہینے اس کا کرایہ اگر وصول کرتے گئے تو سوال یہی ہے کہ آپ کی طرف سے کیا قربانی ہوئی، نہ روپیہ کے ذات کی نہ صفات کی، ظاہر ہے کہ قرض دینے والے کا یہ پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ بخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سود دیا کرے یہ اس طور پر دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کچھ آمدنی نہیں پیدا کی۔ اور اگر تجارت وغیرہ کے لئے لیا تو تجارت کی نفع کا یہاں ہر حال میں ضروری نہیں۔ لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بھی اپنی ذات و صفات کے ساتھ محفوظ اور اس کی دہری دوہری آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے تمام دروازے بند ہیں اور صرف نفع اور کیا نفع؟ اضعافاً مضاعفۃ (دوگنے چوگنے) کے حساب سے منافع کے دروازے جس پر کھلے ہوئے ہیں، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار ہوتا ہے۔ پس چند دنوں میں تو شاید نہیں لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ گردش دولت کی جب کبھی ہوتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ ملک کا ایک قلیل گروہ یعنی ایسے

(بقیہ حاشیہ [illegible])

آ کا جاپان اور یورپ و امریکہ کے کسانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسٹر مسانی کی کتاب "ہمارا ہندوستان" ایک بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ اردو میں بھی حصہ اشرف بیگ صاحب نے اس کو منتقل کر دیا ہے۔ اسی کتاب میں "زمین کے کھاد" کے عنوان سے جو باب لکھا گیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ کھاد جو ہماری زمین میں پائے جاتے ہیں جب زمین کے کسی خاص حصہ میں یہ خاص کھاد (نائٹروجن، پوٹاشیم، فاسفورس، ہوائی) کافی مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہیں، وہاں پیداوار خوب تیزی سے ہوتی اور وہ زمین "زرخیز" کہلاتی ہے۔ مگر جہاں ان میں سے کچھ یا سب کے تمام کھاد غائب ہوں تو ایسی زمین کو بنجر کہتے ہیں۔ آگے اسی میں ہے کہ دوسری تمام اچھی چیزوں کی طرح زمین میں بھی قدرتی کھاد کا ذخیرہ کم و بیش محدود ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ کھاد کافی مقدار میں ہوتے ہیں اور گو ان کی کمی قدرتی طور پر تھوڑی بہت پوری ہوتی رہتی ہے لیکن جب کاشت ہونے لگے تو وہ بہت کم ہوتے جاتے ہیں" چنانچہ ایک ایکڑ زمین میں معمولی فصل پر تقریباً بیس پونڈ نائٹروجن سال بھر میں خرچ ہوتی ہے۔" اور یہ ایک "کھاد" "نائٹروجن" کا حساب ایک ایکڑ کے لحاظ سے ہے، اسی پر اب دوسرے کھادوں کو قیاس کر لیجئے! اسی کتاب میں ہے جتنی زیادہ مقدار میں یہ کھاد پودوں اور اناج کا جز بن کر نکلتا رہتا ہے اتنی ہی مقدار میں زمین کے اندر اس کی کمی ہوتی جاتی ہے (ہمارا ہندوستان)

لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ رہی ہو اور ان کے پاس قدر حاجت سے کچھ پس انداز بھی ہو گیا ہو جو عموماً ہر ملک و قوم میں تھوڑے ہوتے ہیں، جب یہ اپنے روپیہ کو سود کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو ان کے یہی روپے ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتے ہیں اور صدی ڈیڑھ صدی کے بعد یہ تماشا نظر آتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہیں اور معدودے چند گھرانوں یا شخصوں کے پاس دولت کا ورم پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بات اسی حد پر آکر رک نہیں جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے تنگ آکر ان سود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا وحشیانہ حملہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں، امن و امان غارت ہو جاتا ہے۔ غربا بھوکے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولتمندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان تاریخ کو آج یورپ میں دہرا رہی ہے یا دہرانے والی ہے۔ اور یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے یہی کہ معاشی کاروبار میں اکل بالباطل (یعنی بغیر کچھ دیئے ہوئے دوسرے کے مال سے استفادہ) اور لا تظلمون ولا تظلمون کے قانون کی پابندی سے بے اعتنائی برتی گئی۔ حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں،

فیربو المال علی المحتاج	محتاج (مقروض) پر مال بار بار دی کے
من غیر نفع یحصل له	ساتھ بڑھتا ہے اور اس طور پر بڑھتا
ویزید من غیر نفع	ہے کہ خود اس مال کا نفع اسے نہیں ملتا
یحصل منه لاخیه فیاکل	اور قرض دینے والے (سود خوار) کے
مال اخیه بالباطل۔	مال میں اضافہ اس طور پر ہوتا ہے کہ
(ص ۲۰۰)	اس سے اس کے بھائی (مقروض) کو

کچھ نفع نہیں پہنچتا یہی وجہ ہے کہ سود میں آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر کسی وجہ کے باطل طور پر کھاتا ہے۔

آخر سود خوار کو جب اس کا روپیہ اپنے تمام ذاتی و صفاتی کمالات کے ساتھ بجنسہ واپس ہو جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے وہ غریب قرضخواہوں سے سود کا روپیہ کس بنیاد پر لے رہا ہے۔ "تمہارے ڈنے کیا نتیجے دیتے ہیں" ارسطو کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے، جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب کبھی قانونی اجازت دی جائے گی اور اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہوگی تو آمدنی کے پس انداز کرنے والوں کا قلیل گروہ اگرچہ اپنے آپ کو یا اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتا ہے لیکن یہی ملک کے اکثر افراد کو شدید معاشی ضرر پہنچا رہا ہے۔ اس قسم کے کاروبار ان ہی ممالک میں فروغ پا سکتے ہیں جن کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لئے یا اپنے خاندان ہی کے لئے سمجھتے ہوں اور اپنے ملک یا شہر یا گاؤں کے دوسرے افراد سے انہیں کچھ بحث نہ ہو، آخر یہ سارا روپیہ جو ان کی پس انداز

انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کو ایک توضیحی بیان قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو بھی اموال ربویہ بیان ہوا ہے انھیں میں شریک کر دیا جن میں ان کی نگاہ میں وہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ امام شافعی اور قریب قریب امام مالک نے سونا اور چاندی کو دیکھ کر خیال کیا کہ مراد اس سے ہر وہ چیز ہے جو زر کی طرح میں قیمت کا کام دیتی ہے۔ اب خواہ وہ سونا چاندی ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز ہو۔ اسی طرح گیہوں، اور جو، نمک، کھجور کو دیکھ کر ان بزرگوں نے خیال فرمایا کہ مراد ہر وہ چیز ہے جو کھانے پینے میں کام آتی ہو یا جن سے خورد و نوش کی چیزوں کی اصلاح کی جاتی ہو جیسے نمک۔ لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے اور ان کی یہی خصوصیت ان نتائج کی ذمہ دار ہے جو سودی کاروبار میں پیش آتے ہیں۔ اس نکتہ تک صرف امام ابو حنیفہؒ کی پہنچ ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ خصوصیت کن کن چیزوں میں پائی جا سکتی ہے۔ ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھی اس لئے امامؒ نے بجائے ان خاص چیزوں کے ہر اس چیز کو جو کیل (پیمانہ) یا وزن (تول) کے ذریعہ سے بکتی ہو، اموال ربوی قرار دیا اور ان کے باہمی تبادلہ میں ربوا (زیادتی) کو انھوں نے ناجائز ٹھیرایا۔ ان اجتہادی دقیقہ سنجیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی ربوا جو اب تک دنیا میں صرف روپے کے قرض کے کاروبار کی ایک شکل تھی اب ہزاروں چیزوں تک پھیل گیا۔ خصوصاً حنفی مذہب جو اسلام کے تشریعی مکاتب خیال میں سب سے زیادہ محتاط اسکول ہے اس میں تو سود کی اتنی گوناگوں شکلیں پیدا ہو گئیں کہ اب ان کا سمیٹنا دشوار ہو گیا ہے۔ فقہاء نے تفصیلات میں دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں لیکن اصل بحث کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے جو عرض کیا گیا۔ عموماً فقہ کی کتابوں میں سود کے مباحث کو دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ عوام جسے سود کہتے ہیں اس کا تو اس میں گویا ذکر ہی نہیں ہے حتی کہ اسی بنا پر عوام ہی کو نہیں بلکہ بعض اچھے اچھے پڑھے لکھوں تک کو پچھلے دنوں یہ مغالطہ ہو گیا کہ اسلام نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ قرض کا موجودہ سود نہیں ہے بلکہ بیع اور خرید و فروخت کی چند نادر شکلیں تھیں جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں اور ان ہی کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسلام نے اس سود کو منع نہیں کیا تو پھر اس نے منع کس چیز کو کیا۔ قطع نظر اس سے کہ یہودیت، عیسائیت حتیٰ کہ ہندو مت تک میں جس سود کو حرام یا گناہ کمانے کے برابر قرار دیا گیا ہے یا ارسطو نے جس سود کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ "روپے بچے نہیں دیتے" یہ قرض والا سود نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس معاشی مسئلہ کی تنقیح ارسطو تک کی عقل نے کر لی تھی اسی کے متعلق کہا جائے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس زہریلے گھاؤ پر نہیں پڑی اور پڑی بھی تو کسی ایسی چیز پر جس کا اب دنیا میں رواج ہے اور نہ کسی کو ان کا تجربہ ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی بھلا ایسے لوگوں سے کون بحث کر سکتا ہے جو قرآن کے خمر کو عرب کا کوئی جوہا اور قرآن کے خمر کو عرب کے کسی درخت کا خاص رس قرار دے کر وسکی جو خمر در خمر ہے اس کی حلت کا فتویٰ دیدیں۔

بہر حال فقہائے اسلام کی ان احتیاطی موشگافیوں کی وجہ سے ایک دقت اور یہ پیدا ہوئی کہ ربوا کے بعض مسائل جن کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں کرتے ہیں، بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں مثلاً اس مسئلہ کی بنا پر کہ سونے کا سونے سے چاندی کا چاندی سے تبادلہ کسی شکل میں ہو خواہ خام یا ردی، زیور کی شکل میں ہو یا سکہ کی، بہر حال جب ان کا تبادلہ کیا جائے تو دونوں کو وزن میں برابر ہونا چاہیے۔ سوال ہوتا ہے کہ چاندی کے کسی زیور یا برتن کو کوئی ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کیوں دے دے گا، یا زرگر کی کاریگری اور برتن بنانے کی محنت کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں اسی طرح سوال ہوتا ہے کہ سونے چاندی کے تبادلہ میں یہ قید لگا دی گئی ہے کہ لینے اور دینے والے کے ہاتھ میں دونوں بیک وقت آئیں ورنہ خالی ہاتھ والے کے مقابلہ میں بھرے ہاتھ والا گویا ایک قسم کی زیادتی یا ربوا کا مستحق ہو رہا ہے۔ خواہ یہ زیادتی غیر محسوس اور غیر مادی ہی کیوں نہ ہو اس قسم کی بعض اور حیرت انگیز صورتیں بھی فقہ میں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلے مسئلہ کے متعلق تو حنفی فقہاء بیچارے یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ واقعہ تو یہی ہے کہ ایک تولہ چاندی کا زیور ایک ہی تولہ چاندی کے معاوضہ میں کوئی نہ دے گا۔ لیکن ہم کیا کریں مذہب کا حکم یہی ہے۔ بس حکم کی تعمیل کرنے والے کو چاہئے کہ ایسی صورتوں میں چاندی کے زیور کو سونے کے سکوں سے اور سونے کے زیورات کو چاندی کے سکوں سے خریدے۔ لیکن حنبلی فقہاء نے ایک صورت یہ نکالی کہ زیور بیچنے والے سے خریدار یوں کہے کہ تمہارے زیور کی چاندی جو ایک تولہ ہے اس کے معاوضہ میں تو میں یہ ایک تولہ کا سکہ دیتا ہوں باقی زیور کی گھڑائی کی اجرت مثلاً ایک روپیہ یہ الگ دیتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملہ یوں کیا جائے تو درست ہو جائے گا۔

مقدسی لکھتے ہیں۔

ان قال الصائغ صغ لی خاتما وزنہ درہم واعطیک مثل وزنہ و اجرتک درہما فلیس ہذا بیع درہم بدرہمین قال اصحابنا للصائغ اخذ الدرہمین احدہما فی مقابلۃ الخاتم والثانی اجرۃ لہ

(۱۳۰، المغنی ج ۴)

اگر سنار سے زیور کا خریدار یوں کہے کہ میرے لئے ایک انگوٹھی بنا دو جس کا وزن ایک درہم کے مساوی ہو، اور میں تمہیں اس چاندی کے معاوضہ میں اس قدر چاندی دیتا ہوں (یعنی ایک درہم دیتا ہوں) اور تمہاری مزدوری ایک درہم الگ دیتا ہوں تو ایک درہم کو دو درہم سے بیچنا قرار پائے گا ہمارے بزرگوں (حنبلی فقہاء) نے کہا ہے کہ سنار کے لئے دو درہموں کا لینا جائز ہوگا۔ جن میں ایک درہم تو انگوٹھی کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم سنار کی مزدوری ہوگی۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ربوا کے باب میں اس قسم کے بعض مسائل کا جو ذکر کر دیا جاتا ہے جن میں بظاہر کچھ دشواریاں نظر آتی ہیں ان کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اسلام چونکہ قطعی طور پر ربوا کی بنیاد انسانی معاشیات سے اکھاڑ کر نکال دینا چاہتا ہے اس لئے جہاں کہیں اس کی باریک رگ اور ریشے نظر آتے ہیں انھیں بھی فوراً نوچ کر پھینک دیتا ہے اور ایک ایسے خطرناک مہلک معاشی جرثومہ کے نکالنے کے لئے مسلمانوں کو اگر کچھ عملی دشواریاں پیش آجاتی ہیں تو چاہیئے کہ اپنے نقطۂ نظر کے استحکام کے لئے اسے بخوشی برداشت کر لیا جائے۔ کچھ مذہب ہی کے راہ میں نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنے آئیڈیل کی حفاظت کے لئے لوگ اس سے بھی زیادہ دشواریاں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

ماسوا اس کے ایک قصہ اور بھی ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق اگر ایک طرف ربوا سے ہے تو اسی کے ساتھ اسلام کے بعض دوسرے اصول بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں، چونکہ ان مسائل کا عموماً ذکر ربوا ہی کے باب میں کیا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ صرف اسی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھتے ہیں لیکن اگر ان کے سامنے ان مؤثرات کو بھی واضح کر دیا جائے تو شاید دشواری جتنی محسوس کی جاتی ہے وہ باقی نہ رہے۔

مثلاً یہی سونے چاندی کے ظروف اور زیورات وغیرہ کے خرید و فروخت کا مسئلہ ہے جس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات اور تقابض (یعنی دست بدست) لینے کی دونوں قیدوں نے ان کی خرید و فروخت میں ضرور دشواری پیدا کر دی ہے۔ لیکن یہ دشواری اس میں کیوں پیدا کی گئی کیا صرف ربوا سے بچنے کیلئے؟ بظاہر یہی خیال کیا جاتا ہے لیکن کاش اسی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کے اس نقطۂ نظر کا بھی علم ہوتا جو سونے چاندی کے ظروف اور زیورات کے متعلق وہ رکھتا ہے دنیا نے پہلے سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن اب تو یہ مسئلہ تقریباً بداہت کے درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ سونا اور چاندی جو بنی آدم کا ایک بیش بہا قیمتی سرمایہ ہے ان کو مالی معاملات کا واسطہ بنانے کی جگہ مقصود بالذات بنا کر زیوروں اور برتنوں کی شکل میں مقید کر دینا ملک کی معاشی ارتقاء میں بدترین سنگ راہ کو حائل کرتا ہے۔ ایک ہندوستانی معاشی اپنے مفلس ملک کا نوحہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "ہندوستان کی قدامت پسندی اور جہالت بھی اس ملک کی غربت کی بہت کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ہندوستان میں جس قدر بھی دولت موجود ہے اس ملک کے باشندے اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے ان کی دولت یا تو زیورات کی شکل میں ان کی عورتوں کے گلے کا ہار بن گئی ہے یا دفینوں کی صورت میں زمین کے نیچے پڑی ہوئی ہے۔"

پھر اس غریب ملک میں "زیور" اور "ظروف" نے معاشی آب حیات کے اس بحر رواں کو جس مقدار میں منجمد کر کے بیکار کر دیا ہے اس کی رپورٹ دیتے ہیں۔

> "اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۰۰ روپے فی کس اس وقت ہندوستان میں بالکل بیکار موجود ہیں۔"

جس ملک میں فی کس تین پیسے بھی آمدنی کا اوسط مشکل سے ہے، اس ملک پر اس معاشی فاقہ کا کیسا سخت اور شدید ترین حملہ ہے کہ فی کس ۲۰۰ روپے زیوروں اور برتنوں یا دفینوں کی شکل میں اس طرح قید ہوا کہ

ایں طرفہ تماشا ہیں لب تشنہ و آب اندر

کا تماشا پیش کر رہے ہیں وہی بیچارا معاشی لکھتا ہے۔

> "ہمارے ملک والوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ دولت کا صحیح مصرف اسے کاروبار میں لگانا ہے۔ انھیں خبر ہی نہیں کہ دوسرے ملک ہم سے کس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کیونکہ وہ ایک پیسہ تک بیکار رکھنا گناہ سمجھتے ہیں، ان کے پاس جو رقم بھی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچتی ہے اسے سرمایہ کی صورت میں اپنے کاروبار میں لگا دیتے ہیں اس کے برعکس ہمارے بھائیوں کے پاس جب کبھی ایک آدھ پیسہ بچ جاتا ہے تو اس کا زیور بنوا کر اپنی عورتوں اور بچوں کو اس میں جکڑ دیتے ہیں۔"

گویا سونے چاندی کو زیورات یا برتنوں وغیرہ کی شکل میں مقید کرنا ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور معاشی مذہب میں ایک پیسہ تک کو بیکار رکھنا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ سونے چاندی کی ایک رتی کا بھی زیور یا ظروف وغیرہ کی شکل میں رکھنا معاشی نقطۂ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ لیکن دنیا کے معاشیوں کو تو شاید اس کا علم اب ہوا ہے۔ مگر دینی معاشیات کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ صدی پہلے یہ اعلان فرما چکے تھے۔

لا تشربوا في آنية الذهب والفضة ولا تاكلوا في صحافها (صحاح ستہ)	سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پانی پیا کرو اور نہ ان کے پیالوں میں کھانا کھایا کرو۔

صرف ممانعت ہی پر کفایت نہیں فرمائی گئی بلکہ ملک کے اس معاشی مجرم کے متعلق یہاں تک ارشاد ہوا

الذي يأكل ويشرب في آنية الفضة انما يجرجر في بطنه نار جهنم۔ (بخاری)	چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے جہنم کی آگ ہی اس کے پیٹ میں وہ گھونٹے گا۔

اور اس لئے بالاتفاق تمام فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے مردوں کی حد تک قریب قریب یہی حکم زیورات کا بھی ہے یعنی بجز خاتم (انگوٹھی) کے کہ اس کے متعلق فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ہر قسم کے زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے مردوں پر حرام ہیں اور گو عورتوں کے خاص جذبات کے

لحاظ سے ان کو ایک گونہ اجازت دی گئی ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس باب میں جو ارشادات ہیں اور مختلف اوقات میں آپ نے عورتوں کے زیور کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس سے منشاء مبارک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو اپنے گلے کا طوق یا ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر تھا۔

یالیت امتی لم تحل الذھب — کاش! میری امت ہی (مرد ہو یا عورت) سونے کا زیور نہ پہنتی۔
(مسند احمد)

یہ آپ کی مشہور حدیث ہے جس میں مردوں ہی کے متعلق نہیں بلکہ امتی جس میں عورتیں بھی داخل ہیں، تمنا کی گئی ہے کہ سونے کا زیور استعمال نہ کریں تو اچھا ہے۔ قطع نظر اس روایت کے جس میں ایک صحابیہ ام عطیہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے لئے سونے کے زیور کی اجازت چاہی گئی تو

فابی علینا۔ — حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے انکار کیا

ایک اور عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے مختلف زیوروں کا نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ کیا اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟ لیکن ہر ایک کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (آگ کا زیور) ہے فرماتے رہے، عورت پھر بھی عورت تھی فطری جذبہ پر اتنی سخت چوٹ برداشت نہ کر سکی اور بولیں،

ان المرأۃ اذا لم تقرین لزوجھا صلفت عندہ۔ — عورت جب اپنے شوہر کے لئے سنگھار نہیں کرتی تو اس کی نگاہوں سے اتر جاتی ہے۔

لیکن اس پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بیوی صاحبہ کو جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا۔

ما یمنع احدٰکن ان تصنع قرطین من فضۃ ثم تصفرہ بزعفران او بعبیر۔ — تم عورتوں کو کس چیز نے اس سے روکا ہے کہ چاندی کی دو بالیاں اپنے کانوں میں ڈالیں اور ان کو زعفران یا عبیر سے رنگ دیں (تاکہ سونے کی زردی کی جھلک پیدا ہو جائے۔

اور یہ حال تو سونے کے زیورات کا ہے چاندی کے زیوروں پر اگرچہ عام عورتوں کے متعلق زیادہ سختی نہیں فرمائی گئی۔ لیکن آپ کے منشاء مبارک کا اظہار اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا جیسی چہیتی بیٹی کے گھر میں بھی آپ نے چاندی کے زیوروں کا دیکھنا بھی پسند نہ فرمایا اور حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ

یا ثوبان اشتر لھا قلادۃ من عصب وسوارین من عاج — ثوبان! فاطمہ کے لئے تم پٹھوں کا ایک ہار اور فیل دنداں کے دو کنگن خرید لاؤ۔

بہرحال اگرچہ فقہاء اسلام نے قانونی طور پر طلائی و نقروی زیورات کی حرمت کو صرف مردوں تک محدود رکھا ہے۔ لیکن بجائے قانون کے اگر مسلمان اپنے پیغمبر کے منشاء اور آرزو کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو عورتوں سے بھی زیور کا قصہ تمام ہو جاتا مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ تاہم اسلام نے صراحۃً عورتوں کے لئے اگر سونے چاندی کے زیور کو ممنوع نہیں کیا ہے۔ لیکن سونے چاندی سے سکہ کے سوا جو چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں خواہ وہ زیور ہوں یا برتن ہوں یا کچھ اور ہوں ان کے خرید و فروخت کی شکلوں میں ایسی دشواریاں پیدا کر دی ہیں کہ اسلامی نظام معیشت رکھنے والی قوم میں آسانی کے ساتھ ان کا چلن نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا چند فقہی صورتیں جن میں قیمتی سے قیمتی زیور کی نازک ترین محسن کاریاں بالکل بے قیمت ہو جاتی ہیں جس کا حاصل بالآخر یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا پہننا ہی ترک ہو جائے گا اور یہی اسلام کا منشا ہے۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ دشواریاں جو بظاہر صرف (یعنی سونے چاندی کے تبادل) میں نظر آتی ہیں وہ پیدا ہوئی نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں قصداً پیدا کی گئی ہیں۔ جس کی بنا ربوا سے زیادہ معاشی رگوں کے اس خونی جہات کے انجماد پر ہے اور گو فی الظاہر ان میں دشواریاں ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو ان ہی دشواریوں میں دراصل عظیم الشان معاشی آسانیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح ربوا کی بعض دوسری شکلوں میں بھی جو کچھ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے اس کا تعلق بھی ربوا سے زیادہ اسلامی تعلقات کے دوسرے ابواب سے ہے اگر ان مسائل پر غور کرتے ہوئے ان ابواب کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو پھر کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باریک چاول ایک من ہیں، وہ موٹے چاولوں کے دو من سے اسے بدلنا چاہتا ہے لیکن وہی برابر ہونا چاہیے کہ حکم کے تحت وہ مجبور ہے کہ ایک من باریک چاول کے عوض میں ایک ہی من موٹے چاول لے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کون شخص ہو گا جو اپنا ایک من باریک چاول دے کر خواہ مخواہ کسی سے موٹے چاول ایک من لے گا۔ اسی قسم کی ایک صورت کھجور کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب پیش آئی تو آپ نے حکم دیا کہ بجائے بدلنے کے یہ کرنا چاہیے کہ ادنیٰ قسم کے کھجور بیچ دیئے جائیں اور پھر اس کے پیسے سے عمدہ کھجور خرید لیا جائے۔ بظاہر اس میں بھی ایک طول عمل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ایک ہی جنس کی دو درجہ کی چیزوں کا باہمی تبادلہ بزیادتی کی اجازت دے دی جاتی تو پھر دو چاندیوں تک میں آدمی فرق با آسانی نکال سکتا ہے کہ میری چاندی چونکہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے ایک تولہ سے دو تولہ لینے میں کیا حرج ہے بلکہ شاید دو روپیوں میں بھی حیلہ جو چاہیں گے تو اسی قسم کی تمیز نوازی کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ایک جنس کی دو چیزوں میں تمیز کے فرق کو سود کے معاملہ میں ناقابل لحاظ قرار دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ

جیدھا وردیھا سواء — ان کی عمدہ اور ردی قسمیں دونوں برابر ہیں۔
(بخاری)

جس سے یہ غرض نہیں ہے کہ واقع میں ان چیزوں کے اقسام میں مبیوں کا تفاوت نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر اس فرق کی بنا پر زیادتی کی اجازت دیدی جائے گی تو لوگوں کے لئے سود خواری کی راہ کھل جائے گی اور اسلام اس کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو سخت ترین ڈاٹوں سے بند کرنا چاہتا ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشورہ

بع التمر بیعاً اخر ثم	کھجور اچھی قسم کو پہلے بیچ دو پھر
اشتریہ۔	اس کی قیمت سے اچھے کھجور خریدو۔

اس میں اگرچہ بظاہر ایک گونہ دخواری ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اس میں فن معاشیات کے ایک خاص پہلو کی طرف بھی لوگوں کی توجہ دلائی جا رہی تھی یعنی مطلب یہ ہے کہ عموماً ایسے ممالک جن کا تمدن وحضارت سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا ان میں چیزوں کی بجائے سکوں سے خریدنے کے چیزوں سے چیز کے لین دین کا دستور عموماً جاری رہتا ہے۔ ابن قیم کا بیان ہے۔

لاسیما اھل العمود والبوادی	خصوصاً خیمہ میں رہنے والے اور
فانما یتناقلون الطعام بالطعام	صحرا کے باشندے وہ لوگ غلہ کو
(اعلام صفحہ ۴۰ جلد ۱)	عموماً غلوں سے بدلتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں میں بھی عام طور پر چیزوں سے چیز خریدنے یعنی بہ طریقہ BARTER یا فنی اصطلاح میں "مقائضہ" کا دستور تھا اسلام ان ذرائع سے بتدریج اس رواج کو بھی گھٹانا چاہتا تھا۔ علمائے معاشیات جانتے ہیں کہ معاشی ارتقاء میں تبادل EXCHANGE کے اس طریقہ کے بدل دینے میں کتنا دخل ہے۔ چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور سونے کا مبادلہ سونے سے برابر برابر ہو۔ اس معاشی نظریہ کا جہاں انسداد ربوا اور دولت کے انجماد سے تعلق ہے میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے ایک اور بات بھی مقصود تھی جس کی طرف افسوس ہے کہ دنیا نے اب تک توجہ نہیں کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ حکومتوں کے مختلف سکوں میں عدم مساوات کی وجہ سے بٹاون کا جو دستور پایا جاتا ہے، مثلاً حکومت آصفیہ کے سکہ سے اگر کوئی انگریزی سکہ کو خریدنا چاہے تو سو روپے انگریزی کے معاوضہ میں سولہ روپے مزید علاوہ سو روپے کے دینے پڑتے ہیں، اور بٹاون کا یہ بھاؤ ایک حال پر بھی باقی نہیں رہتا، کبھی کبھی بجائے سولہ روپے کے سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ روپے تک زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ کبھی گھٹ کر بٹاون کا یہ قصہ پندرہ اور چودہ روپے تک اتر آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بٹاون کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف اس چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں ہے جو دو مختلف حکومتوں کے دو مختلف سکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے دو حکومتوں کے ایسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے، مختلف اسباب کے زیر اثر ان میں بھی ایکسچینج (تبادل) کے وقت بسا اوقات بٹاون ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کے قلمرو سے دوسری حکومت کے قلمرو میں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی اور تجارتی کاروبار کرنے والوں کو بھی بٹاون

ان جھگڑوں کی وجہ سے خود نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں بلکہ یک ہی حکومت کے ایسے دو علاقے جہاں دو مختلف قسم کے سکے مروج ہیں وہاں بھی بٹاون اور ایکسچینج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ مدت ہوئی یعنی ۱۹۲۵ء میں مصر کے مشہور علمی مجلہ الہلال (عربی) نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع کیا تھا مضمون نگار نے جینوا کی مرحوم لیگ آف نیشن (انجمن اقوام) کے مکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ

یمکن ایجاد اتفاق لتوحید	یعنی (انجمن اقوام) کی وجہ سے اس کا امکان
النقد الاساسی عند	پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور
الامم۔	بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا

کی قوموں کا اتفاق ہو جائے علاوہ سارے جہان کے باشندے اسی پر متحد ہو جائیں۔

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو اساسی سکہ مان لیا جائے اسی نے لکھا تھا کہ

لکی یمنع التلاعب من حیث	سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ
القیاس یجیب ان یسک الدولار	سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اس کے
سکۃ واحدۃ فی مصنع	انسداد کی یہی شکل ہے کہ ڈالر کو ایک ہی
واحد حتی یبقی عیاسہ	سکہ جو ایک ہی ٹکسال میں ڈھالا جائے
واحد اعند الامم۔	بنا دیا جائے تاکہ دنیا کی ساری قوموں

میں ایک ہی معیار کے سکہ کا چلن ہو جائے۔

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے کہ

لا یدری ما یاتی الغد	قطعاً نہیں بتایا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا،

یعنی بازار میں کس ملک کے سکہ کا بھاؤ کل کیا باقی رہے گا اس کا جاننا بہت دشوار ہے۔

مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ

فمن یشتری الیوم احد السلع	یعنی ایک شخص کوئی مال فرانس میں لے
فرنسا و یحسب حالی الفرنک	لیتا ہے اور فرانک (سکہ فرانس) وڈالر
والدولار فیجد انہ قد ربح	(سکہ امریکہ) دونوں کا حساب کر کے
لانہ لم یشترھا من	خیال کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہے گا
امریکا مثلا ولکنا دیمضی	کیونکہ مال اس نے امریکہ میں نہیں خریدا
علی تاریخ شرائہ اسبوع حتی	ہے لیکن ایک ہفتہ بھی اس مال کی
یحسب حسابہ ثانیاً و یجد انہ	خریداری پر گذرنے نہیں پاتا کہ وہ
مخطاء کل الخطاء لاعتادہ۔	دوسری دفعہ حساب کرتا ہے تو پاتا ہے کہ

على السوق الفرنسيه بدلاً من الامريكيه۔	اس نے سخت خلل کی کرسی ہے بجائے امریکی بازار کے فرانسیسی بازار پر اس نے اعتماد کیا۔

بہر حال سکوں کے اس اختلاف کی وجہ سے دنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا علاج جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن و معیار سب ایک کر دیا جائے اپنی اس تجویز کا نام اس نے "نظریۂ توحید نقد اساسی" رکھا ہے، آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "نقد اساسی کی توحید" کے نظریہ پر اگر اقوام عالم کا اتفاق ہو جائے تو

وحدت في العالم طريقة	دنیا میں لین دین اور کاروبار کا طریقہ
التعامل وتسهلت بذلك	عالم میں ایک ہو جائے گا اور اس کی وجہ
التجارة وزال كثير	سے تجارت میں بڑی آسانیاں پیدا
من المتاعب التي يتحملها	ہو جائیں گی اور بہت سے مصائب سے نجات
التجار وسائر الناس في	جو بیچارے تاجروں کو صرافہ کے دلالوں
غش السماسرة في تحويل	کی وجہ سے برداشت کرنے پڑتے ہیں
النقود وشرائها وبيعها۔	یعنی سکوں کے ادل بدل اور خرید و فروخت

میں جو حق فریب چال اور دھوکہ دیتے ہیں اس سے دنیا محفوظ ہو جائے گی۔

کیا یہ سارا مشورہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک الذهب بالذهب والفضة بالفضة سواء بسواء مثلاً بمثل کا ترجمہ نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے الہلال مصر ماہ فروری ۱۹۲۵ء۔

اس کے سوا بھی سکوں کے اسکیم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانے میں حاکم اقوام نے محکوم قوموں کے ساتھ جو مظالم جنگ عظیم کے بعد تلافی مافات کے لئے توڑے تھے ہندوستانی کے بیوپاریوں اور ساہوکاروں سے درد کے اس افسانہ کی داستان سننی چاہیے لاکھ دو لاکھ نہیں صرف اسکیم کے مغالطے سے کروڑوں بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اربوں کا وارا نیارا کیا ہے، جن کی تفصیلات شاید علماء معاشیات بتا سکتے ہیں۔

حالانکہ بنی آدم کے تمام افراد ایک ہی آفتاب، ایک ہی ہوا، ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے نفع اٹھانے میں مشترک ہیں اسی طرح چاندی سونے سے استفادہ کے حق کو بھی اگر عالمگیر کر دیا جائے تو اس میں دنیا کا کیا بگڑتا ہے۔ حکومتوں کا اپنے اپنے سکوں پر مخصوص علامات کی نمائش کے جذبہ کی اگر تسکین بھی مقصود ہو حالانکہ بجز ایک وہمی ہوسناکی کے شاید چنداں مادی نفع اس کا کیا ہے لیکن یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہر حکومت اپنے امتیازی نشان کو سکوں میں قائم رکھتے ہوئے ان کے اوزان اور جو کھوٹ ملایا جاتا ہے اس کو مساوی کر دے کسی زمانے میں یہ تجویز اگر کچھ ناقابل عمل نظر آتی ہو تو شاید اس کے کچھ اسباب بھی تھے لیکن اب جبکہ زمین کی طنابوں کو قدرتی قوانین کے چند نئے انکشافات نے کھینچ کھینچ کر اس طرح ملا دیا ہے کہ اب ایک ملک ہی نہیں بلکہ کرۂ زمین کے تمام ممالک تقریباً ایک بستی یا زیادہ سے زیادہ

ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ رات کو جو واقعہ واشنگٹن میں پیش آتا ہے صبح ہوتے ہوتے حیدرآباد میں اس کی خبر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ اور اب تو بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے جو چھ مہینے میں جو راستہ آج سے سو سال پہلے طے ہوتا تھا کل چند گھنٹوں کا فاصلہ بن کر رہ گیا ہے گویا ایسی صورت میں سکوں کے ہم وزن ہونے پر اگر حکومتیں بین الاقوامی معاہدہ کے طور پر اتفاق کریں تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی شہر کے چند محلوں یا شہر کے محلے کے چند امیروں نے کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے۔ مواصلات کے موجودہ ذرائع سے جب دنیا محروم تھی پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ نے جب اس وقت یہ تجویز دنیا میں پیش فرمائی تو اس وقت تو اس تجویز کو عملی لباس پہنانا پہلے کی نسبت سے آسان بلکہ آسان تر ہو چکا ہے۔ لیکن پیغمبر ختمی (امام انسانیت) کی خدمت کا سب سے بڑا فریضہ یہ تھا اسی قسم کے بلند بانگ دعووں کے بلند کرنے والوں کی زبانوں پر جو کچھ ہے کاش وہ دلوں میں بھی ہوتا جو اپنے کو سب کے لئے کہتے ہیں، لیکن سب کو جو اپنے لئے سمجھتے ہیں ان کے فاسد اغراض کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔ جب اسکیم کے مغالطہ دینے کی یہ چال ان کے ہاتھ سے چھن جائے گی۔ ان کا فائدہ تو اسی میں ہے، اسی راہ سے تو ان بڑی مچھلیوں کو چھوٹی مچھلیوں کے نگلنے کا موقع مل رہا ہے، اور ان بڑے درختوں کو چھوٹے پودوں کے چبانے کی آسانیاں فراہم ہو رہی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دوسروں کے بھی اسی طرح پیغمبر ہیں جیسے ہمارے لئے ہیں، انھوں نے انسانیت کی عام فلاح و بہبود کی ایک تجویز پیش کر دی ہے، آدم کے بچوں میں ہمت ہو تو وہ اس تجویز کو مان کر اسکیم کے گرداب سے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ ساری نسل انسانی کو نجات دلا سکتے ہیں، وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔

شغل اصل

اب اس سلسلہ میں ایک آخری بات یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام نے سودی کاروبار کو جب اپنے معاشیاتی نظام سے قطعاً خارج کر دیا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ ملک کے جن افراد کے مصارف سے آمدنی کی جو رقم بس انداز ہو جاتی ہے، آخر وہ اس کا صحیح استعمال کیا پیدا کریں، ماسوا اس کے یہ بھی مسلم ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ کی فاروقی مصارف والی لڑائیاں اور سائنسی جنگوں کی ذمہ داری اگر ان سہولتوں پر عائد ہوتی ہے جو سود کی وجہ سے فراہمی سرمایہ میں پیدا ہو گئی ہیں تو اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج دنیا کی ساری صنعتی ترقیاں جو کیمیاوی پیمانے کی پیداواروں پر مبنی ہیں، بہت کچھ ان ہی آمدنیوں کی رہین منت ہیں جو سود کی بدولت آج دنیا کو حاصل ہیں۔ سودی کاروبار کو یک قلم بند کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ساری میکانیکی اور صنعتی چہل پہل کا بازار یکایک سرد پڑ جائے اور دنیا پھر اس عہد تاریک کی طرف واپس ہو جائے جس میں بجائے بجلی کے قمقموں کے مٹی کا دیا اور بجائے ٹیلیفون اور ریلوں کے بیل کی گاڑیوں پر آدمی راستہ طے کرتا تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں سوالات قابل غور ہیں، اگر اسلام کا معاشی نظام راہبانہ نظام ہوتا تو

بآسانی کہہ دیا جا سکتا ہے کہ اسی بچانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کتوں کے کھانے کی فکر کرتا پھرے۔ جیسی مصارف کے پس انداز کرنے کا اصول ہی غلط ہے۔ یا دنیا کو ریل و موٹر، برق و گیس ہی کی کیا حاجت اور بعض ہو گیا: فطرتوں کو یہ کہتے ہوئے پایا بھی گیا ہے۔

گو جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آئندہ دخل کے صرف یا خرچ کا باب جب آئے گا اس میں بھی بتایا جائے گا کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف ہوگا۔ حقوق و مطالبات کے ادا کرنے کے بعد اسلام مال کے جمع کرنے یا رقم کے پس انداز کرنے کا مخالف نہیں ہے۔ بلکہ آئندہ معلوم ہوگا کہ وہ ایک حد تک اس کا ایک معاشی مشیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی غلط ترجمانی ہوگی۔ اگر کائناتی اختیار اور قدرت کے تحت نئے نئے قوانین سے استفادہ کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام اس کی ہمت افزائی نہیں کرتا جس دین کے پیغمبر نے غیر قوموں کی ایک سائنس کو یعنی جنگی ضرورت کے لئے خندق کھودنے کی اپنی اور اپنے اصحاب کی سنت قرار دی ہے، جس نے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کو عرب میں رائج کیا ہو، بجائے بے سلی لنگی (ازار) کے ایران کے سراویل (پاجامہ) کو پسند کیا ہو اور جس نے کفن اور فرہنگ میں مخصوص کاری کی تعلیم دی ہو، اس کو جدید صنعتی ترقیوں کا مخالف آخر کس بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ ربا کے حرام کرنے والے اسلام کے پیش نظر یہ دونوں سوالات تھے اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ان دونوں کا جواب اسلامی معاشیات میں موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مصارف سے بچے ہوئے یا بچائے ہوئے سرمایہ کو جو لوگ سود پر چلاتے ہیں عموماً وہ یہی کرتے ہیں کہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتے ہیں اور ان کا طور پر حوالہ کرتے ہیں کہ اس سرمایہ کے منافع میں تو وہ اپنے کو شریک رکھتے ہیں، لیکن نقصان کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں بلکہ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کہ ان کا سرمایہ بھی جوں کا توں اپنی تمام ذاتی و صفاتی خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہتا ہے اور جنہیں یہ سرمایہ حوالہ کیا جاتا ہے ان کو نفع ہو یا نقصان اس سے بالکل بے تعلق ہو کر اپنے مشروط منافع کو بھی قانون کے زور سے اتنے استوار اور مضبوط طریقے سے اس طرح پر جکڑے رہتے ہیں کہ ان کے نفع کا ایک پیسہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا بلکہ سود در سود کی شکلوں میں تو صرف اصل سرمایہ کے منافع ہی نہیں بلکہ اس کے نفع کا بھی پورا پیسہ پیسہ اور پیسہ پیسہ روپیہ روپیہ آخر فیال مسلسل بغیر کسی انقطاع کے بنتا چلا جاتا ہے، جس کے حیرت انگیز ریاضیاتی نتائج پر دنیا نے اکثر سر دھنا ہے۔ سو سو روپے کے معاوضہ میں بذریعۂ سود در سود بعض اوقات لاکھ لاکھ روپے تک لوگوں نے وصول کئے ہیں۔ حاجتی ربوٰ و قرضوں میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ہی ملک ایک ہی قوم بلکہ ایک ہی شہر میں بلکہ بسا اوقات ایک ہی محلہ اور ایک ہی گھرانے کے چند افراد کے مصارف سے بچی ہوئی رقم کی حفاظت کا تو قانون اتنا زبردست انتظام کرتا ہے کہ صرف اصل رقم ہی نہیں بلکہ اس رقم کے منافع اور منافع کے منافع تک کو

قریب و تنگ کے جو دوسرے پائی کوڑی کی نگرانی رکھی جائے، لیکن اسی ملک اسی قوم اسی شہر اسی محلہ میں اسی گھرانے کے جس آدمی نے اس رقم کو ضرورت میں لگایا شب و روز کی مسلسل محنتوں سے اس کے ذریعہ سے کچھ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اس غریب کو یہی قانون اتنا لاوارث اور بے کسی کے عالم میں چھوڑ دیتا ہے کہ خواہ اس پر آسمان ٹوٹے، پہاڑ گرے، کچھ بھی گزر جائے، لیکن اصل رقم کے ایک ایک پیسہ اور اس کے منافع در منافع کے ایک ایک چدام کا اسے ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے کہ جان سے ہو جس طرح سے ہو اپنے مصارف سے جن لوگوں نے یہ زائد رقم پس انداز کی تھی ان تک دام دام پہنچاتا چلا جائے۔

دنیا کے قانون نے اگر اس ظالمانہ بے جا طرفداری کو جائز رکھا ہو تو ظالم کو اس دنیا میں ہر ظلم کے اختیار کرنے کا اقتدار حاصل ہے، لیکن اسلام سے اس یک طرفہ ایک چشمی جنبہ داری کی توقع فضول ہے۔ اس لئے اس نے اس راہ کو تو مسدود کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ اپنے مصارف سے ملک کے جو باشندے کچھ سرمایہ پس انداز کر سکتے ہیں، ان کے لئے اگر محض اس راہ سے اپنے سرمایہ سے استفادہ کے طریقہ کو اس نے قانوناً جرم اور ظلم قرار دیا ہے تو کون کہتا ہے کہ پھر اس سرمایہ کے استعمال اور اس استعمال سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت بھی باقی نہیں رہی۔ اسلامی معاشیات کے تمام نامہ کو پڑھئے اور دیکھئے، اس نے ایک نہیں بلکہ بیسوں راہیں اور کھول دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس پس انداز سرمایہ کو آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ شرکت ہی کے ایک باب کو فقہ میں اٹھا کر دیکھئے تو ایک نہیں، متعدد شکلیں مختلف حالات کے لحاظ سے فقہاء نے بتائی ہیں کہ ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کے ساتھ شریک ہو کر اپنے سرمایہ کو مختلف کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے۔ شرکتِ عنان، شرکتِ مفاوضہ، شرکتِ وجوہ، شرکتِ تقبل، ان کے سوا بھی اور شکلیں ہیں جن میں اپنی اپنی سہولتوں کا اندازہ کر کے آدمی اس پس انداز سرمایہ کو لگا سکتا ہے۔ شرکت ہی کی ایک شکل مضاربت یا قراض ہے، یعنی ملک کے بے سرمایہ افراد کو سرمایہ دار لوگ سرمایہ دے کر کاروبار کرائیں اور باہم منافع کو تقسیم کر لیا کریں، سرمایہ دار کو سرمایہ کا، اور بے سرمایہ والے شریک کو محنت کا نفع ملے گا، چونکہ فقہ کے مطول ابواب ہیں، اس لئے تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن قدر مشترک ان تمام معاملات میں وہی بات ہے کہ جب سرمایہ لگانے والے منافع میں شریک ہیں تو نقصان میں بھی ان کو شریک رہنا پڑے گا، اور چونکہ شرکت کا معاملہ بیک وقت ایک سے زیادہ آدمی کر سکتے ہیں اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی بے سرمایہ آدمی ایک سے زائد سرمایہ داروں سے سرمایہ لے کر کاروبار کر سکتا ہے، جس کے قیود و شروط فقہ کی کتابوں میں تفصیلاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیمانۂ کبیر کی پیداواروں کی بھی کافی گنجائش نکل آتی ہے، اس ذریعہ سے بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا جا سکتا ہے اور بڑے سے بڑے کاروبار کا امکان ہے اور مسلمانوں میں ہمیشہ سے بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں میں یہ معاملات کروڑہا کروڑ روپے کے سرمایہ سے جاری تھے جن کے متعلق

تاریخ سے بڑا امداد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ سود کے روک دینے سے ملک کے پس انداز سرمایہ سے استفادہ کی کوئی دوسری صورت باقی نہیں رہتی یا پیدائش پیمانہ بڑے پیمانے کے امکانات کا دروازہ مسدود ہو جاتا ہے، قطعاً غلط ہے۔

ماسوا اس کے ملک کی ایسی ضرورتیں جن کی تکمیل "پیدائش بڑے پیمانہ" ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، اس کے متعلق اسلام نے خود حکومت کو بھی متوجہ کیا ہے کہ رعایا کی سہولت کے لئے اس قسم کے کاموں کو خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور بیت المال کی مد خراج و عشر وغیرہ سے ان کی پابجائی کی جائے، مثلاً دریاؤں سے نہروں کا نکالنا، سڑکوں کا بنانا، پل باندھنا وغیرہ جس کا ذکر حکومت کی آمدنی کے سلسلے میں آئے گا۔

بہرحال پس انداز سرمایہ سے جو مادی نفع اٹھانا پڑتا ہے اس کے لئے تو اسلام میں یہ بالا صورتیں رکھی گئی ہیں، لیکن ایسے لوگ جن کے نزدیک نفع صرف وہی نہیں ہے جو مادی شکل میں اسی زندگی میں آدمی کو مل جائے، بلکہ ان کی نگاہیں بلند ہیں اور اس زندگی کے سوا زندگی کے دوسرے اطوار و ادوار میں جو نفع آدمی کو پہنچ سکتا ہے، اسے بھی وہ نفع ہی سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی دوسری رعایا سے نہیں تو مسلمانوں کے ہر فرد سے تو یقیناً اسی کی توقع کرنی چاہئے ایسے لوگوں کے لئے پس انداز سرمایہ کے استعمال کی اسلام نے ایک اور صورت بھی نکالی ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے اس سرمایہ کو خیرات کر دیں اور لوگوں میں اس پس انداز سرمایہ کو بانٹ دیں، یہ تو خیر ایک عام شکل ہے اور اس کے لئے کسی خاص مشورے کی کیا حاجت بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال جو کبھی کبھی آپ نے ارشاد فرمائے ہیں کہ

یاتی احدکم بجمیع ما یملک	تم میں کا ایک آدمی وہ سب کچھ جو کہ
فیقول ھذہ صدقۃ ثم	وہ مالک ہے لے کر آتا ہے اور کہتا ہے
یقعد یستکف الناس۔	کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے
(ابوداؤد)	اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

اس میں تو مصارف سے بچے ہوئے کل سرمایہ کے خیرات کر دینے کی مخالفت فرمائی گئی ہے، اس بنا پر اسلام نے خیرات کرنے کے سوا ایک اور صورت ایسی نکالی ہے کہ مصارف سے بچا ہوا سرمایہ لوگوں کا محفوظ بھی رہ جائے اور جا ہیں تو باوجود اس کے اس سے زندگی کے دوسرے مقامات و حالات میں نفع بھی اٹھا سکتے ہیں، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ جس طرح خرید و فروخت کرایہ، اجارہ وغیرہ یہ سارے کاروبار دنیاوی معاملات ہیں اور ان کا شمار خیرات و صدقات کے ذیل میں نہیں کیا جاتا، اسی طرح سمجھا جاتا ہے کہ قرض کا لین دین بھی ایک خالص دنیاوی کاروبار ہے اسی لئے قرض دینے والے کو جب کہا جاتا ہے کہ تم اس پر سود نہ لو تو وہ پوچھتا ہے کہ آخر اس روپے پر مجھے نفع کیا ملا جس کو میں نے فقط قرض کر دیا ہوں کہ قرض کے کاروبار میں

دینے والے کی طرف سے کسی قسم کی کوئی قربانی نہیں ہوتی، اتنی ہی نہیں جو ایک جھکڑ (اگر) ہانکنے والے کی طرف سے کرایہ پر چڑھنے والوں کی راہ میں ہوتی ہے کہ جتنی دیر بھی اس کا اگر چلتا ہے اس عرصہ میں اس کے پہیے نیز تمام پرزوں کے صفات کی وہ حالت قطعاً باقی نہیں رہتی جو چلنے سے پیشتر تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کبھی کوئی اکہ نہ پرانا ہوتا اور نہ خراب ہوتا، یقیناً مسلسل ان ہی مخفی فرسودگیوں کا چند سال کے بعد آخر میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اکے کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

مگر قرض کا روپیہ اگر دس سال بعد بھی واپس ہو تو اسی حال میں واپس ہوتا ہے جس حال میں دیا گیا تھا اور روپیہ کی اس خصوصیت کو وہ لوگ بھی سمجھتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح جواز سود کے لئے اور اس کو ظلم کے دائرہ سے نکالنے کے لئے کوشاں ہیں۔ واقعوں پر بہت زیادہ زور دینے کے بعد ان لوگوں نے ایک مفہوم پیدا کیا ہے جس کی تعبیر "استکار کشی" کے لفظ سے کرتے ہیں، یعنی بجز موجودہ خواہشوں کے ملتوی کئے، زمانہ آئندہ کے لئے کوئی اپنی آمدنی سے پس انداز نہیں کر سکتا ہے۔ اب اگر آئندہ زمانے میں بھی اس غریب کو کچھ نفع اصل پس اندازوالی رقم سے نہ ملا تو اتنے دن تک جو اپنی خواہش کے سینے پر اس نے پتھر رکھا اور استکار کرتا رہا اس کا صلہ اس کو کیا ملا گویا التوائے خواہش اور آئندہ کے توقعات کے استکار کی جو زحمت اس کو ہوئی یہی سود کی قیمت ہے۔ مادی منافع کی (وہ بھی عمر بسر کرنے والوں کی طرف سے سود کی یہ سراسر خیالی اور جذباتی مبہم مجہول قیمت پیش کرنی خود ان کے دعویٰ کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے لیکن اگر واقعی استکار کشی کوئی چیز ہے اور اسی کی قیمت قرض دینے والا سود کی شکل میں چاہتا ہے تو اسلام نے اس قیمت کی پابجائی کا نظم کیا ہے کہ قرض جو اب تک ایک خالص دنیوی اور مادی کاروبار سمجھا جاتا تھا، دنیوی معاملات سے اس کو نکال کر قرآن نے نیکی اور بجز تیکا خیر و خیرات کی طویل فہرست کی کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ اہم ترین جزو کی حیثیت سے شریک کر دیا۔ شاید آسمانی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی دینی کتاب ہے جو

من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا	وہ کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دیتا ہے

کی آواز سے گونج رہی ہے، مصارف سے رقم بچانے والوں کے سامنے قرض خواہوں کو ہٹا کر خود حق تعالیٰ جل مجدہٗ نے اپنے کو لا کر کھڑا کر دیا اور اعلان عام کر دیا گیا کہ استکار کشی کی اجرت طلب کرنے والوں کو اجرت دینے کے لئے خود ان کا مالک

فیضاعفہ لہ اضعافا کثیرا	اللہ تعالیٰ (اس استکار کشی کے عوض میں)
	دو تا دوں منافع اسے عطا فرمائے گا۔

کے وعدے کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن نے خیرات کی یہ ایک نئی قسم نکالی کہ خیرات میں دی جانے والی رقم بالکلیہ محفوظ بچی ہوئے بھی اس پر خیرات کے منافع کی توقع کی جا سکتی ہے اور توقع کیا جب قرضداروں کی طرف سے "دو تا دوں منافع" کا اعلان خود خدا کر رہا ہے تو اب اس سے زیادہ یقینی

منافع اور نفع کی ضمانت اور کیا دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی یہ ایک عجیب معاشی دقیقہ سنجی ہے کہ قرض کو اس نے صرف خیرات اور نیکی کی مد ہی میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت جس کا ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہ میں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا حدیثوں میں اس کی تصریح بھی آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

رأیت لیلة اسری بی علی باب الجنة مکتوبا الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانیة عشر۔ (ابن ماجہ)	جس رات میں مجھے معراج ہوئی میں نے جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا بدلہ دس گنا اور قرض کا اٹھارہ گنا ملے گا۔

اسی بنا پر بعض صحابہؓ فرمایا کرتے

لان اقرض دینارین ثم یردان ثم اقرضهما احب الی من ان اتصدق بهما (مغنی)	میں دو دینار قرض میں دوں پھر مجھے واپس مل جائیں اور میں اسے پھر قرض میں دوں یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان دونوں کو خیرات کر دوں۔

صرف یہی نہیں کہ صدقہ کو قرضہ سے افضل قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ خیرات میں جو ایک پہلو اس کا تھا جس کا سوال کی بحث میں ذکر گزر چکا ہے یعنی خیرات لینے اور بھیک پر زندگی گزارنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ لیکن قرض کو باوجود خیرات کی مد میں شمار کرنے کے خیرات کے اس مکروہ پہلو سے اس کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس طور پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ صرف زبان سے نہیں بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے خود اپنے لئے اور قیامت تک آنے والی اپنی نسل کے لئے صدقہ کو حرام فرما دیا ہے، اسی ذات مبارک نے خود عمل کر کے اس میں بے عزتی یا کراہت کا جو شائبہ تھا اس کو مٹا دیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

لیس القرض بمسئلة وذلک لان النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یستقرض ولو کان مکروها کان ابعد الناس منه۔ (مغنی صفحہ ۳۵۳)	قرض لینا یہ بھیک مانگنا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود قرض لیا کرتے تھے۔ اگر قرض لینا مکروہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب سے زیادہ اس سے دور رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مصارف سے بچا کر ملک میں جن لوگوں کے پاس پس انداز سرمایہ ہے۔ اگر وہ اس سے مادی نفع اٹھانا چاہتے ہیں تو نفع کے ساتھ نقصان میں بھی اپنے کو شریک کر کے وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اسلام میں اس کی متعدد راہیں کھلی ہوئی ہیں اور اگر نقصان میں شریک ہونے سے ڈرتے ہیں تو ان کے سرمائے کو محفوظ کر کے استقراض کشی کے صلہ میں اسلام نے بجائے مادی نفع کے خیراتی منافع کے

کمانے کا وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔ قومیت اور وطنیت کے نشہ میں سرشاری کا دعا رکھتے ہوئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی استقراض کشی کا صلہ غیر مادی منافع کی صورت میں لینے پر کتنے آدمی تیار ہو سکتے ہیں بالکل عجیب ہے۔ آخر جو رقم ضروریات سے بچ گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خود دلیل ہے کہ تجارتی ضرورت سے زیادہ سمجھ کر وہ بچی ہے۔ اپنی خواہشوں کو ملتوی کر کے پس انداز کرنا اولاً یہ ہمیشہ ضروری نہیں۔ دنیا میں ایسے دولتمندوں کی کمی نہیں ہے جن کے پاس ہر قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی لاکھوں اور کروڑوں کی رقم آمدنی سے پس انداز ہو جاتی ہے۔ علاوہ اس کے اگر خواہشوں کو ملتوی کر کے جو پس انداز کرتے ہیں تو عموماً یہ (necessaries) ضروری خواہش قطعاً نہیں ہوتیں۔ بلکہ (تعیشات) کی خواہشوں تک یہ التوا محدود ہو سکتا ہے اور یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ بہر حال کسی وجہ سے بھی ہو، اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رقم بچ گئی ہو تو اس میں اس کا کیا بگڑتا ہے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے ضرورت مندوں کو دیکر یا ان کے کاروبار میں لگا کر اپنی رقم جوں کی توں واپس بھی لے لے اور اس حسن سلوک کا خدا کے یہاں سے صلہ کی امید اس دنیا میں یا آئندہ زندگی میں کرے۔ آخر سوال ہوتا ہے کہ قرض نہیں بلکہ مطلق خیرات اور چیریٹی میں جو لوگ آج بھی اور ہر زمانہ، ہر ملک میں لاکھوں کروڑوں کی رقم دے ڈالتے ہیں وہاں ان کا تو سرمایہ اور سرمایہ کے منافع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں، آخر وہ کس بات کی توقع پر ایسا کرتے ہیں، لیکن جب ان ہی لوگوں کو بجائے خیرات کے سود و سود سے بچا کر غیر سودی قرض دینے کے لئے کہا جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ میرا کیا نفع ہوگا۔ خیرات میں نفع تو کیا ہی نہیں اصل سرمایہ بھی چلا گیا۔ اس میں تو سوال نفع کا نہیں پیدا ہوتا لیکن غیر سودی قرض میں اس سوال کو اٹھانا اس متناقض ذہنیت کا آخر کیا جواب ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ محض ایک رواجی بات ہے۔ خیرات میں روپے کے پھینک دینے کا چونکہ رواج ہے اس لئے لاکھوں اور کروڑوں کے دینے سے بھی لوگ دریغ نہیں کرتے۔ لیکن غیر سودی قرض کے لین دین کا خیرات سمجھ کر چونکہ عام طور سے رواج نہیں ہے، اس لئے اس میں پر بھی لوگ مادی نفع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً جن ممالک میں (نیشنلزم) اور قومیت و وطنیت کا صور پھونکا جاتا ہے ان کے منہ پر تو یہ سوال کسی طرح نہیں پھبتا۔

الحاصل اسلامی معاشیات سے سودی کاروبار کو خارج کر دینے کے بعد ملک کے پس انداز سرمایہ کے استعمال اور دنیوی و دینی منافع کے حاصل کرنے کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں اور جس طرح لین دین کے سلسلہ سود اور سود کی مختلف چھوٹی بڑی شکلوں کو روک کر اسلام نے ملک کی اکثریت کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات عطا کی ہے۔

اسی طرح لین دین کے دوسرے ابواب میں بھی جہاں معاشی مظالم نظر آئے ان کے سدباب کی بھی اس نے کوشش کی ہے۔ ظلم و فریب، دھوکہ، جھگڑے رگڑے کا انسداد اس نے صرف کلی قوانین ہی کے ذریعہ سے نہیں کیا ہے بلکہ بعض اہم جزئی شکلوں کو بھی قانون کی

چند قسم میں اکرام کی جڑ کاٹ دی ہے۔ میرا مضمون اتنا طویل ہوتا جا رہا ہے کہ اب سب کا تفصیلی ذکر ناممکن ہے اس لئے مختصر اشارے کرتا ہوا اس مسئلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حکومت اور قیمتیں معاشیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی بنیاد طلب و رسد کی باہمی مناسبتوں پر مبنی ہے۔ طلب اور رسد میں ایک نسبت تو وہ پیدا ہوتی ہے جس میں بجائے قدرتی ذرائع کے بعض لوگوں کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، مثلاً حکومتیں درآمد اور برآمد پر ڈیوٹی لگا کر قیمت کے معیار کو گھٹاتی اور بڑھاتی رہتی ہیں، اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں قدرتی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ قیمت کے مسئلہ کو اختیاری تصرفات سے متاثر کیا جائے۔ آپ سے ایک دفعہ درخواست کی گئی کہ چیزوں کا بھاؤ حکومت کی جانب سے مقرر فرما دیا جائے۔ لیکن جواب میں ارشاد ہوا

ان اللہ ھو المسعر القابض	بھاؤ کا مقرر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے
الباسط الرزاق انی لارجو ان	وہی تنگی پیدا کرتا ہے اور وہی کشادگی بھی
القی اللہ تعالیٰ ولیس احد	روزی پہنچانے والا ہے میں امید رکھتا ہوں کہ
یطلبنی بظلمۃ فی دم ولا مال	حق تعالیٰ سے ملوں اور مجھ سے کسی کا مطالبہ
(ترمذی)	خون اور مال کے مظالم کا نہ ہو۔

جس سے معلوم ہوا کہ قیمت کے مسئلہ میں حکومت کی دراندازیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم قرار دیا۔ خواہ یہ ظلم پبلک پر ہو یا تاجروں پر، اور حکومتوں کا پنجہ تو آہنی پنجہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی زیادتیوں کے نتائج تو بہت سنگین ہوتے ہیں۔ لیکن ملک کے عام باشندوں تک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ بازار کے مسئلہ کو اور قیمت کے معیار کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ عرب میں دستور تھا کہ مال لے کر جب قافلہ اونٹوں کا کسی بیوپاری کی طرف آتا تو چند لوگ جو پہلے سے اس کی ٹوہ میں رہتے خبر پاتے ہی سود و سو پر آگے نکل کر مال پر قبضہ کر لیتے اور تاجروں سے کچھ بات طے کر لیتے یا جیسے اس زمانے میں کسی بازار کی مصنوعی کمی کوئی لے لیتا ہے یہ شکل اختیار کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ

لاتلقوا الرکبان ولا یبیع	شہر سے باہر جا کر قافلے کو آگے نکل کر
حاضر لباد	کوئی ان سے معاملہ کرے اور یہ بھی کہ

تاجر سے بازار کا کوئی آدمی بیع کا معاملہ نہ کرے

پھر اس فرمان کی غرض بھی بیان کر دی گئی،

دعوا الناس یرزق اللہ	لوگوں کو چھوڑ دو بعض کو اللہ تعالیٰ بعض کے
بعضھم ببعض۔	ذریعہ سے روزی پہنچاتا ہے۔

منشائے مبارک ان تمام ہدایتوں سے یہی تھا کہ تجارتی کاروبار میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس میں دخل اندازی کر کے خواہ مخواہ قیمتوں کے مسئلہ کو قبل از وقت ہاتھ میں نہ لیا جائے یہاں تک کہ اصرار تھا کہ جیسا کہ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

نھی ان تتلقی السلع حتی	تجارتی سامان پر آگے بڑھ کر قبضہ
یھبط بھا الاسواق۔	کرنے سے حضور نے منع فرمایا تا آنکہ

مال منڈی میں اتر جائے۔

کہاں یہ حکم کہ منڈی میں اترنے سے پہلے کوئی تجارتی مال کے متعلق کسی قسم کی کارروائی کی جائے کہ بازار میں اترنے کے بعد ہی طلب اور رسد کا قدرتی تناسب واضح ہو سکتا ہے، اور کہاں یہ حال ہے کہ موجودہ زمانے کی حکومتیں درآمد و برآمد دونوں پر من مانے طور پر جس قسم کے تصرفات چاہتی ہیں کرتی ہیں اور غریب پبلک کچھ نہیں بول سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ جو چیزیں بغیر ان قیود کے محض تجارتی اصول پر جس قیمت پر بکتیں، اس سے سو گنا قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور جبر کے غیظ و غضب کے ساتھ لوگ ادا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں "احتکار" کا مسئلہ بھی ہے یعنی غلہ وغیرہ کو اس لئے روک لینا تاکہ جب اکثر تاجروں کا مال ختم ہو جائے گا اور صرف میرے پاس یا متعدد چند آدمیوں کے پاس رہ جائے گا تو منہ مانگے داموں پر بیچیں گے۔

احتکار کے متعلق متعدد حدیثیں پائی جاتی ہیں جن میں اس کی ممانعت کی گئی ہے مثلاً

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے
وسلم ان یحتکر الطعام (صحاح)	کہ غلہ کا کوئی احتکار کرے۔

فقہائے اسلام نے عموماً اس حکم کو صرف غذائی مواد تک محدود رکھا ہے اگرچہ بعضوں نے دوسری چیزوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے نیز مختلف دوسرے قرائن اور روایات سے بہرحال اس فعل کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ فروخت شدہ کا کسی چیز پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ گاہکوں کو "مقابلہ" کی وجہ سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچے۔ اسلام اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بدنیت لوگوں کے متعلق ایسی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں کہ شاید دنیا میں بھی ان کو اس عمل کی پاداش بھگتنی پڑے گی۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو احتکار سے منع کیا لیکن وہ نہ مانا، حضرت عمرؓ نے کہہ دیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے آدمی کے متعلق جذام اور افلاس کا خطرہ ظاہر فرمایا ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس احتکار کرنے والے کو

فرایتہ مجذوما۔ (مشکوۃ)	میں نے دیکھا کہ وہ کوڑھی ہو گیا ہے۔

تجارتی مسلک ان جزئیات کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ تجارت کے متعلق اسلام کا

نقطۂ نظر معلوم ہوا اور اس کا اندازہ صرف

دعوا الناس یرزق اللہ بعضهم من بعض — لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے بعض کو روزی پہنچاتا ہے۔

سے ہو سکتا ہے کہ اسلام آزاد تجارت کا حامی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں یا ایک شہر سے دوسرے شہر میں، دیہات سے شہروں میں، شہروں سے دیہاتوں میں مال لے جایا جائے۔ نہ باشندوں کو اس میں خلل اندازی کر کے بھاؤ کے طبعی معیار کو پست و بلند کرنا چاہئے اور نہ حکومت کو اس باب میں خواہ مخواہ دخل دے کر رعایا پر زندگی تنگ کرنی چاہئے۔

باقی درآمد برآمد پر جو کروڑگیری (چنگی) لی جاتی ہے، اگرچہ اس زمانے میں اس کو ملک کے معاشی حالات کے توازن کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے اور اس ذریعہ سے قوی ممالک ضعیف ممالک پر ظلم کر رہے ہیں، اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ کروڑگیری کا محصول اموالِ تجارت میں اسلام میں بھی لیا جاتا ہے، لیکن وہ حکومت کا ایک ٹیکس ہے۔ یعنی مسلمانوں سے تو زکوٰۃ لی جاتی ہے اور اسی مصرف میں صرف ہوتی ہے جس مصرف کے لئے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یوں ہی اسلامی حکومت کی دوسری رعایا بھی اس کو بطور محصول ہی ادا کرتی ہے اور اس لئے ادا کرتی ہے کہ جان و مال کی حفاظت کے مصارف کی پابجائی ہو۔ ان تمام مسائل کی تفصیل حکومت کی آمدنی کے باب میں آئے گی۔ البتہ غیر ممالک کے تاجروں سے جو کروڑگیری لی جاتی ہے اس کی بنیاد دوسری ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ جس ملک کے لوگ اسلامی حکومت کی رعایا کے اموالِ تجارت پر کوئی محصول نہ لیں گے ان سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لے گی۔ ہدایہ میں ہے

ان کانوا لا یاخذون منا اصلا لا ناخذ۔ — اگر غیر اسلامی حکومتیں ہماری حکومت کے باشندوں سے بالکل نہ لیں گے تو ہم بھی ان سے کچھ نہ لیں گے۔

لیکن اگر وہ ہمارے یہاں کے لوگوں کے مال پر محصول لیتے ہیں تو اس وقت ہم بھی ان سے اسی قدر لیں گے جتنا ہمارے یہاں کے لوگوں سے وہ لیتے ہیں۔ پھر کوئی ظالم حکومت اگر مسلمانوں کا سب مال لے لیا کرتی ہے تو ہمیں حکم دیا گیا ہے

ان کانوا یاخذون الکل لا ناخذ الکل — اگر وہ سارا مال مسلمانوں کا لے لیتے ہوں تو ہم ان کے یہاں کے تاجروں کا سب مال نہ لیں گے۔

صاحب ہدایہ نے اس کی وجہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

نحن احق بمکارم الاخلاق — اعلیٰ اخلاقی امور کی پابندی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کروڑگیری کا تعلق اسلام میں معاشیات سے نہیں بلکہ سیاسیات سے ہے حتیٰ کہ دنیا کی حکومتیں اگر اسلامی حکومتوں کی رعایا سے کروڑگیری کے نہ لینے کا معاہدہ کر لیں تو سب سے پہلے بین الاقوامی تجارت کو آزاد قرار دینے پر جو تمنا کریں گے وہ مسلمان ہوں گے۔ ٹھیک یہی حال غلامی میں ہوا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں کو غلام بنا لیتی تھیں تو ہم بھی بنا لیتے تھے۔ پھر انہوں نے ان کو خواہش کی کہ آئندہ سے مسلمانوں کو غلام نہ بنایا جائے گا۔ خلیفۂ وقت نے شیخ الاسلام کے مشورے سے وہیں بحق مکارم الاخلاق سمجھتے ہوئے اس مقدس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور آج بھی عام تجارت کو آزاد کرانے پر اگر غیر مسلم حکومتیں رضامندی ظاہر کریں تو "ان کانوا لا یاخذون منا اصلا لا ناخذ" پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس پرانا دستور موجود ہے۔

خیر کروڑگیری کے سلسلہ میں ذکر یہاں تو ضمنی طور پر آ گیا۔ تجارتی کاروبار کے متعلق میں نے چند تفصیلی احکام کا تذکرہ اس لئے کیا تاکہ تجارت کی آزادی و عدم آزادی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سامنے آ جائے۔

اور اب اس بحث کو میں اسی پر ختم کرتا ہوں۔ یوں تجارت کے متعلق اور بھی چند قوانین ہیں جو بحث کی حاجت رکھتے تھے، لیکن بخوف طوالت ان کو ترک کرتا ہوں۔ بہرحال سب میں وہی قرآنی حکم "لا تظلمون ولا تظلمون" کی روح کارفرما ہے۔ جب کوئی تفصیلی کتاب معاشیات پر لکھی جائے گی تو اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ مصارف سے بچے ہوئے سرمایہ کے متعلق ایک پہلو کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔

سرمایہ کا استعمال و حفاظت

مقصد یہ ہے کہ اس سرمایہ سے استفادہ کی جو دو شکلیں اسلام نے بتائی ہیں، یعنی اگر اس سے کوئی شخص نفع اٹھانا چاہتا ہے تو خسارہ اور خطرے کی ذمہ داریوں کو بھی قبول کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی بہت سی صورتیں ممکن ہیں، اور اگر خطرے کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا تو شخصی نفع سے دست بردار ہو کر ملک کے ضرورت مندوں یا بے سرمایہ لوگوں کو قرض دے کر قومی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس قومی نفع کے ساتھ بالآخر اس کی زندگی یا دوسری زندگی میں شخصی منافع سے بھی وہ محروم نہ رہے گا، بلکہ خیرات و صدقات سے زیادہ قرض دینے میں شخصی نفع کی توقع کی جا سکتی ہے جس کی تفصیل گزر چکی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس قرض اور دین کی ادائیگی کی ضمانت کے لئے اسلام نے جو ممکن صورتیں اس دنیا میں ہو سکتی تھیں ان میں بھی اختیار کیا ہے۔ یعنی رہن اور رجسٹری جس کے ذریعہ سے چاہئے تو اپنے قرض کو آپ محفوظ کر سکتے ہیں۔ رہن کا ایک مستقل باب فقہ میں موجود ہے اور رجسٹری کے اصولی قوانین مع قانونِ شہادت تو خود قرآن میں موجود ہیں۔ وہی بات کہ اسلام نے زندگی کے معاشی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دستور قانونِ رجسٹری کے لئے قرآن میں ایک پوری رکوع سورۂ بقرہ کے آخر میں مختص کر دی گئی ہے تاکہ کسی کا دین ضائع ہونے کے امکان سے

محفوظ ہو جائے اور آخر میں تو

وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ۔	اپنے جی کی جو بات ظاہر کرو گے یا جسے چھپاؤ گے، اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے لے گا۔

کے ذریعہ سے اس پر بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ معاشی ذمہ داریوں کی رتی رتی کا حساب ایک دن ہو کر رہے گا، اور جس نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے وہ قطعاً ضائع نہیں ہو سکتا، بلکہ مل کر رہے گا، مگر یہ سب سامان تو پس ماندہ سرمایہ کے استعمال و حفاظت کا اس وقت تک کے لئے ہے جب تک آدمی زندہ ہے، لیکن اگر کوئی اپنے بعد بھی کچھ پس انداز چھوڑ کر مرنے والا ہے تو اس سرمایہ کے متعلق بھی تقریباً اسلام نے دو ہی صورتیں مقرر کی ہیں، یعنی اگر اپنے جانشینوں میں اس کی صلاحیت نہیں پاتا کہ وہ اس سے صحیح معنوں میں نفع نہیں اٹھا سکتے یا کم از کم اس کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو وقت "خصوصاً وقف علی الاولاد" کا عجیب و غریب قانون نافذ کر کے اسلام نے اس کی حفاظت کی ایک محکم اور استوار صورت پیدا کر دی ہے[1] گویا جیسے قرض میں اصل سرمایہ کو محفوظ کر کے دوسروں کو نفع پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہی حال وقف کے اس قانون کا ہے کہ پس ماندہ سرمایہ جوں کا توں محفوظ ہو جاتا ہے اور جن لوگوں کو واقف نفع پہنچانا چاہتا ہے ان کو نفع بھی پہنچتا رہتا ہے۔ وقف علی الاولاد کے متعلق لوگوں کو عجیب مغالطہ ہوا کہ اسے وہ خیرات کی ایک قسم قرار دے کر متحیر ہوئے اور بڑے بڑے قانونیوں نے اظہار تعجب کیا کہ اولاد پر "وقف" کے کیا معنی! قطع نظر اس کے کہ اسلام کا عام قانون صدقہ کے باب میں

وابدء بمن تعول امک واباک	جس کا بار تم پر ہو پہلے ان میں سے شروع کرو
اختک واخاک ادناک فادناک	یعنی ماں باپ کو، بہن کو بھائی کو

پھر رشتہ میں جو زیادہ قریب ہوتا جائے۔

کہا ہے، اور خود "صدقہ" کے مفہوم کو تو اس نے اتنا عام کیا ہے کہ بیوی کے ساتھ ہم بستری کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قرار دیا۔ ماسوا اس کے "وقف" میں خیرات کے مفہوم سے زیادہ پس ماندہ جائداد کی حفاظت بھی مد نظر ہے۔ ابتدائے اسلام میں عموماً صحابہؓ نے بکثرت اپنی اولاد کے نام اوقاف کئے۔ علامہ مقدسی لکھتے ہیں۔

---

[1] امام شافعیؒ نے کتاب الام میں دعویٰ کیا ہے کہ وقف کی جو شکل اسلام میں پائی جاتی ہے، اس کی نظیر اسلام سے پہلے نہیں ملتی، لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ممکن ہے کہ عرب میں رواج نہ ہو لیکن عیسائیوں میں اوقاف بکثرت تھے، ان کے گرجوں پر بڑی بڑی زمینیں وقف تھیں، لیکن میرے نزدیک امام شافعیؒ کا مطلب مطلق وقف سے نہیں ہے بلکہ وقف کے منافع کو اپنے اقربا وغیرہ کے ساتھ مختص کرنا، اسلامی وقف کی خصوصیت ہے۔

قال جابر لم یکن احد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذو مقدرۃ الا وقف۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں کوئی مقدرت والوں میں ایسا نہ تھا جس نے وقف نہ کیا ہو۔
قال الحمیدی تصدق ابوبکر بدارہ علی ولدہ وعمر بدارہ عند المروۃ علی ولدہ و عثمان[1] وتصدق علی بارضہ	حمیدی راوی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اولاد پر اپنے گھر کو وقف کیا، یوں ہی عمرؓ نے بھی مروہ کے پاس جو گھر تھا اس کو اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت عثمانؓ نے بھی

---

[1] حضرت عثمانؓ کے وقف کی قیمت کا اندازہ کتابوں میں ساٹھ ہزار درہم دیا گیا ہے یعنی دو لاکھ [illegible] جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روپیہ کے حساب سے اس کی قیمت کتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال دوسرے اوقاف کا بھی کم و بیش تھا۔

[2] اوقاف کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تاریخی چیز مسلمانوں کے یہاں جو ملتی ہے وہ مصارف اوقاف کی گوناگونی ہے۔ امیر شکیب ارسلان جو اسلامی تاریخ کے ایک مستند ادیب ہیں [illegible] مشہور امریکی مصنف [illegible] نے "حاضر العالم الاسلامی" کے نام سے کتاب لکھی ہے، اور دو عربی میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ عربی ترجمہ پر امیر کے بیش قیمت حواشی ہیں ان ہی حاشیوں میں امیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محتاجوں، بیماروں اور مسافروں کے لئے مسلمانوں نے جو اوقاف کئے ہیں وہ تو خیر عام ہیں، بیمار جانوروں کے لئے مسلمان وقف کرتے تھے۔ شام میں مرج نام کا ایک مرغزار ہے لکھا ہے کہ بوڑھے گھوڑے زخمی اور بیکار ہو جاتے تھے ان کے لئے یہ مرغزار وقف تھا کہ چھوڑ دیا جائے، گھوڑا جس طرح چاہے چرے۔ دمشق میں ایک وقف کا مصرف یہ تھا کہ جس کا برتن کسی کا غلام اگر توڑ دے تو توڑنے والے غلام کو صحیح و سالم برتن دے دیا جائے تاکہ مالک اس کو مارنے سے بچے نہیں۔ مکہ میں ایک صاحب نے صرف اس لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے کنوؤں کو صاف کیا جائے۔ مکہ میں ایک وقف تھا جس کا مصرف یہ تھا کہ تقریبات اور شادیوں میں فرش و فروش روشنی وغیرہ کا انتظام اس کی آمدنی سے کیا جائے۔ ایک وقف تونس میں اس لئے کیا گیا تھا کہ جمعرات کے دن مدارس کے طلبا کا امتحان لیا جائے اور ان کو وقف کی آمدنی سے بطور انعام تقسیم کئے جائیں۔ ایک وقف تونس ہی میں اس لئے کیا گیا تھا کہ حمام کی فیس اس شخص کے لئے ادا کی جائے جو خود حمام کی فیس ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ راہ گیروں کو ٹھنڈا پانی پلایا جائے۔ بعض اوقاف اس لئے تھے کہ غریب بچوں کی ختنہ کے مصارف اس سے ادا ہوں۔ تونس میں بھی برتن توڑنے والوں کے لئے ایک وقف تھا، بعض اوقاف اس لئے تھے کہ رمضان میں شامی روزہ داروں میں اس کی آمدنی سے تقسیم کی جائے۔ ایک دلچسپ وقف کا تونس میں پتہ چلتا ہے کہ خاص قسم کی مچھلی موسم پر وہاں کے سمندر کے ساحل پر آتی ہے غرباء کے لئے ان مچھلیوں کو خرید کر تقسیم کیا جائے۔ بعض اوقاف کا مصرف یہ تھا کہ کسی کے کپڑے پر اگر داغ دھبہ لگ جائے یا ناقابل استعمال ہو جائے تو وہ اس وقف کی آمدنی سے نیا کپڑا خرید سکتا ہے۔ بعض مکانات اس لئے تھے کہ دولتوں سے بچ کر نئے عروس کی آمدنی سے بنائے جائیں۔ الغرض دلہنوں، لنگڑوں، اندھوں، اپاہجوں، کوڑھیوں وغیرہ وغیرہ کے لئے اکثر اسلامی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بینبع وتصدق الزبیر بدارہ بمکۃ ودارہ بمصر وامواله بالمدینۃ وتصدق سعد بدارہ بالمدینۃ ودارہ بمصر علی ولدہ وعمرو بن العاص بدارہ بالوھط ودارہ بمکۃ علی ولدہ وحکیم بن حزام بدارہ بمکۃ والمدینۃ علی ولدہ فذلک کله الی الیوم (المغنی)

بھی کی، حضرت علیؓ نے اپنی اس زمین کو جو ینبع میں تھی وقف کیا، حضرت زبیرؓ نے اپنے اس گھر کو جو مکہ میں تھا اور جو گھر مصر میں تھا اور مدینہ میں ان کا جو مال (یعنی باغ و زراعت تھا) اسے اپنی اولاد پر وقف کیا، حضرت سعدؓ نے مدینہ میں ان کا جو گھر تھا اور جو مصر میں تھا اپنی اولاد پر وقف کیا۔ عمرو بن عاص نے وہط کے گھر کو اور جو مکہ میں ان کا گھر تھا اپنی اولاد پر وقف کیا، یوں ہی حکیم بن حزام نے مکہ اور مدینہ کے گھر کو اپنی اولاد پر وقف کیا اور یہ سارے اوقاف اس وقت تک موجود ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "وقف" دراصل اس زمانے میں اپنی پس ماندہ جائداد کی حفاظت کا ایک محفوظ طریقہ تھا، اور اس قانون کی اصلی روح یہی تھی، اگرچہ اس قانون میں بتدریج اور نیکی کا مفہوم بھی شریک تھا لیکن اسی معنی میں جس معنی میں خود اپنے آپ کو اپنی بیوی کو کھانا کھلانا بھی اسلام میں صدقہ ہے۔ ہر ذی مقدرت صحابی کا اس پر عمل کرنا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ پس ماندہ رہنے والی جائداد کے متعلق اسلام نے پہلے "وقف علی الاولاد" اور بعد کو وراثت کا قانون پیش کیا ہے یعنی اگر جانشینوں سے جائداد کے برباد ہونے کا خطرہ ہے تو اس کو وقف کر کے محفوظ کر دینا چاہئے اور اگر ان میں اس کی صلاحیت نظر آتی ہے کہ ان میں ہر ایک کو کچھ سرمایہ اگر دے دیا جائے گا تو اس کے الٹ پھیر اور اس کو اصل بنا کر اپنی معاشی ترقیوں میں مدد حاصل کر سکتے ہیں تو ایسی صورت میں وراثت کے قانون سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے ورثاء جو اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے موت کے انتظار میں ہوں مثلاً ماں باپ وغیرہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ممالک میں اوقاف تھے۔ مراکش کے ایک اسلامی وقف کا ذکر اس نے لکھا ہے کہ ایک فرانسیسی سیاح نے ان لنگروں میں کیا عالی شان عمارت ہے جس میں چھ ہزار اندھے ہمیشہ رہتے ہیں، ان کے کھانے پینے پہننے کا باقاعدہ نظم ہے اور تعلیم بھی ان کو دی جاتی ہے۔ ایک دلچسپ وقف یہ بھی تھا کہ جن شوہروں سے ان کی بیویاں خفا ہو جائیں تو خفگی کے دنوں میں اس وقف کی آمدنی سے استفادہ کر سکتی ہیں جب تک میاں بیوی میں صفائی نہ ہو جائے وقف کی طرف سے بیویوں کے مصارف کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ ان خاص مصارف کے علاوہ تعلیم وغیرہ کے لئے تو مسلمانوں نے ہر جگہ اوقاف کئے ہیں لیکن افسوس کہ عہد جدید حکومت ان کا انتظام نہیں کرتی۔ (دائرہ اسلامی ص ۴۲۳، ج ۱) ۱۲

ان کو تو میت کے مال سے بقدر گزر اوقات دلایا جاتا ہے لیکن جن کے سامنے زندگی کے آئندہ طویل مراحل پیش آنے والے ہیں، مثلاً اولاد، تو ان میں جس کو دوسرے سے بھی کچھ مدد مل سکتی ہے، یعنی لڑکیاں جو شوہر کی قوت بھی رکھتی ہیں، ان کو لڑکے کے حساب سے نصف دلایا جاتا ہے اور لڑکوں کو عموماً چونکہ کسی دوسرے سے امداد کی توقع نہیں ہوتی بلکہ مزید بیوی کا بار اس پر پڑتا ہے۔ اس لئے اس کو بجائے نصف کے پورا دلایا گیا اور یہ تو اس وقت ہے کہ آدمی اپنی تمام اولاد کو ایک حال میں چھوڑ کر مر رہا ہو لیکن اگر بجائے اس کے یہ دیکھتا ہو کہ اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی ایسے معذور اور بیمار یا کسی ایسی حالت میں ہیں کہ اگر ان کو صرف قانونی حصہ ملے گا تو کفایت نہ کرے گا، ایسی صورت میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ اپنی کسی خاص اولاد کو میراثی حصہ سے زیادہ اپنی زندگی میں ہبہ کر دے۔ امام احمد بن حنبل کا فتویٰ ہے کہ

لا باس اذا کان لحاجۃ واکرھه اذا کان علی سبیل الاثرۃ۔

اپنی اولاد میں کسی کو زیادہ حصہ ہبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کی ضرورت ہو مگر بغیر ضرورت یہ بات مجھے ناپسند اور میرے نزدیک مکروہ ہے، یعنی یونہی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینی چاہئے۔

مقدسی نے ان حاجات کی کچھ تفصیل بھی کی ہے:

مثل اختصاصه لحاجۃ او زمانۃ او عمی او کثرۃ عائلۃ او اشتغاله بالعلم او نحوہ من الفضائل۔

مثلاً کسی بچہ کو اس کی کسی ضرورت کی وجہ سے ترجیح دی جائے یا وہ کسی مزمن مرض میں بیمار ہو یا اندھا ہو یا اس کی اولاد زیادہ ہو یا علم کے ساتھ مشغول ہو یا اسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل کر رہا ہو۔

اور اس سے ایک عام سوال کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وقف و ہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے جب کوئی اپنی جائداد کا نظم کئے بغیر مر جاتا ہے تو اسلام نے میراث کا قانون اسی قسم کی جائدادوں کی تقسیم کے لئے بنایا ہے اور قانون ظاہر ہے کہ شخصی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنتا، جس کلیاتی اصول واضع قانون کے سامنے ہوتے ہیں، میراثی قانون کی بنیاد یہ رکھی گئی ہے کہ بلاواسطہ قریب ترین رشتہ داروں کو ترجیح دی جائے گی اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے اور وراثت کے لئے صرف رشتہ داری کافی ہو تو غالباً ایک ایک مورث کے سینکڑوں وارث بلکہ شاید سارے بنی آدم وارث ہو جائیں، کیونکہ بالواسطہ رشتہ دار تو تقریباً ہر آدمی کا دوسرا آدمی ہے۔ کم از کم آدم میں تو سب ہی جا کر شریک ہو جاتے ہیں، مگر اسی اصول پر کبھی بلاواسطہ قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ مورث کا کوئی بالواسطہ رشتہ دار ایسا بھی پایا جاتا ہے جو واقعہ کے اعتبار سے بلاواسطہ رشتہ داروں سے زیادہ قابل رحم اور محتاج امداد ہوتا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ

کبھی بیٹوں کے ساتھ کوئی یتیم پوتا کسی کا رہ جاتا ہے، میراثی قانون کے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پوتا محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ پوتا اپنے دادا کا براہ راست نہیں بلکہ اپنے باپ کے واسطے سے رشتہ دار ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی پوتا جو یتیم اور کمسن ہوتا ہے کے اعانت کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ ایسے مواقع جو کبھی کبھی پیش آ جاتے ہیں، ان کی وجہ سے لوگوں کو میراث کے قانون میں کچھ نقص نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ قانون کا نقص نہیں بلکہ قانون کے استعمال کرنے والے کا عقلی نقص ہے۔ یہ تو دادا کا فرض ہے کہ جب وہ اپنے پوتے کو اس حال میں پاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ بلا واسطہ رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے وہ میراثی قانون کے تحت میں نہ آئے گا تو اس کو کس نے منع کیا ہے کہ قانون ہبہ اور عطیہ سے اس قابل رحم پوتے کو نفع نہ پہنچا دے۔ خصوصاً جب خاص حالات میں ایک وارث کو دوسرے وارث پر ہبہ اور عطیہ میں ترجیح دی جا سکتی ہے اور مرنے کے بعد کسی وارث کو یہ حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کو اس سے واپس لے لے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ

اذا فاضل بين ولده فى العطايا او خص بعضهم بعطية ثم مات قبل ان يسترده ثبت ذلك للموهوب له ولزم وليس لبقية الورثة الرجوع۔	اگر عطیہ اور ہبہ میں کوئی اپنی اولاد میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دے دے یعنی کسی خاص عطیہ کے ساتھ مختص کرے اور دینے والا اس عطیہ کو واپس کر لینے سے پہلے مر جائے تو جسے یہ چیز ہبہ کی گئی ہے اس کی ملک ثابت ہو جائے گی

اور اس کا حق واجب ہو جائے گا۔ باقی وارثوں کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس عطیہ کے متعلق اس پر دعویٰ کریں۔

اس مسئلہ کو تفصیل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

به قال مالك والشافعى و اصحاب الرائے واكثر اهل العلم۔	امام مالک، امام شافعی اور اصحاب رائے (حنفیہ) اور اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے۔

اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آیت قرآن

فى اموالهم حق للسائل والمحروم	ان کے مال میں مانگنے والوں اور فاقہ زدہ حق سے محروم ہیں ان کا بھی حق ہے۔

میں المحروم کے تحت اس قسم کے محروموں کا حق قرآن نے سرمایہ داروں کے اموال میں اگر نہیں قائم کیا ہے تو پھر یہ اور کن کے حقوق ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے اگرچہ اپنے یا اپنے بال بچوں یا اپنی آئندہ نسلوں کی رزاقیت کے سررشتہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم نہیں دیا ہے اور "اللہ ہو الرزاق ذو القوۃ المتین" ہی کو اس کا متکفل قرار دیا ہے، اسی بناء پر صرف ان ہی لوگوں کو نہیں جو

بالعکس وغیرہ وسواسیوں کی طرح نسل انسانی اور زمین کی غذائی پیداواروں میں عدم توازن کا خطرہ محسوس کر کے خود بھی ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے رہتے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو بھی اس نے ڈانٹا ہے جنہیں اولاد کی کثرت میں معاشی تنگ حالی کا خطرہ محسوس ہوا حتیٰ کہ ان میں بعضوں نے تو اتنی تنگ دلی اختیار کی کہ پیدا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کی گردن تک مروڑنے پر آمادہ ہو گئے اور ایسا فعل جو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ضرورت ہوئی کہ اس کے متعلق قرآن میں

ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق۔	اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو تنگ معاشی کے خوف سے۔

کا حکم دیا جائے اور یہ تو کہا جاتا ہے کہ ایام جاہلیت کی قساوت تھی، لیکن آج بعینہ ان ہی معاشی مشکلات کے بھوت کو سامنے کھڑا کر کے نسل انسانی کے ہمدردوں کا ایک گروہ (برتھ کنٹرول) (ضبط حمل) کے ذریعہ سے پیدا ہونے سے پیشتر انسانی نسل کو تباہ کر دینے کا جو وعظ سنا رہا ہے گویا جاہلیت کی اس سنگدلی سے "عالمیت" کی یہ رحم دلی کچھ کم ہے۔ وہی برتھ کنٹرول کا وعظ کہنے والا اگر خدانخواستہ برتھ کنٹرول کی جھپیٹ میں آ جاتا تو آج اسٹیجوں پر چمک چمک کر یہ باتیں کیا کر سکتا تھا؟ بہرحال اسلام نے "رزاقیت" کی فکر میں قہر کے قانونوں کو کھیلنے سے تو بے نیاز کر دیا ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض معاشیوں نے العزل (صحبت کا ایسا طریقہ جس سے حمل قرار نہ پائے) کی راہ سے جب برتھ کنٹرول کے متعلق منشائے مبارک دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ یہ (واد خفی) ہے، یعنی اولاد کو زندہ مار ڈالنے کی یہ ایک مخفی تدبیر ہے، اور اس کی واقعیت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی آمدنی کو کوئی اس بے ترتیبی سے اڑائے یا خرچ کرے کہ پیچھے اس کی اولاد دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو، مشہور واقعہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حدیثوں میں آتا ہے کہ اپنی ایک سخت بیماری میں ان کو زندگی سے جب مایوسی ہو گئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے تو سعدؓ نے کہا کہ میری وارث صرف میری ایک لڑکی ہے کیا مناسب نہ ہو گا کہ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ خیرات کر دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ سعدؓ نے کہا تو آدھا؟ پھر جواب ملا "نہیں"۔ سعدؓ نے کہا تو ایک تہائی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تہائی بہت ہے۔ اس کے بعد آپؐ کے الفاظ یہ تھے۔

انك ان تذر ورثتك اغنياء خير من ان تذرهم عالة يتكففون الناس۔ (صحاح)	تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں ایسے افلاس کی حالت میں چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنی ذات ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی اگر کسی کو پس انداز کرنے کا موقع ہے تو اسلام اس موقع سے نفع اٹھانے کا حکم دیتا ہے پھر پس ماندوں کی حالت اگر وقف کی مستحق ہو تو منافع کو ان تک پہنچا کر اصل کو محفوظ کر دیا جائے یا اولاد میں سے کوئی لڑکا یا لڑکی زیادہ ضرورت مند ہو یا کوئی رشتہ دار ناقابل امداد ہونے کے باوجود میراثی حصہ سے محروم ہوتا ہوا نظر آرہا ہو، ان کو ہبہ کے ذریعہ سے کچھ دیدیا جا سکتا ہے اور باقی کو ارثی قانون کو تقسیم ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ پہنچ جائے جس کے ذریعہ سے اگر کافی ہو وہ زندگی گذاریں، ناکافی ہو تو اس کو اصل بنا کر آمدنی پیدا کریں۔

مضمون گویا زندگی سے شروع ہو کر ایک حد تک موت اور موت کے بعد تک پہنچ چکا ہے۔ اختصار کی کوشش کے باوجود بات پھیلتی جا رہی ہے اور ابھی چند اہم نقاط اور مصارف وخروج کا مستقل باب باقی ہے۔

محنت ومزدوری

باہمی لین دین کے سلسلہ کی ایک بڑی اہم چیز اجارہ ہے، اردو میں قرا بارہ ٹھیکہ اور کرایہ کے معاملہ کو کہتے ہیں، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں نوکری، مزدوری، کاریگری، کرایہ داری مکان کی ہو یا زمین کی، سب اجارہ کا معاملہ ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ خود چیز دے کر معاوضہ لینا نہیں جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے، بلکہ چیز سے استفادہ کا حق دے کر اس کے معاوضہ میں کچھ لینا ہی اجارہ کا معاملہ ہے۔ پھر اگر مکان، گاڑی، گھوڑا وغیرہ کے متعلق یہ معاملہ کیا جائے تو کرایہ کا معاملہ ہوا اور اگر بجائے اپنی کسی چیز کے خود آدمی اپنی خدمت اور محنت کا معاوضہ حاصل کرے تو اس کی بھی دو صورت ہے۔ مستاجر کی ماتحتی میں اگر کام نہ کرے بلکہ اپنے گھر میں مثلاً کام کرتا ہو تو یہ کاریگری ہے۔ اور اگر مستاجر کی ماتحتی میں کرتا ہے تو اس کی بعض شکلوں کو نوکری بعضوں کو مزدوری کہتے ہیں۔ فقہاء اسلام نے ہر ایک کے متعلق اپنی کتابوں میں مفصل قوانین بنائے ہیں۔ اس زمانے میں ربوا (سود) کی وجہ سے سرمایہ کے ملنے میں جو آسانیاں ہوئیں تو عموماً کاریگروں کو لوگوں نے نوکر اور مزدور بنا کر ان کی اجتماعی محنت سے نفع حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طریقہ سے پیداوار تو اجتماعی شکل میں ہونے لگی یعنی ایک ایک کارخانہ میں دس دس ہزار مزدور کام کرنے لگے اور سرمایہ چونکہ ایک ہی یا چند محدود اشخاص کا ہوتا ہے اس لئے آمدنی شخص یا چند محدود اشخاص کو ملتی رہی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کا سوال اسی شکل نے پیدا کر دیا۔ سرمایہ داروں کو ظاہر ہے بوجہ محدود افراد ہونے کے لاکھوں اور کروڑوں کی شکل میں نفع ملتا رہا، اور مزدوروں کی اجتماعی محنت کا یہ ثمرہ ہے ان کو صرف مزدوری ملتی رہی۔ لیکن چونکہ انفرادی طور پر کام کرنے سے اتنا نفع بھی ان کو نہیں ملتا تھا۔ اس لئے قدرتاً کارخانوں میں کام کرنے کو انھوں نے اپنے لئے زیادہ منفعت بخش پایا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر

مزدور نہ ان مشینوں کو خرید سکتے ہیں اور نہ خام مواد کا اتنا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں جو سرمایہ دار خود یا اپنی ساکھ پر بنکوں سے سودی قرض لے کر مہیا کر سکتے ہیں۔ کارخانہ داروں نے چونکہ اس کا اندازہ کر لیا کہ انفرادی مزدوری سے زیادہ اگر مزدوروں کو کارخانہ میں مزدوری دے دی جائے گی تو سود کے حساب سے نقصان کیا نفع اور کافی نفع ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ شکل میں بھی اگر غور کیا جائے تو مشکلات کی بڑی وجہ یہی سودی اور بنکنگ کا کاروبار ہے۔

اسلام نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے، ایک مستقل مسئلہ ہے۔ پوری تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں تاہم چند کلیات اجارہ کے متعلق ذیل میں ہم درج کرتے ہیں اور علمائے معاشیات توجہ دلاتے ہیں کہ سرمایہ ومحنت کی جو کشتی کس جتن سے آج تک سلجھتی نظر نہیں آرہی ہے۔ انسانی زندگی کے پہلوؤں کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان کی پیچیدگیوں کا کوئی حل کیا مل سکتا ہے یا کم از کم ان کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج جو باتیں نئی خیال کی جاتی ہیں، واقع میں وہ کتنی پرانی ہیں۔ بہر حال بخاری شریف کی ایک حدیث ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اخوانکم خولکم جعلہم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوہم ما یغلبہم فان کلفتموہم فاعینوہم

خول (یعنی تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے، پھر جس کا بھائی کسی کے ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہئے کہ جو کچھ خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو ان کو مغلوب کر دے اور اگر ان پر لادو تو ان کی مدد واعانت کرو۔

اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) مزدور اور جو مزدوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں، اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے پینے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ یعنی کم از کم اتنی اجرت تو بہر حال ہر مزدور کو ملنی چاہئے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔ مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بلند کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش کی کمی کی بہت حد تک توقع کی جا سکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے جو ان کو

اسلام ہر شخص کے لئے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابو مسعودؓ بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے، پیچھے سے ایک آواز:

اعلم ابا مسعود۔ — خبردار ابو مسعود۔

کی آئی۔ ابو مسعودؓ کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون ہے کیا تھے میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور فرما رہے ہیں:

اعلم یا ابا مسعود ان اللہ اقدر علیک منک علی ھذا الغلام (مسلم) — خبردار! ابو مسعود حق تعالیٰ تم پر تمہارے غلام سے زیادہ قابو رکھتے ہیں۔

اور غالباً یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کو عبدی (میرا غلام) امتی (میری لونڈی) کہنے اور ان لوگوں کا اپنے آقاؤں کو ربّی (میرا رب اور مالک) ربتی (میری مالکہ) کہنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی تھی اور حکم تھا کہ بجائے غلام کے فتائی (میرا جوان) اور آقا کو بجائے رب کے سیدی (میرے سردار) کہا کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں غریبوں کے اس طبقہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آخری آواز دنیا کے کانوں نے خدا کے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے جو سنی وہ:

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ — نماز اور جن کے تم مالک ہو ان کی خبر لیتے رہنا (یعنی ان دونوں کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنا)

کی تھی صلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اسی طرح قرآن کی مشہور آیت:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ — اللہ کے پاس سب سے زیادہ عزیز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

میں پیشہ وارانہ طبقات کی جن درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور بجائے پیشوں اور نسلوں کے تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا گیا ہے اس سے مزدوری کے کسی پیشہ کو افضل اور کسی کو کمتر قرار دینے کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔ اسلام اور اسلام پر صحیح معنوں میں چلنے والوں نے اس سلسلہ میں جو عملی نظائر پیش کئے ہیں تاریخ کے اوراق اس سے معمور ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر ہندوستانی تمدن کے نشہ کا ایک متوالا ابوالفضل تعریضاً کہا کرتا تھا کہ فلاں حلوائی اور فلاں کفش دوز کی باتوں کا کیا اعتبار۔

یعنی اسلام میں جتنے بڑے بڑے علماء، فقہاء گزرے ہیں ان میں زیادہ تر لوگوں کا تعلق مزدوری کے معمولی پیشوں سے تھا۔ افسوس کہ جو چیز اسلام میں باعث فخر تھی اس ہندی تمدن کے مسحور کی نگاہ میں وہی باعث ننگ قرار پائی۔ مگر بہرحال آفتاب دنیا نیم کے جس نقطہ پر آچکا ہے وہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ آج جس چیز کے ماننے کے لئے عالم مضطرب ہے، اسلام صدیوں پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا ہے اور عمل کر کے دکھا چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹھٹھیروں کو بھی اسلام نے جب تخت و تاج کا مالک بنایا تو صفاریت[1] کے لقب کو انہوں نے بطور فخر کے استعمال کیا، اور غلاموں کی جو قدر و عزت اسلام میں ہوئی دنیا کی تاریخ اپنے پاس اس کی نظیر نہ اس سے پہلے رکھتی ہے اور نہ بعد۔ تقریباً ائمہ حدیث و فقہ کی بڑی جماعت موالی ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف دین ہی میں نہیں، مختلف مقامات میں دنیا کے حساب سے بھی دنیوی ارتقاء کے آخری نقطہ سلطنت و بادشاہت تک غلاموں کو عروج پاتے جیسے تم مسلمانوں میں پا سکتے ہو۔

لیکن باوجود اس کے ذلت کی وجہ سے نہیں بلکہ بعض پیشوں کا چونکہ گندگی اور نجاست سے تعلق ہے اس لئے چند خاص پیشوں کے متعلق علمائے اسلام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے جن میں ایک تو سنگی لگانے (حجامت) کا پیشہ ہے۔ چونکہ سنگی لگانے والے خون کو چوستے ہیں اور خون نجس چیز ہے۔ اسی لئے بعض حدیثوں میں آیا ہے:

کسب الحجام خبیث۔ — سنگی لگانے والے کی کمائی گندی ہے۔

لیکن باوجود اس کے بھی اکثر ائمہ اسلام نے اس کی اجرت اور مزدوری کو حلال ہی قرار دیا ہے۔ علامہ مقدسی نے اجرۃ الحجام مباح یعنی سنگی لگانے کی مزدوری حلال ہے لکھنے کے بعد رقم فرماتے ہیں:

ھذا قول ابن عباس قال انا آکلہ وبہ قال عکرمۃ والقاسم وابو جعفر محمد بن علی بن الحسین وربیعۃ ومالک والشافعی واصحاب الرائے — یہ ابن عباس کا قول ہے، انہوں نے فرمایا کہ میں اس کو کھاتا ہوں اور یہی عکرمہ، قاسم، ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین اور ربیعہ، امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے (ابوحنیفہ) کا ہے۔

اگرچہ بعضوں کو اس سے اختلاف بھی ہے۔ تاہم یہ اختلاف حجام کے صرف سنگی لگانے کے کام کی حد تک محدود ہے باقی اور نائی حجام جو دوسرے کام کرتے ہیں ان کے جائز ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے۔ مقدسی کا بیان ہے:

استیجار الحجام لغیر الحجامۃ کالفصد وحلق الشعر وتقصیرہ والختان وقطع شیئ — پچھنے لگانے کو چھوڑ کر حجاموں کے کام یعنی فصد کا کام، بال مونڈنے کا کام یا ترشنے کا یا ختنہ کرنے کا یا جسم کے کسی

[1] صفار عربی میں ٹھٹھیروں کو کہتے ہیں، خاندان صفار، حکومت اسلامی کے خاندانوں میں مشہور تاریخی خاندان ہے۔

من جلس للحاجة فيجاز ...	حد کے کاٹنے کا اگر ضرورت پیش آئے تو اس کی مزدوری جائز ہے

اسی سلسلہ کی ایک اور چیز کا تذکرہ بھی فقہائے اسلام نے کیا ہے، یعنی خاکروبوں اور بھنگی کا کام ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ بھی ایک قسم کی مزدوری ہے، لیکن بھنگیوں کو چونکہ نجاست سے کام پڑتا ہے اس لئے علماء نے اس پیشہ کو اچھا نہیں خیال کیا ہے۔ ابن عباس کا ایک اثر بھی اس باب میں نقل کیا جاتا ہے کہ حج سے فارغ ہو کر ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ

أكنس فما ترى في مكسبي۔	میں صفائی کا کام کرتا ہوں میرے پیشہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ابن عباسؓ نے پوچھا

أي شيء تكنس (کس چیز کو صاف کرتے ہو) بولا العذرة (یعنی غلاظت) کو صاف کرتا ہوں اور آگے ابن عباس سے اضافہ بھی کیا،

ومنه حججت ومنه تزوجت	اس کی مزدوری سے میں نے حج بھی کیا اور شادی بھی کی۔

یہ سن کر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سخت کراہت پیدا ہوئی غصہ میں بولے۔

انت خبيث وحجك خبيث و ما تزوجت خبيث۔	تو بھی گندہ تیرا حج بھی گندہ اور جو تو نے شادی کی وہ بھی گندی۔

لیکن باوجود ابن عباس کے اس سخت فتویٰ کے علماء نے اس "خبث" کا مطلب مذہبی "خبث" نہیں لیا ہے بلکہ طبعی خبث اور کراہت مراد ہے، اسی لئے عام خیال یہی ہے کہ

الاجارة فيها جائزة لان الحاجة داعية اليها ولا تندفع الا باباحة الاجارة فوجبت اباحتها كالحجامة (المغنی ص ۳۰۶)	غلاظت صاف کرنے کی مزدوری جائز ہے کیونکہ ضرورت کا تقاضا ہے اور جب تک اس کی مزدوری حلال نہ ہوگی یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اس لئے اس کا حلال ہونا ضروری ہے جیسے سنگی لگانے کی مزدوری حلال ہے۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

کھاد جس میں ہر طرح کی نجس چیزیں شریک ہوتی ہیں گوبر، غلاظت وغیرہ، لیکن مشہور صحابی یعنی فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کتابوں میں یہ نقل کرتے ہیں کہ

كان سعد بن ابي وقاص رضي الله تعالى عنه يحمل العرة الى ارض له وكان يقول	حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ کھاد خود لا کر اپنے کھیت میں ڈالتے تھے جو ان کی ملکیت میں تھا اور فرماتے کہ

مكتل عرة مكتل بر (بیہقی ص ۱۳۸ ج ۶)	ایک ٹوکری کھاد کی گیہوں کی ایک ٹوکری ہے۔

عرہ کی شرح اصمعی کے حوالے سے بیہقی نے نقل کیا ہے کہ عذرۃ الناس کو کہتے ہیں، یعنی غلاظت! کچھ یہی ہے کہ خالص غلاظت تو وہ نہ ڈالتے ہوں گے بلکہ مختلف چیزوں کو ملا کر کھاد تیار کرتے تھے، ترکاری کی کھاد کا ذکر ابن سعد میں بحوالہ ابو العالیہ یہ ہے کہ الخرء والبول والحش ... یعنی پرندوں کی بیٹ، پیشاب اور حیض کے لتے۔ اس لئے بعض صحابہؓ کھاد ڈالنے کو ناپسند کرتے تھے۔ ابو العالیہ بھی عموماً ساگ پات ترکاری اسی لئے کم کھاتے، البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں جو باغ تھا اس سے تحفۃً جب ترکاری آتی تو شوق سے کھاتے شاید بغیر کھاد کے اگائی جاتی ہوگی حضرت انسؓ کے اس باغ میں، لکھا ہے کہ ایک پھول تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی (ابن سعد ص ۱۰ ج ۷)

اسی قسم کی ایک گندہ اجرت "جس کا جاہلیت میں خاص رواج تھا اور اسے اصطلاحاً عسب الفحل" کہتے تھے یعنی اونٹ، بکری، گھوڑے وغیرہ کا جس کے پاس نر جانور ہوتا، وہ بچہ کشی کے لئے اس نر کو کرایہ پر چلاتا تھا۔ فقہاء نے اس معاوضہ کو گو مکروہ لکھا ہے اگرچہ ضرورت کی وجہ سے بعضوں نے اجازت بھی دی ہے۔ بہر حال اگر معاوضہ کے طور پر نہیں بلکہ بطور ہدیہ کے نر کے مالک کو کچھ دیا جائے اس میں حرج نہیں ہے لکھا ہے،

ان اطرق انسان فحله بغير اجارة ولا شرط فاهدى له هدية او اكرمه بكرامة لذلك فلا باس به۔ (ص ۳۰۴)	اپنے نر کو کوئی اگر بغیر کسی اجارہ شرط کے چھوڑے اور اس کے بعد کوئی تحفہ دیا جائے یا کوئی عزت افزائی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بجز ایسی چیزوں کے جن سے استفادہ ہی کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً زنا، گانا بجانا، نوحہ گری، تصویر کشی وغیرہ۔ چونکہ یہ سارے کام بھی اسلامی نقطۂ نظر سے برے ہیں، اس لئے ان کو بھی حصول معاش کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ائمہ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے نصوص اور اسلامی مستندات کی بنیاد ہی پر کہا ہے ورنہ جہاں کہیں تھوڑی سی بھی گنجائش نظر آئی ہے جیسا کہ نہیں تو بعض ائمہ نے معاش کی اس راہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے اسلام نے اس باب میں کس حد تک وسعت نظر سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ شراب جیسی حرام چیز کے متعلق اوروں کا تو نہیں، لیکن امام ابو حنیفہ کا یہ فتویٰ کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے۔

من حمل لذمي خمرا فانه يطيب له الاجر عند ابي حنيفة۔ (کتاب الکراہیۃ ہدایہ ص ۴۵۰ ج ۴)	اگر کسی نے کسی ذمی کی شراب ڈھوئی تو مسلمان کے لئے اس ڈھونے کی مزدوری امام ابو حنیفہ کے نزدیک پاک ہے۔

امام صاحبؒ کے خیال کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ شراب کا پینا حرام ہے اور پینے کی نیت سے اس کا ڈھونا بھی حرام ہے۔ لیکن اس مسلمان بیچارے کی غرض تو مزدوری ہے خواہ پانی ہو یا شراب۔ پھر اس کی مزدوری کو کس بنیاد پر ناپاک قرار دیا جائے۔ لیکن اور تو اور امام صاحب کے دونوں شاگرد ابو یوسف و محمد بن حسن کا فتویٰ اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں چونکہ شراب کے سلسلہ میں جن جن لوگوں پر لعنت کی گئی ہے ان میں "حاملها" اس کے ڈھونے والے کا لفظ بھی ہے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ وہ خود پینے کے لئے شراب ڈھونے والے کے ساتھ بحکم مخصوص ہے۔ بہرحال مجھے اس مثال سے فقہاء کی معاشی وسعت نظری کا ثبوت پیش کرنا تھا اور یہ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ مگر باوجود ان وسعتوں اور اجازتوں کے دو چیزیں فقہاء کی کتابوں میں عجیب پائی جاتی ہیں یعنی ایک تو یہ کہ مسلمان کیا کسی کافر کی ملازمت و نوکری کر سکتا ہے! یہ سوال اٹھایا گیا تھا اور درحقیقت مسلمانوں کے متعلق کیا معلوم تھا کہ کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جواب تو جواب سوال بھی دماغوں سے نکل جائے گا۔ حتیٰ کہ بالآخر ان کی ساری قومی اور ملی کوششوں کا آخری محور یہی مسئلہ رہ جائے گا کہ غیر اسلامی حکومتوں میں ملازمت کے حقوق کی کتنی مقدار ان کو حاصل ہوئی۔ یعنی کے حق کا مسئلہ ہے۔

لا تجوز اجارة المسلم للذمی لخدمة نص علیه احمد۔	مسلمان کو ذمی کا اپنی خدمت کے لئے نوکر رکھنا جائز نہیں ہے۔ امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے۔

دلیل یہ بیان کی ہے کہ

حبس المسلم عند الکافر واذلاله له۔	یہ مسلمان کا کافر کے پاس قید ہونا بھی ہے اور مسلمان کو ذلیل کرنا بھی ہے۔

مجھے مسئلہ کے ذکر سے اس وقت جواز و عدم جواز کی تحقیق مقصود نہیں ہے۔ آخر اسے اگر جائز قرار دیا جائے گا تو مسلمانوں کے جینے کی شکل ہی کیا رہے گی، بلکہ دکھانا کسی قوم کے تاریخی انقلاب کا ہے۔

واذا اراد الله بقوم سوءا فلا مرد له وما لهم من دونه من وال۔	اور اللہ جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتا ہے، تو پھر اسے کوئی پھیر نہیں سکتا اور نہ اس کا کوئی والی و مددگار ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کے ایک مسئلہ کا ذکر آخر میں اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ فقہائے امت کی بلند نظری کا لوگوں کو کچھ احساس ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی معاشیات کی تدوین میں ان بزرگوں نے کتنی بے لوثی سے کام کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کام ہی قرآن و حدیث کی تدریس و تعلیم یا مساجد کی امامت و خطابت وغیرہ تھا۔ اور اب بھی بیچارے مولویوں کا یہی کام ہے مگر باوجود

اس کے حیرت ہوتی ہے کہ چند لوگوں نے نہیں بلکہ اکثر ائمہ اسلام کا فتویٰ ان تمام امور کے متعلق یہ ہے کہ ان خدمات کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ جن کاموں پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے ان میں "الامامة والاذان والحج وتعلیم القرآن" بھی ہے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

نص علیه احمد وبه قال عطاء والضحاک بن قیس وابو حنیفة والزهری۔	امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے اور یہی خیال ضحاک بن قیس، ابوحنیفہ اور زہری کا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے اور بالآخر زمانے کے حالات کا اندازہ کر کے جواز کا فتویٰ اس بناء پر دے دیا گیا کہ چند ائمہ مثلاً شافعیؒ و مالکؒ جواز کے قائل تھے۔ آخر اگر اس کا فتویٰ نہ دیا جائے تو مفت حسبةً للہ ان خدمات کو انجام دینے کے لئے کون آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو کچھ گذشتہ بزرگوں ہی کی ہمت تھی کہ معاش کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کر کے دین کی ان خدمات کو مفت انجام دیتے تھے لیکن ع

زمانہ دگر گوں آئین نہاد

مزارعت و مساقات چاہئے تو یہی تھا کہ ان دونوں معاملات کا ذکر بھی اجارہ ہی کے ذیل میں کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بھی محنت و مزدوری سے ہے۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ کتب اسلام ان دونوں کو الگ الگ کر کے لکھتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان کا علیحدہ ذکر کرتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ محنت و سرمایہ میں جو جھگڑا اس وقت دنیا میں جاری ہے اس سلسلہ میں جس طرح صنعتی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے اختلاف کے حل کی ایک شکل اسلام نے پیش کی ہے جیسا کہ گذر چکا کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی زندگی کم از کم اتنے پیچھے کی حد تک ایک ہو یعنی یوں ہو کہ مزدوری مزدوروں کو اتنی ملنی چاہئے جس کے ذریعہ سے ان کی خوراک اور ان کا لباس سرمایہ دار کی خوراک اور لباس کے برابر ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مزدور کو منافع سے بھی کچھ حصہ ملنا چاہئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مزدوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ یعنی سرمایہ دار کے لئے یہ جائز نہ ہو کہ محض مصارف کے ڈر سے زیادہ مشقت کے کام کو چند ہی مزدوروں سے لے بلکہ ان کی معاونت کے لئے قوت کا اضافہ کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام کا وقت اسی قدر مقرر کیا جائے جتنا کہ وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ صحاح کی کچھ روایتوں سے یہ تینوں نتائج برآمد ہوتے ہیں قریب قریب کچھ اسی قسم کا مسئلہ زمین کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ قبل اسلام عرب خصوصاً مدینہ و اطراف مدینہ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان

اور بخاری ہی میں ہے،

وزارع علی وسعد بن مالک وابن مسعود وعمر بن عبد العزیز والقاسم وعروۃ وآل ابی بکر وآل عمر وآل علی وابن سیرین وقال عبد الرحمن بن الاسود کنت اشارک عبد الرحمن بن یزید فی الزرع۔ (البخاری ص ۳۱۳ ج ۱)

اور حضرت علی حضرت سعد بن مالک و ابن مسعود و عمر بن عبد العزیز قاسم اور عروہ اور حضرت ابو بکر کے گھرانے والے حضرت عمر کے گھرانے والے حضرت علی کے گھرانے والے اور ابن سیرین سب ہی کاشت بندوبست کرتے تھے عبد الرحمن بن اسود کہتے ہیں کہ میں عبد الرحمن بن یزید کے ساتھ بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔

جس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ عہد صحابہؓ میں کاشت کاری کا رواج کس پیمانہ پر تھا وہیں اس سے بٹائی پر کاشت کاری کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کو ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خاص منشا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہی رافع ابن خدیج جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جن کا گھرانا مدینے کے سب سے بڑے کاشت کاروں کا تھا ان سے ایک روایت عہد صحابہؓ میں مشہور ہوئی جس کے الفاظ مختلف ہیں۔ ایک طریقہ اس کا درج کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

انما یزرع ثلاثة رجل له ارض فهو یزرعها ورجل منح اخاه ارضا فهو یزرع ورجل اکتری بذهب وفضة (الطحاوی)

کھیتی تین ہی قسم کے آدمی کرسکتے ہیں ایک تو وہ جس کی زمین ہو اور اس میں کھیتی کرے، دوسرا وہ جسے اس کے بھائی نے زمین دی ہو اور وہ اس میں کھیتی کرے، تیسرا وہ شخص جو زمین کو سونے یا چاندی کے معاوضہ میں کرایہ پر لے۔

حضرت رافع نیز حضرت جابر بن عبد اللہ دونوں صحابیوں سے اس باب میں اس قسم کے الفاظ مروی ہیں جن کا حاصل ان سب کا یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس زمین ہو تو یا اس میں خود کاشت کرے اور اگر خود نہیں کرتا تو پھر اس کے لئے کل دو صورتیں ہیں، یا تو اپنے کسی بھائی کو مفت کاشت کرنے کے لئے دیدے، اور یہ بھی پسند نہ ہو تو سونے چاندی کی شکل میں اس کا کرایہ لے یعنی نقدی بندوبست کردے۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ بٹائی کی مذکورہ بالا شکل کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ جس طرح پس ماندہ سرمایہ کو قرض میں دلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرات کی مدوں میں ایک جدید مد کا اضافہ فرمایا ہے، اسی طرح زائد زمین کے متعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے ایک نئے باب کو کھولا ہے جس سے شاید دنیا اب تک ناواقف ہے یعنی جس طرح قرض کی صورت میں مقروض سے کسی قسم کے نفع اٹھانے کی ممانعت کردی گئی ہے۔ اسی طرح زائد زمین جو بطور عطیہ کسی کو

دی گئی ہو اس سے نفع اٹھانے کی ممانعت ہے۔ ان ہی رافع سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر ہم زمین میں کچھ نہ بوئیں اور نہ کسی کے ساتھ نقدی بندوبست کریں اور کسی دوسرے نے اس میں کاشت کی پھر کچھ

وهب لی من تبنها شیئا انتفعا
قال لا (الطحاوی)

اس کی روئیدگی سے مجھے کچھ جزدے کیا میں اسے لے سکتا ہوں بولے نہیں۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

قال کان لرجال من فضول ارضین علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فکانوا یواجرونها علی النصف والثلث والربع فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم من کان له ارض فلیزرعها[۱] او لیمنحها اخاه فان ابی فلیمسک (طحاوی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں، عموماً لوگ نصف یا تہائی یا چوتھائی پر اپنی زمینوں کو بندوبست کردیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو اس میں وہ خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے کسی بھائی کو دیدے اور اگر اس سے وہ انکار کرتا ہے تو پھر رک جائے۔

(فضول ارضین یعنی زائد از کاشت زمین اگر زمیندار کے پاس ہو تو ایک صورت یہ ہے کہ آخرت کے لئے اس میں کاشت کرائے اور ثواب کی خدا سے توقع کرے، اور یہ نہ ہو سکے تو جیسا کہ حضرت رافع سے مروی ہے زمین کو نقدی بندوبست کردے۔

مساقات اور یہ حال تو زراعت یعنی کاشت کا ہے، قریب قریب یہی نقطۂ نظر اسلام میں مساقات یعنی باغات اور گلستانوں کے متعلق ہے کہ گو حنفی فقہا یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ مالک باغ کسی کو اپنا باغ اس شرط سے بندوبست کرے کہ جو کچھ پھل آئے نصف و ثلث کے حساب سے تقسیم کرلیا جائے گا۔ البتہ مالک باغ کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ کوئی متعین حصہ پھلوں کا مثلاً یہ کہ چار سو آم یا دو ہزار جامن[۲] اس معاملے میں

---

[۱] ان دونوں حدیثوں کے سوا حدیث کی کتابوں سے اور بھی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین کا آدمی خود جوتے یا کرایہ پر کسی کو دیدے۔ یعنی یہ بات کی نقدی ہی پر۔ بعض حدیثوں میں اس پر زیادہ تاکید کا اعلان کیا گیا ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمینداروں کے اس طبقہ کو جو نہ خود کاشت کرتے ہیں اور نہ مفت دوسروں کو دیتے ہیں بلکہ زمین کا کرایہ بشکل نقد یا غلہ کھاتے ہیں۔ کیا اسلام اس طبقہ کو ختم کردینا چاہتا ہے۔ یہ ایک اہم معاشی سوال ہے اور اس پر بحث کی کافی گنجائش ہے ۱۲

[۲] جامن حیدرآباد میں امرود کو کہتے ہیں ۱۲

حکومت کی آمدنی

اور اس کے مصارف و اغراض

حکومت کی آمدنی پر بحث کرنے سے پہلے دراصل غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے زور سے سرکاری خزانوں میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے اغراض کیا ہیں یا کیا ہونا چاہئیں۔ جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کبھی تو یہ آمدنی محض اس لئے جمع کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے زمین کے کسی حصہ پر کسی ذریعہ سے اپنا ایسا اقتدار قائم کر لیا کہ عام باشندوں سے ان کے مطالبوں کا انکار جان و مال کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ اب ان کا نام خواہ کچھ رکھ لیا جائے راجہ یا بادشاہ یا کنگ یا کچھ اور، بہرحال محض ان کے اور ان کے اعزہ و اقربا و حوالی و موالی کے عیش و آرام کا مہیا کرنا یہی ان کی حکومت کی آمدنی کی غرض ہوتی ہے۔ حکومتی آمدنی کے متعلق تنگ ترین نقطۂ نظر جو ہو سکتا ہے وہ یہی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ دنیا نے اس کا تماشا اکثر دیکھا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جو نصب العین اس آمدنی کا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آمدنی کو دشمنوں کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور آمدنی پیدا کرنے والوں کو اطمینان و فراغت کے ساتھ دولت کی پیدائش میں مشغول رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ بھی اس آمدنی سے پوری کی جائے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہئے کہ شاہی مصارف کے سوا کشوری (انتظام عدالت پولیس) اور فوجی مدات پر خزانہ کا روپیہ صرف کیا جائے۔ پہلی غرض سے ظاہر ہے کہ یہ دوسری غرض اپنے اندر ذرا زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس وسعت کی بھی آخری غرض وہی ہوتی ہے کہ راجہ یا بادشاہ اور ان کے خاندان کے افراد کے عیش و آرام میں خلل واقع نہ ہو۔

اس سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر تیسرا نصب العین یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا اغراض کے عام باشندوں کی مشترک ضروریات مثلاً صحت و تعلیم طریقۂ مواصلات (سڑکیں، ریلوے، پوسٹ، ٹیلی گرام) وغیرہ اغراض پر بھی حکومت کی قوت سے جمع کردہ رقم صرف کی جائے۔ غالباً اس زمانہ کی

مہذب ترین حکومتوں کی آمدنی کا یہ بلند ترین نصب العین ہے جو قائم کیا جا سکتا ہے یا جیسا کہ کہا جاتا ہے بعض حکومتیں جنا بھی مالکانہ اغراض کی تکمیل کے لئے نہیں بلکہ محض محکوموں کی رفاہیت اور خیر اندیشی کے لئے اپنی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسی کو خیال کرتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام طور پر حکومتوں کی آمدنیوں کے اغراض اس زمانہ تک عموماً مذکورہ بالا نصب العینوں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خواہ وہ حکومت قومی ہو یعنی اپنی قوم پر ہو یا کسی دوسری قوم پر۔

کیا حکومت کی آمدنی کے اغراض اس سے آگے بھی کسی وسعت نظری کو مستلزم ہیں۔ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا اغراض کے سوا جب یہ واقعہ ہے کہ ہر حکومت اپنے محدود مقبوضہ علاقہ میں انسانوں کی ایک بڑی آبادی کو بسائے رکھتی ہے۔ اور ان ہی آباد کاروں کی محنت و جانفشانی کی بدولت ایک ایک پیسہ دو دو پیسے اکٹھا کر کے کروڑوں روپیہ کا خزانہ جمع کر لیا جاتا ہے اور جب اس زمانے میں کم از کم یہ مان لیا گیا ہے کہ اقتداری قوت خواہ شخصی یا خاندانی رنگ میں ہو یا کسی جتھے اور ٹولی کی شکل میں ہو ان کے عیش و آرام بچے و گئے کے سوا حکومت کی آمدنی کا مصرف رعایا کی سہولتوں کا بھی بہم پہنچانا ہے۔ اسی لئے تعلیم و صحت وغیرہ کو بھی اب حکومتوں نے اپنے موازنوں کا جزء بنا لیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکاری خزانے جن غریبوں کی پیشانیوں کے پسینے کے قطرے قطرے سے منتے ہیں کیا ان کی ضرورتیں ان ہی عام پبلک ضرورتوں تک محدود ہیں جن سے محکوموں کے ساتھ ساتھ حاکموں کو بھی نفع پہنچتا ہے سڑکوں پر اگر غریبوں کے چھکڑے اور بیل گاڑیاں چلتی ہیں تو اقتداری قوتوں کی موٹریں اور جھلیاں بھی تو آخر ان ہی سے گذرتی ہیں۔ جن ہسپتالوں سے غریبوں کو دوائیں ملتی ہیں ان ہی کے سرجنوں اور نامی سرجنوں سے حاکمانہ دماغوں کو بھی تو میڈیکل ایڈ وقت پر میسر آتا ہے اور جن کالجوں اور اسکولوں میں ملک کے عام رعایا کے بچے خواہ کسی قیمت پر بھی ہو علم حاصل کرتے ہیں۔ ان ہی سے حکومت کو اپنی مختلف مشنری کے لئے پرزے بھی مہیا ہوتے ہیں۔ یقیناً ملک کے آباد کاروں کی ضرورتیں ان ہی مشترک اور عام ضرورتوں تک محدود نہیں ہیں۔

آخر ان ہی میں آئے دن کتنے بچے یتیم ہوتے ہیں۔ کتنے جوان بوڑھے ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں کتنی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ کتنے تاجر نقصان اور خساروں میں مبتلا ہو کر دیوالیہ بنتے رہتے ہیں اور سب سے آخر میں یہ کہ کتنے کاشتکار غریب کا شکار آفات ارضی و سماوی میں گرفتار ہو کر قرض و دوام کے بوجھ کے نیچے دب دب کر کراہتے رہتے ہیں۔ کتنے جوان باوجود تلاش معاش کے بے روزگار پھرتے ہیں۔

کیا ان غریبوں کی یہ خصوصی ضرورتیں نہیں ہیں یا ان کا حال قابل رحم نہیں ہے۔ وہی اپنی کمائی سے حکومت کے خالی خزانوں کو معمور کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ بیچارے خالی ہوتے ہیں تو ان پر ترس کھانے والا کوئی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ملک کی یہ ایسی ناگزیر ضرورتیں ہیں جو (محکوم و حاکم کی) ان مشترک ضرورتوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کا نام آج رفاہات عامہ وغیرہ ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے بلند بانگ دعووں والی حکومتوں نے بھی کھل کر اس سوال کی طرف توجہ نہیں کی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حکومتوں کی موجودہ آمدنیاں اتنی کافی بھی نہیں ہوتیں جو حاکمانہ قوتوں کے محلوں اور بنگلوں کی تکمیل کے بعد اتنا بچا سکتی ہوں جس سے مشترک ضرورتوں کے سوا ملک کی ان شدید ضرورتوں پر بھی باضابطہ منظم شکل میں کچھ خرچ کر سکتی ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی انجمن ہائے امداد باہمی کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں تاکہ ملک کے معذوروں کا کچھ بوجھ ہلکا ہو۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں بیمہ کمپنیوں کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور بیمہ کے ایجنٹ شہر بہ شہر گاؤں گاؤں میں پھر پھر کر مرے ہوئے باپوں کی لاشوں کے سامنے یتیموں اور بیواؤں کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ہر شخص کو ہول دل میں مبتلا کرتے پھرتے ہیں، کبھی مسئلہ بیروزگاری پر میدانوں میں یا ہالوں میں کمیٹیوں پر کمیٹیاں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ سوچا جا رہا ہے کہ آخر اس کا حل کیا ہے۔ کبھی سرکاری ملازمتوں کی نشاندہی کے لئے دفاتر قائم کرکے حکومت کے مصارف میں ایک اور جدید مصرف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

سر دست مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ تدبیریں واقعی مفید ہیں یا ان سے حاصل اور ان کی بعض شکلوں مثلاً بیمہ یا انجمن ہائے امداد باہمی میں جو سودی کاروبار لین دین جاری ہے اس کے متعلق اسلامی نقطہ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ ان ساری کوششوں سے اتنا بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ ملک کی ضرورتوں کا انحصار صرف ان ہی مشترک ضرورتوں میں نہیں ہے جنہیں آج پبلک ورکس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو انجمن ہائے امداد باہمی کا جال بیمہ اور انشورنس والوں کی زمزمہ خوانیوں ماتم سرائیوں، بے روزگاری اور ان کے ڈھنڈوروں کی آخر توجیہ کیا ہوگی۔

الحمدللہ کہ اسلام نے جس وقت حکومت اور حکومت کے خزانے کی بنیاد ڈالی۔ بنیاد ہی کے وقت ملک کی ضرورتوں کا یہ سب سے آخری سوال اس کے سامنے پہلے آیا اور اس سوال کا حل بھی اس نے سب سے پہلے نکال لیا۔

مطلب یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جب اسلامی دعوت نے مذہبی دعوت کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تنظیم کی شکل بھی اختیار کی تو ظاہر ہے کہ نہ اس وقت ملک تھا نہ خزانہ صرف چند اللہ کے بندے تھے جو اپنے ذاتی مصارف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں اترے (۳۱۳) سپاہیوں کو جو پہلی فتح بدر میں ہوئی اور خواہ جنگ کی تاریخ میں یہ کتنی ہی چھوٹی جنگ کیوں نہ ہو لیکن عالم کی تاریخ کے جتنے انقلابی فیصلہ کن معرکے ہیں ان میں یقیناً سب سے بڑا انقلابی معرکہ یہی تھا۔ اسی جنگ نے وہ فیصلہ کیا جو بالآخر تاریخ کا ایک اہم فیصلہ بن گیا اور اب تک بنا ہوا ہے۔

اس جنگ میں سب سے پہلے ایک ہزار سپاہی اور وہ بھی غریب عرب کے بھاگے ہوئے سپاہ جو کچھ مسلمانوں کو کچھ سامان ہاتھ آیا اور یہی اسلامی حکومت کی پہلی آمدنی تھی۔ حکومت کی آمدنی کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر آئندہ کیا ہونا چاہیے کیا اقتدار حاصل کرنے والوں کے عیش و آرام کا وہ ذریعہ ہے یا اور کچھ ہے حالانکہ ابھی حاصل ہی کیا ہوا تھا لیکن "گربہ بروز اول باید کشت" قرآن نے نازل ہو کر اعلان کیا

يسئلونك عن الانفال	لوگ انفال (جنگ کے حاصل شدہ مال)
قل الانفال لله والرسول۔	کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ یہ اللہ

اور رسول کا ہے۔

کسی کا کچھ نہیں ہے صرف اللہ کا ہے اور اللہ کی مرضی کی نمائندگی چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے اس لئے رسول کا ہے اب تک جو دنیا کا نقطہ نظر اموال مفتوحہ یا حکومت کی آمدنی کے متعلق تھا، اچانک بدل گیا جب وہ بدل چکا تب اس اجمال کی تفصیل کی گئی،

واعلموا انما غنمتم من شيء	اس کو جان لو کہ تم نے جو کچھ غنیمت
فان لله خمسه وللرسول	میں حاصل کیا تو اللہ اور رسول اور
ولذي القربى واليتامى	قرابتداروں یتیموں مسکین مسافر کے لئے
والمساكين وابن السبيل۔	اس میں پانچواں حصہ ہے۔

یعنی جنہوں نے لڑائی میں کام کیا ہے ان کو بھی ان کا خدا ہی حصہ دے گا لیکن آئندہ سے قانون بن گیا کہ اس راہ سے جو آمدنی ہوگی اس میں سے پانچواں حصہ حکومت لے لیگی باقی سپاہیوں پر تقسیم کر دی جائے گی۔

حکومت کے خزانے میں جو یہ پانچواں حصہ جمع ہوگا اس کا مصرف کیا ہوگا۔ حالانکہ شدید ضرورتیں تھیں۔ تنہا اسلام مٹھی بھر مددگاروں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا سارا عرب مشرکین یہود نصاریٰ حتیٰ کہ رومی اور ایرانی حکومتیں جو کرۂ زمین کے اقتدار اعلیٰ کی حیثیت اس وقت رکھتی تھیں سب کی نگاہیں مدینہ کی اس دعوت و تنظیم پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر دنیا کی حکومتیں جس مسئلہ کو اب تک سوچ ہی نہیں سکی ہیں یا سوچ رہی ہیں تو حل نہیں کر سکتی ہیں۔

تمام خطرات سے بے پرواہ ہو کر اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پھر پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پانچوں میں صرف ایک حصہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لئے مختص کیا گیا جس کے ذریعے یہ اقتدار حاصل ہوا تھا۔ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور ایک حصہ آپ کے جاں نثار رشتہ داروں کے لئے جنہوں نے مکہ سے مدینہ تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا تھا باقی تین حصوں کو بجائے کشوری و فوجی مصارف کے ملک کے الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل (مسافروں) کے لئے چھوڑ دیا گیا اور یہ تو شروع میں ہوا، پھر جب کل چندہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں

اسی تین سو تیرہ آدمیوں والی جنگ کے فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت بازنطینی حکومت کا اکثر حصہ سما گیا تو فرعون بنانے والی زمین کے محاصل اور کلاہ کج کر دینے والی دولت مدینہ والی حکومت کے خزانے میں سمٹ سمٹ کر آنے لگی تو کیا اس وقت بھی یہ اصول فراموش کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب بتدریج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی اقتدار عرب میں بڑھنے لگا اور عرب کے قبائل مختلف طریقوں سے آپ کے زیر اثر آگئے۔ مدینے کے اطراف کے یہود اور خیبر کے یہود کی زمینوں پر خدا نے آپ کو قبضہ دلا دیا اور یوں مختلف ذرائع سے آمدنی کا امکان پیدا ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک ہی میں ایسی صورتیں اختیار فرمائیں جن کے ذریعہ سے اسلامی خزانہ میں دو قسم کی آمدنیاں آنے لگیں۔

(۱) ایک آمدنی تو وہ ہوئی جس کا نام خراج رکھا جا سکتا تھا اور یہی بعد کو اس کا نام ہوا اور ایک آمدنی کی مد وہ تھی جس کا نام "الصدقات" تھا۔

غیر مسلم اقوام کی زمینوں (یعنی کھیتوں اور باغوں) سے جو آمدنی آتی تھی یا جزیہ کے نام سے جو محصول ان سے وصول ہوتا تھا اس کا شمار تو خراج میں تھا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی زمین مسلمانوں کی تجارت مسلمانوں کے مویشی (جو بطور کاروبار کے پالے جاتے تھے اور اکثر زمانہ ان کا جنگلوں میں گزرتا تھا) مسلمانوں کی اندوختہ دولت بشکل سونا چاندی ان چار ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی کا نام "الصدقات" تھا پھر اسی میں غنیمت کے خمس (پانچویں) حصہ سے تین حصے بھی جو الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کے لئے مخصوص تھا وہ بھی "الصدقات" میں شریک کر دیا جاتا تھا۔

خراج کی آمدنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تو تھوڑی تھی لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں خراجی آمدنیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ حالانکہ گزشتہ حکومتوں کے تمام ظالمانہ ٹیکس حذف کر دیا گیا تھا۔ اسلامی قانون ہے کہ کسی زمین پر زیادہ سے زیادہ خراج نصف پیداوار سے زیادہ نہ لگایا جائے نیز

ان غلب علی ارض الخراج الماء او انقطع الماء او اصطلم الزرع آفة فلا خراج علیه (هدایه)

اگر خراجی زمین کو پانی سے نقصان پہنچے یا آب پاشی کے ذرائع منقطع ہو جائیں یا کھیتی برباد ہو جائے تو ایسی زمینوں سے خراج وصول نہ ہوگا۔

نیز اسی طرح جزیہ سے ظاہر ہے کہ عورت بچے بیمار معذور بڈھے بیروزگار مذہبی طبقہ (مثلاً پادری جوگی) غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے صرف کاروباری آدمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ وہ بھی اگر مسلم جزیہ ہے تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں ورنہ یوں معمولاً امراء سے تقریباً ایک روپیہ ماہوار یعنی بارہ روپیہ سالانہ متوسط طبقہ والوں سے آٹھ آنہ ماہوار یا چھ روپیہ سالانہ ادنیٰ طبقہ سے ۴ر ماہوار یا تین روپے سالانہ اور درمیانی سال میں اگر کوئی مر جاتا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔ پھر جزیہ کے علاوہ غیر مسلم رعایا کو

فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا، ہدایہ میں ہے۔

لانه وجب نصرة للمقاتلة

کیونکہ جزیہ اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ جنگ کرنے والوں کی باشندوں کی طرف سے امداد ہو۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں،

ای خلفا عن نصرة مقاتلة اهل الدار (لانه من هو من اهل دار الاسلام علیه نصرتهم وقد فاتت.

یعنی اسلامی قلمرو میں جو جماعت جنگی خدمات انجام دیتی ہے ان کی امداد کا کام (چونکہ غیر مسلم لوگوں سے نہیں لیا جاتا تھا) اس لئے اس کے قائم مقام جزیہ کا وصول ان پر عائد کیا گیا کیونکہ جو بھی اسلامی قلمرو کا باشندہ ہے اس پر واجب تھا کہ جنگ کرنے والوں کی امداد کرے اور یہ بات چونکہ ذمیوں کے حق میں باقی نہ رہی اس لئے اس کے بجائے جنگی امداد کے جزیہ لیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الخراج (یعنی جزیہ اور غیر مسلم رعایا کی زمین کی آمدنی خواہ اس زمین کو مسلمانوں ہی نے کیوں نہ خرید لیا ہو) یہ حکومت کی آمدنی کی ایک علیحدہ مستقل مد تھی اور اس کے مالک نہ خلفاء تھے نہ سلاطین نہ مسلمانوں کا کوئی خاص طبقہ بلکہ جیسا کہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں

الخراج فیء لجمیع المسلمین۔ (کتاب الخراج ۲۶)

خراج تمام مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف کی کوئی ذاتی کتاب نہیں ہے بلکہ خلیفہ ہارون الرشید نے جو دستور حکومت اپنے لئے ان سے لکھوایا تھا یہ وہی کتاب ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے کم از کم خلفاء بنی عباس تک وہ مسلم تھا اور حکومت میں اس کی حیثیت قانون کی تھی۔

بہر حال خراج سارے مسلمانوں کا مال تھا البتہ خلفاء اس کی آمدنی کے نگران تھے اور اپنے صوابدید پر جس کے وہ خدا کے پاس ذمہ دار تھے خرچ کرنے کا اقتدار رکھتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جیسا کہہ چکا ہوں خراجی آمدنی تھوڑی تھی اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو ہر سال اس خراج کے تقسیم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی بلکہ

---

[1] فتح کے بعد جن ممالک کی غیر مسلم رعایا کا قبضہ ان کی زمینوں پر بحال رکھا گیا ہو خواہ لڑائی سے ملک فتح ہوا ہو یا صلح و آشتی سے اس ملک کے لوگوں نے مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر لی ہو، ان زمینوں کے مالک وہی غیر مسلم لوگ رہتے ہیں۔ حکومت کو صرف خراج لینے کا حق ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں میں کوئی ان سے زمین خریدے تو یوں وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے لیکن اس کو بھی وہی خراج ادا کرنا پڑے گا۔ حضرت حسنؓ، حسینؓ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے خراجی زمینیں خریدی تھیں لیکن ان کو بھی خراج ادا کرنا پڑا ۱۲

جب کہیں سے خراج آگیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صوابدید سے مسلمانوں میں اس کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اس تقسیم میں غریب امیر معذور و غیر معذور سے بحث نہ ہوتی تھی بلکہ استحقاق کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی تھا۔

عہد نبوی میں خراج کی سب سے بڑی آمدنی (ایک لاکھ درہم) بحرین سے آئی تھی اب تک کوئی باضابطہ خزانہ کا مکان بھی نہ تھا مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مال ڈال دیا گیا نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صوابدید سے لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تقسیم فرما دیا اور

فما قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وثم منہا درھم (بخاری)

اور نہ کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے اس وقت تک جب تک وہاں ایک درہم بھی باقی رہ گیا ہو۔

اس تقسیم میں امیر و غریب کی خصوصیت نہ تھی حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کو بھی اس میں حصہ ملا تھا۔ حالانکہ صدقہ کا مال بنی ہاشم پر حرام ہے۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک دفعہ اس کا شبہ ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آمدنی کی اس مد سے کچھ دیا حضرت عمرؓ نے عرض کیا،

اعطہ من ھو افقر منی

جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو اسے دیجئے۔

انھوں نے خیال کیا کہ شاید یہ غریبوں کا حق ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ،

خذہ فتمولہ فما جاءک من ھذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہ وما لا فلا تتبعہ نفسک۔ (طحاوی)

اسے لو اور اپنا مال بنا لو کیونکہ یہ مال تمہارے پاس اس طریقے سے اگر آئے کہ تمہارے دل میں اس کی لالچ بھی نہ ہو اور نہ اس کے متعلق تم نے سوال کیا ہو تو اسے لے لیا کرو اور جو ایسا نہ ہو تو پیچھے بھی کو اور حرص نہ کرو۔

امام ابو جعفر طحاوی اس روایت کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض یہ تھی،

انی لم اعطک ذلک لانک فقیر انما اعطیتک لمعنی اٰخر غیر الفقر۔

میں نے تم کو یہ اس لئے نہیں دیا ہے کہ تم فقیر اور محتاج ہو بلکہ تم کو یہ کسی اور وجہ سے جو فقیری اور محتاجی کے سوا ہے یہ عطیہ عطا کیا ہے۔

پھر اس جملہ کی شرح یہ کرتے ہیں کہ

لیس ھذا علی اموال الصدقات انما ھذا علی الاموال التی

اس کا شمار صدقات کے مال میں نہیں ہے بلکہ اس کا شمار ان اموال میں ہے

یقسمھا الامام علی الناس فیقسمھا علی اغنیائھم و فقرائھم۔

جنہیں امام لوگوں میں بانٹتا ہے، امیروں کو بھی دیتا ہے اور فقیروں کو بھی۔

طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عہد میں جو عطیہ و وظائف تقسیم فرمایا کرتے تھے وہ بھی اسی مد کی چیز تھی فرماتے ہیں،

کما فرض عمر لاصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین دوّن الدواوین فرض للاغنیاء منھم و للفقراء فکانت تلک الاموال یعطاھا الاغنیاء والناس لا من جھۃ الفقر۔

جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں اسی آمدنی کو اس وقت تقسیم کیا جب دیوان مرتب فرمایا، حضرت عمرؓ نے اس وقت ان کے لئے بھی وظیفہ جاری کیا جو ان میں امیر تھے اور ان کے لئے بھی جو فقیر تھے الغرض یہ ایسی آمدنی تھی جو لوگوں کو اس لئے نہیں دی جاتی تھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہیں۔

بہرحال خراج کی آمدنی چونکہ حق لجمیع المسلمین ہے اس لئے ہر مسلمان کا اس میں حق ہے البتہ یہ امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جب مال ناکافی ہو تو کن مسلمانوں کو پہلے ترجیح دی جائے اس کا فیصلہ ان کی خدمات یا دوسری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر وہ کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ آیا تو آپؓ نے پہلے ان لوگوں کو ترجیح دی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراجی آمدنی سے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور باقی کو،

قسمھا بالسویۃ علی الصغیر والکبیر والحر والمملوک والذکر والانثیٰ (الخراج لابی یوسف)

پھر سب میں برابر بانٹ دیا چھوٹے ہوں یا بڑے، غلام ہوں یا آزاد مرد ہوں یا عورت۔

کہا جاتا ہے کہ فی کس تقریباً سات سات درہم اور کچھ یعنی پونے دو دو روپے کے قریب حصہ پہنچا۔ دوسرے سال خراج کی آمدنی میں فتوحات کی وسعت کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس سال بھی انھوں نے سب کو برابر برابر طریقہ ہی سے بانٹ دیا۔ اب کے بیس بیس درہم یا فی کس تقریباً پانچ پانچ روپے پڑے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس دفعہ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں، آخر جن کے اسلام میں بڑے بڑے کارنامے ہیں ان کے حقوق کا بھی تو لحاظ کرنا چاہیئے۔ فرمایا خدمات اور حقوق کا واقف کار مجھ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے لیکن ان خدمات کا صلہ خدا کے یہاں ملے گا باقی یہ آمدنی،

فھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ

یہ تو دنیاوی زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے اس میں برابر برابر تقسیم اس سے بہتر ہے کہ کسی کو کسی پر ترجیح دی جائے۔

معاشیات میں جو مساوات کے حامی ہیں شاید ان کو خبر نہیں ہے کہ ابھی جو بات سوچی جا رہی ہے کچھ لوگ اسے کر بھی گذرے ہیں لیکن عہد صدیقی کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے مساوات کے اصول کو بدل دیا اور فرمایا کہ

لا اجعل من قاتل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ۔

جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں جنگ کی اور آپ سے لڑے ان کو میں ان لوگوں کے برابر نہیں قرار دے سکتا جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر جنگ کی۔

پھر انھوں نے خدمات و حقوق وغیرہ کے لحاظ سے ایک فہرست مرتب کی جو مشہور ہے۔ بدر میں جو شریک تھے اُن کا سالانہ وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم یا ایک ہزار ڈھائی سو روپے سالانہ جو بدری نہ تھے ان کو چار چار ہزار درہم سالانہ اور اسی طریقہ سے مختلف جہات اور حیثیتوں سے انھوں نے بعضوں کا زیادہ اور بعضوں کا کم وظیفہ مقرر کیا۔ سب سے بڑا حصہ امہات المومنین کا تھا۔ یعنی بارہ بارہ ہزار درہم سالانہ۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کا عطیہ اسامہ ابن زید (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے کم مقرر کیا۔ حضرت عبداللہ نے باپ سے شکایت بھی کی، جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ان ابا اسامة كان احب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ابیک وکان اسامة احب الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم منک۔

اسامہ کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھا اور اسامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے۔

الغرض آنحضرت کی ذات مبارک کو مرکز قرار دے کر جو آپ سے جتنا جس حیثیت سے زیادہ قریب تھا اسی قدر آپ نے اس کو ترجیح دی۔ پھر شہروں میں مدینہ سب سے زیادہ قریب تھا کہ وہی نبی کا مدینہ (شہر) تھا۔ اس لئے اس کو سب پر مقدم کیا گیا۔ مدینہ کے بعد مکہ کی باری آئی۔ آٹھ آٹھ سو درہم سالانہ وہاں کے باشندوں کے نام بھی جاری ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ آمدنی جیسے جیسے بڑھتی جائے گی عطایا کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے گا۔

مثلاً ابتداء میں مدینہ کے صرف بالغ مردوں اور عورتوں کے نام وظائف مقرر ہوئے مگر جب وسعت پیدا ہوئی تو

للمنفوس اذا طرحته امه مائة درهم واذا ترعرع مائتين۔

بچہ کے لئے بھی وظیفہ سو درہم اسی وقت مقرر کر دیا جاتا تھا جو نہی ماں کے پیٹ سے جدا ہوتا اور جب جوان ہو جاتا وظیفہ دو سو درہم کر دیا جاتا تھا۔

اور یہ طرز عمل تو خراج کی اس آمدنی میں اختیار کیا گیا تھا جو روپے کی شکل میں ہوتی تھی چونکہ بعض علاقوں سے غلہ بھی لیا جاتا تھا اس لئے مدینہ والوں کے نام سالانہ غلہ کی مقدار بھی مقرر کر دی گئی یعنی فی کس ساٹھ ہزار دو سو گز مربع زمین کی پیداوار (گیہوں) دی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ ایک دفعہ خراج لائے حضرت عمرؓ نے پوچھا کتنی رقم ہے۔ بولے الف الف اس عدد کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حیرت ہوئی اور فرمایا

هل تدری ما تقول۔

تم سمجھ رہے ہو کیا کہہ رہے ہو۔

ابو موسیٰ نے کہا

نعم قدمت بمائة الف ومائة الف حتی عد عشر مرات۔

جی ہاں میں ایک لاکھ اور ایک لاکھ پھر دس تک اسی کو شمار کرتے گئے اپنے ساتھ لایا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا

ان كنت صادقا ليوتين الراعی نصيبه من هذا المال وهو باليمن ودمه فی وجهه

اگر تم سچے ہو تو اس چرواہے کو بھی اس مال سے حصہ پہنچایا جائے گا جو یمن میں ہوگا اور اس کا پسینہ ابھی چہرے پر ہوگا۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ چند شہروں یعنی مدینہ یا مکہ یا فوجی چھاؤنیوں کوفہ و بصرہ وغیرہ تک اس تقسیم کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہر مسلمان تک اگر پہنچ سکتی تو آپ کا خیال تھا کہ اسے پہنچایا جائے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے خراج کی ساری آمدنی مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس نقطۂ نظر کا افادہ بار بار اپنے خطبوں میں یا یوں اعلان فرماتے،

واللّٰہ الذی لا الہ الا هو ما احد الا وله فی هذا المال حق (الخراج لابی یوسف)

قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جس کا اس آمدنی میں حق نہ ہو۔

یہی بات تو یہی ہے لیکن بعض خاص خصوصیات کی بنا پر پہلے اُن لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے جو اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان ترجیحی خصوصیات کا اظہار بھی آپ نے یوں بایں الفاظ خود فرمایا ہے۔

لكنا على منازلنا من كتاب اللّٰہ عز وجل وقسمنا من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فالرجل وقدمه فی الاسلام والرجل

یعنی قرآن نے جو درجے مقرر کئے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے قرب و بعد کے حساب سے جو حصہ لوگوں کو پہنچ سکتا ہو اس لئے

قدمه في الاسلام والرجل
غناءه في الاسلام والرجل
حاجته في الاسلام.

تقسیم کے باب میں آدمی کو دیکھا جائے گا
اسلام میں اس کی قدامت کیا ہے اسلام
میں اس کی مالی وسعت کا کیا حال ہے
اسلام میں اس کی مالی ضرورت کا حال کیا ہے۔

مطلب وہی تھا کہ قرآن مجید نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ

لا یستوی منکم من انفق
من قبل الفتح وقاتل اولٰئک
اعظم درجة من الذین
انفقوا من بعد وقاتلوا
وکلا وعد الله الحسنیٰ۔

فتح کے پہلے جن لوگوں نے خرچ کیا
اور جنگ کی ان کے برابر وہ نہیں ہو سکتے
جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور
جنگ کی، وہ لوگ درجہ کے حساب سے
زیادہ بڑے ہیں بہ نسبت ان کے
جنہوں نے بعد کو خرچ کیا اور لڑے۔ باقی ہر ایک سے خدا نے اچھی باتوں کا
وعدہ فرمایا ہے۔

یہ فرق مراتب تو ان لوگوں میں تھا جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد اسلام کی راہ میں جانی و مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ پھر جن لوگوں نے یہ قربانیاں کی تھیں اور جنہوں نے نہیں کی تھیں ان میں بھی قرآن نے مدارج قائم کر دیئے تھے یعنی،

لا یستوی القاعدون من
المؤمنین غیر اولی الضرر
والمجاهدون فی سبیل الله
باموالهم وانفسهم فضل
الله المجاهدین باموالهم
وانفسهم علی القاعدین
درجة وکلا وعد الله
الحسنیٰ وفضل الله المجاهدین
علی القاعدین اجراً عظیماً۔

ایمان والوں میں جو لوگ جہاد سے
بیٹھنے والے ہیں بغیر ان کو کچھ عذر اور
دکھ تھا اور پھر بھی جنگ میں شریک
نہ ہوئے) یہ لوگ ان کے برابر نہیں
ہو سکتے جنہوں نے اپنے مال اور اپنی
جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں مالی
جانی جہاد کیا ہے، جہاد کرنے والوں کو
خدا نے جہاد سے بیٹھنے والوں پر فضیلت
عطا کی ہے اور اچھا وعدہ تو خدا کا
سب ہی سے ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر خدا نے بڑے
اجر کے ساتھ فضیلت عطا کی ہے۔

پھر اسی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کی بنا پر بھی قرآن ہی میں،

یا نساء النبی لستن کاحد
من النساء۔

اے نبی کی بیبیو تمہاری حیثیت عام
عورتوں جیسی نہیں ہے۔

وغیرہ آیات میں اس کی جانب اشارہ تھا اور احسان مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سارے فضائل کے قرات کو اخروی قرار دے کر معاشی لحاظ سے سب کو مساوی کر دیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے معاشیاتی استحقاق میں بھی اس کا خیال کیا بہرحال دونوں ہی کے اجتہاد کی گنجائش اسلام میں موجود تھی۔ مگر یہ روایت اگر صحیح ہے کہ آخر عمر میں حضرت عمرؓ

لما رای المال قد کثر

جب انہوں نے دیکھا کہ آمدنی بہت
زیادہ بڑھ گئی ہے۔

تو یہ آرزو ظاہر کی کہ

لئن عشت من هذه الليلة
من قابل لالحقن اخری الناس
باولهم حتی یکونوا فی العطاء
سواء ولکن توفی رحمه الله
قبل ذلک۔
(الخراج لابی یوسف ص ۲۴)

اگر آئندہ سال اسی رات تک میں زندہ
رہا تو پچھلے لوگوں کو پہلے لوگوں کے
ساتھ ملا دوں گا، تا آنکہ وظیفہ میں سب
برابر ہو جائیں (راوی کا بیان ہے کہ)
لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات
اس سے پہلے ہو گئی۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کثرت آمدنی کی شکل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے یعنی اگر آمدنی اتنی ہو کہ سب پر تقسیم کرنے کی صورت میں ناکافی ہو، اس وقت تو ترجیح و تفضیل پر عمل کرنا چاہیے لیکن اگر سب کو کافی ہو سکتی ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مساوات ہی کے قائل تھے۔ گویا ان کا خیال تھا کہ گو کیف ما مسلمانوں کا یہ مال ہر مستحق تک پہنچا دیا جائے۔ آخر جب یمن کے چرواہے تک اس مال کو وہ پہنچانا چاہتے تھے تو اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر مسلمان کو خراج کی آمدنی کا وہ حصہ دینا چاہتے تھے نیز اگر وہ دوسرے سال تک زندہ رہتے تو سب کو برابر حصہ دیتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

سنن بیہقی اور دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ کی ایک اور تقریر کا بھی ذکر ہے، لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا اس لئے حکم دیا کہ یجتمعوا لهذا المال فانظروا لمن ترونه (اس مال (یعنی بیت المال میں جو آمدنی جمع ہوئی ہے) اس کے متعلق طے کریں کہ آخر اس کے مالک کون لوگ ہیں۔ لوگ جب جمع ہو گئے تو کھڑے ہو کر آپ نے تقریر فرمائی۔۔

انی امرتکم ان تجتمعوا لهذا المال
فتنظروا لمن ترونه وانی قد
قرات آیات من کتاب الله
یقول ما افاء الله
علی رسوله الخ

میں نے آپ لوگوں کو اس لئے اکٹھا کیا
ہے تاکہ غور کریں کہ یہ مال کس کا ہے تو میں نے
قرآن کی ان آیتوں کو جو پڑھا ہے یعنی
اللہ نے جن بستیوں والوں کو اپنے
رسول کی طرف پلٹایا ہے الخ

على الآباء فلو لم يعطوا كفايتهم لاحتاجوا الى الاكتساب فلا يتفرغون للقتال.

لازمی ہے کہ مسلمانوں کے بچے اور ذریت ہیں (اس لئے ان کو تنخواہ مسلمانوں کے مال سے ملنی چاہیئے اسی طرح ان کی عورتوں اور بیویوں کو جن کے

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے مصارف باپ پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر ان کی اولاد کو اتنا نہ دیا جائے جو ان کے لئے کافی ہو سکے تو پھر ان کو مزید کمانے کی ضرورت باقی رہ جائے گی اور جنگ کے لئے فارغ البال ہو کر اپنے آپ کو ہمیشہ تیار نہیں رکھ سکتے۔

جب "افق" کا دور نہیں آیا تھا اس وقت حکومت کے ان ملازمین کو کیا ملتا تھا۔ قاضی ابو یوسف راوی ہیں کہ حضرت

بعث عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه عمار بن ياسر على الصلاة والحرب وبعث عبد الله بن مسعود على القضاء وبيت المال وبعث عثمان بن حنيف على مساحة الارضين وجعل بينهم شاة كل يوم شطرها وبطنها لعمار بن ياسر وربعها لعبد الله بن مسعود وربعها لعثمان بن حنيف وقال اني انزلت نفسي واياكم من هذا المال بمنزلة والي اليتيم فان الله تبارك وتعالى قال من كان غنيا فليستعفف ومن كان فقيرا فليأكل بالمعروف.

عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمار بن یاسر کو بھیجا کہ نماز اور جنگ کی نگرانی ان کے سپرد ہے اور عبد اللہ بن مسعود کو قضا (عدالت) اور بیت المال (خزانہ) پر مقرر کر کے بھیجا عثمان بن حنیف کو زمین کی پیمائش کے لئے مقرر کر کے روانہ کیا، ان سب کے لئے روزانہ ایک بکری (کھانے کے لئے مقرر ہوئی) عمار بن یاسر کو آدھی اور چوتھائی اس کا عبد اللہ بن مسعود کے لئے اور چوتھائی عثمان بن حنیف کے لئے اور کہا میں اپنے کو اور تم کو اس مال کے حساب سے ویسا ہی خیال کرتا ہوں جو یتیم کے مال کا حال اس کے ولی کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو امیر ہو وہ یتیم کے مال سے پرہیز کرے اور جو غریب ہو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

ظاہر ہے کہ یہ عطا (وظیفہ بیت المال) کے سوا ان بزرگوں کا یومیہ (راشن) تھا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ان تینوں محکموں کے اعلیٰ ترین افسروں کے راشن میں بھی کل ایک بکری روزانہ اور ہاں یہ بھی حضرت عمرؓ کا یہ زمانہ،

ما ارى ارضا يؤخذ منها شاة في كل يوم الا استسرع خرابها.

ایسی زمین (ملک) جس میں روزانہ ایک بکری (طعام) کے لئے لی جاتی ہو میں نہیں خیال کرتا کہ اس کی بربادی جلد کیوں نہ آئے۔

بلکہ اسی سے حضرت عمرؓ کے طریقہ

فكان عمر يرزق العامل بحسب حاجته وبلده. (الاسلام والحضارة العربية ص ۱۳۱)

حضرت عمرؓ اپنے عامل (ملازم حکومت) کی تنخواہ اس کی حاجت اور جس شہر میں رہتا ہو اس کے حساب سے دیا کرتے تھے۔

کی شرح ہو سکتی ہے۔

اور یہی تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ اعظم تک کے لئے یہ طے کر دیا تھا کہ بیت المال میں ان کا حق بس،

قوته وقوت عياله لا وكس ولا شطط وكسوته وكسوة عياله للشتاء والصيف ودابتان الى جهاده وحوائجه وصلاته وحجه وعمرته. (الاسلام والحضارة العربية)

ان کی خوراک اور ان کے بال بچوں کی خوراک نہ زیادہ نہ کم، پہننے کا لباس جاڑے اور گرمی کے لئے، دو سواری کے جانور جہاد اور حاجتوں کے لئے نماز اور حج وغیرہ کے لئے (بس کرتا ہے)

سے زیادہ نہیں ہے تو اس کی ماتحت قوتوں تک یہ رسد۔ ایک دلچسپ واقعہ اسی سلسلہ میں قابل ذکر ہے جسے مشہور راوی حدیث حضرت سعید المقبری خود اپنے متعلق بیان کرتے تھے کہتے ہیں کہ میں پہلے بنی جندع جو مدینہ میں ایک خاندان تھا، اسی خاندان کے ایک آدمی کا غلام تھا، میرے اور میرے آقا کے درمیان طے ہوا کہ اگر چالیس ہزار درم اور ہر بقر عید کے موقع پر ایک بکرا دینے کا وعدہ کروں تو مجھے وہ آزاد کر دیں گے، سعید کہتے ہیں کہ یہ رقم جمع ہو گئی یعنی چالیس ہزار درم کیا کر انھوں نے اکٹھے کئے اور اپنے آقا کو کہا کہ لیجئے رقم حاضر ہے آزادی کا سرخط عطا ہو، اس شخص نے کہا کہ میں ایک دفعہ سب رقم نہیں لوں گا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے قسط وار لوں گا۔ سعید کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں چلا گیا جو اس وقت خلیفہ تھے، حال عرض کیا، آپ نے اپنے غلام یرفا کو آواز دی کہ سعید کی رقم کو خزانہ میں جمع کر دو اور سعید سے فرمایا کہ پیچھے پھر آنا، میں تمہارے آقا کو بلاتا ہوں، اگر یکمشت رقم لینے پر وہ تیار ہو گیا تو خیر ورنہ میں خود تم کو آزادی کا سرخط لکھ دوں گا۔ سعید نے جب حکم خزانہ میں چالیس ہزار کی رقم جمع کرا دی، سعید کے آقا کو خبر ہوئی تو خود دوڑے ہوئے آئے اور اپنی

رقم اٹھالی اور مجھے آزاد کر دیا۔ سعید فرماتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا آپ نے فرمایا کہ ہمارے خزانے سے تم نے کچھ لیا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں ابھی تو مجھے کچھ نہیں ملا ہے، تب آپ نے فرمایا کہ

فارجع به حتی نلحق منا شیئا ثم اتنا بعد۔
(ابن سعد ص ۲۶۱ ج ۵)

تو ابھی واپس لے جاؤ اپنی زکوٰۃ کی رقم، پھر جب ہمارے خزانے سے تمہیں مل چکے تب اسے لے کر آنا۔

اس سے بیت المال کی فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے ابھی بیت المال سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے بیت المال بھی اس سے مستفید ہونا نہیں چاہتا تھا۔

زائد محصول کے عائد کرنے کا حکومت کو اختیار

ایسی صورت میں اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ ہر مسلمان کو بیت المال سے وظائف برابر برابر مساوی مقدار میں تقسیم کروں گا تو کیا تعجب ہے خصوصاً جب ہمارے فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عام مصالح یا مشترکہ ضرورتوں کے لئے حکومت باشندوں پر حسب صوابدید تازہ ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے جسے اصطلاحاً النوائب کہتے ہیں۔ النوائب کی تعریف ہدایہ باب الکفالہ میں یہ کی گئی ہے۔

ما یکون بحق لکری النھر المشترک واجرۃ الحارس للمحلۃ والموظف لتجھیز الجیش وفداء الاساری۔

یعنی جو محصول (واقعی ضرورت کے لئے) عائد کیا جائے، مثلاً نہر کھودنے کے لئے جو عام مشترک ضروریات کے لئے ہو پہرہ دینے والوں کی تنخواہ کے لئے جو محلہ کی حفاظت کرتے ہوں اور وہ محصول جو فوج کی تیاری کے لئے عائد کیا جائے یا قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کے لئے حکومت کو ضرورت ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت پڑ جائے تو اس وقت حکومت باشندوں پر جدید ٹیکس خواہ ایک دفعہ وصول کیا جائے یا قسطوں پر تقسیم کر دیا جائے عائد کر سکتی ہے اور عام پبلک پر اس قسم کے محصول کا ادا کرنا واجب ہے جس کی وجہ ابن ہمام نے یہ لکھی ہے کہ

لانھا واجبۃ علی کل مسلم موسر بایجاب طاعۃ اولی الامر فیما فیہ مصلحۃ المسلمین
(ص ۳۲۲)

ہر مستطیع مسلمان پر اس محصول کا ادا کرنا اس لئے واجب ہے کہ اولو الامر کی اطاعت ان امور میں بھی ضروری ہے جن میں مسلمانوں کی بھلائی ہو۔

غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ حکومت کے ہر مطالبہ کی ادائیگی کو فقہاء واجب نہیں کہتے بلکہ یہ وجوب ان ہی مطالبوں تک محدود ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی عام واقعی ضرورتوں اور ملک کے ضروری مصالح سے ہوں ورنہ ہدایہ اور اس کی شرح میں اس کے بعد تصریح کر دی گئی ہے کہ حکومت کے ایسے مطالبات جو

لیس بحق کالجبایات فی زماننا ببلاد فارس علی الخیاط والصباغ وغیرھم للسلطان فی کل یوم او الشھر او ثلاثۃ اشھر فانھا ظلم

حق نہ ہوں، مثلاً جو محصول ہمارے زمانے میں فارسی ممالک میں درزیوں اور رنگ ریزوں وغیرہ پر بادشاہ کی طرف سے ہر روز یا ہر مہینہ یا ہر تین مہینے میں وصول کئے جاتے ہیں تو ان کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ظلم ہے۔

شمس الائمہ سے ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ ایسے مطالبات کا نہ ادا کرنا واجب ہے ان کے الفاظ یہ ہیں،

اما فی زماننا اکثر النوائب تؤخذ ظلما ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فھو خیر لہ۔
(فتح القدیر ص ۳۳۳ ج ۵)

ہمارے زمانے میں عموماً جو محصول وصول کئے جاتے ہیں چونکہ بے تکلف وصول کئے جاتے ہیں اور ظلم کے ازالہ کی جس کو قدرت ہو تو اس کے لئے بہتر ہے

یہ تو ایک ضمنی بات آگئی میں یہ کہہ رہا تھا کہ خراج اور خراج کے مصارف بجز اس نقطۂ نظر کے کہ وہ حکومت کی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اسی لئے مسلمانوں کی عام ضرورتوں سے جب بچ جائے تو قدرتاً بچی ہوئی رقم کو ان ہی میں بانٹ دی جائے اس کے سوا اور کوئی اہم خصوصیت حکومت کی اس آمد کی نہیں ہے یا جی چاہے تو پیداوار کے نصف سے خراج کا تجاوز نہ ہونا وصول کرنے میں نرمی اختیار کرنا سیلاب یا خشکی یا کسی دوسری وجہ سے اگر فصل خراب ہو جائے تو خراج کا کم کر دینا یا معاف کر دینا ان باتوں کا بھی اسلامی خراج کے خصوصیات میں کوئی چاہے تو اضافہ کر سکتا ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ زبان سے تو آج تقریباً دنیا کی اکثر حکومتیں اس کی بلکہ اس سے کہیں زیادہ کا دعویٰ کی مدعی ہیں۔ پھر ایسی باتوں کے ذکر میں وقت کیوں ضائع کیا جائے یا ان معاملات میں دنیا اگر اسلامی اصلاحات کی احسان شناسی سے انکار کرنا چاہتی ہے تو اب ان سے خواہ مخواہ لڑنے کی کیا حاجت ہے۔ روم اور ایران کی حکومتوں کا کسانوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اور اسلام نے اس میں کیا ترمیم کی ایک طویل مقالہ کا مضمون ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسی حق پوش ہستی جسے اسلام کی ہر بڑی بات کو چھوٹی ثابت کرنے میں مخصوصانہ کمال حاصل ہے اس کا قلم بھی زمین کے خراج کے متعلق نہیں بلکہ اسلامی خراج کے مشہور بنام دوسرے جزیہ یعنی جزیہ ٹیکس کے متعلق اضطراراً اس اعتراف پر مجبور ہوا۔

والجزیۃ التی کانوا یکلفون دفعھا الی المسلمین اقل کثیر من مجموع الضرائب التی کانوا یودونھا الی الروم

مسلمانوں کو جزیہ کے نام سے جو رقم (رومی ایرانی رعایا) کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان محصولوں کی مجموعی مقدار سے وہ بہت ہی کم تھی جو یہ لوگ روم

ابوالفرنس (تاریخ التمدن الاسلامی ص ...) اور ایطالی کی حکومت کو ادا کیا کرتے تھے۔

بہر حال حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے موجودہ زمانے تک اس کے اغراض اس سے زیادہ نہیں بڑھے ہیں کہ ملک کے باشندوں کی مشترکہ اور عام ضرورتوں یا مصالح کے لئے اس آمدنی کے ایک حصہ کو مخصوص کرنا چاہیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ خراجی آمدنی کا ایک بڑا مصرف اسلام نے بھی یہی مقرر کیا ہے۔ پہلے بھی اس کے متعلق ہدایہ سے ایک عبارت پیش کی جا چکی ہے۔ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ جو مصارف خراج کے ہیں اسی طرح،

كذا الجزية في عمارة القناطر	اسی طرح جزیہ کی آمدنی پلوں اور
والجسور وسد الثغور	گذرگاہوں کی تعمیر اور سرحدوں
وكرى الأنهار العظام التي	کے استحکام اور بڑی بڑی نہریں جو
لا ملك لأحد فيها كجيحون	کسی کی ملک میں نہیں ہیں مثلاً جیحون
والفرات ودجلة وإلى الرزق	فرات دجلہ سے نہر کھودنے قاضیوں
القضاة والمحتسبين والمعلمين	کی تنخواہوں، معلموں اور فوجیوں کی تنخواہ
والمقاتلة وحفظ الطريق	راستے کی حفاظت چوروں سے وغیرہ وغیرہ
من اللصوص (باب الجزیہ ص ۴۳۰)	مصارف میں یہ آمدنی خرچ ہوگی۔

گویا مواصلات (پل سڑک) محکمہ آبپاشی عدالت پولیس تعلیمات وغیرہ اور فوجی شعبوں پر ان کو خرچ ہونا چاہئے اور عام طور پر دنیا کی مہذب حکومتیں یہی کرتی ہیں البتہ جو رقم اس مد کے خزانے میں بچ جائے اس کو پھر اس کے حقیقی مالک کو یعنی عام مسلمانوں میں امام اپنے صوابدید سے تقسیم کر دے بس یہی ایک بات اسلام میں نئی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ملک کی ایک اور بڑی ضرورت ہے جس سے کسی حال میں بھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی معذوروں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں کا مسئلہ جس کے حل کے لئے آج دنیا مختلف تشکیلیں بیمہ، انشورنس، انجمن ہائے امداد باہمی وغیرہ کی صورتیں اختیار کر رہی ہے اور حکومتیں بھی کچھ ان کے ساتھ نیم دلچسپی لے رہی ہیں۔ لیکن ابھی باضابطہ اس مسئلہ کو کسی حکومت نے براہ راست ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی ہے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اس سلسلہ کو چھیڑا گیا تو حکومت کی موجودہ آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اور محصولات کے بڑھانے میں ملک کی عام ناراضی کا خطرہ ہے۔ لیکن اسلام نے ٹھیک اسی وقت جس وقت پہلی آمدنی نئی حکومت اس کے خزانے میں آئی اسی مسئلہ کو سب سے پہلے اس نے اپنے سامنے رکھا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بدر کی فتح سے غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) کی صورت میں جو پہلی آمدنی ہاتھ آئی اس پہلی آمدنی کے تین حصوں کو ملک کے اسی طبقے کے لئے مخصوص کر دیا گیا جن کے مسئلہ کو باوجود شدید احساس کے اس وقت تک حکومتیں اپنے ہاتھ میں لینے سے گھبرا رہی ہیں۔ مگر قرآن میں اس وقت جو آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی وہ مجمل تھی یعنی الیتامی والمساکین وابن السبیل صرف ان تین قسم کے

لوگوں کا نام تھا لیکن جوں ہی اسلام کا قدم آگے بڑھنے لگا اور حکومتی اقتدار میں دن بدن اضافہ شروع ہوا تو قرآن مجید میں حکومت کے ذریعہ سے اس حاصل شدہ اقتدار و قوت کے استعمال کا مسلمانوں کو ایک ایسے طریقہ سے روشناس کیا گیا جس سے غالباً اس وقت تک دنیا کی حکومتیں نا واقف تھیں اور اب تک ان میں سے کسی کو حکومت کی قوت کو اس راہ میں استعمال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ گو ملک کے غرباء، فقراء، معذوروں کا مسئلہ اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا لیکن ابتداء میں (خمس غنیمت) یعنی غنیمت کے پانچویں حصہ سے جو حصہ ان لوگوں کے لئے مختص کیا گیا تھا اس وقت اجمالاً صرف اس گروہ کے تین ہی طبقے کا تعدد تھی لیکن اب قرآن میں باضابطہ ملک کے ان معاشی حاجتمندوں کی ایک تفصیلی فہرست[1] نازل ہوئی جس کا دائرہ علاوہ ان تین جماعتوں کے چند ایسے جہات کو بھی شامل تھا جن کی طرف شاذ و نادر حاجت مندوں کے لحاظ سے بھی لوگوں کا اکثر ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن میں معاشی جد و جہد کی قوت ہی گویا ساکن یا دبی ہوئی ہو مثلاً جو یتیموں کا حال ہے کہ معاش حاصل کرنے کے لئے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے ابھی ان کا نشو و نما بھی ان میں کما حقہ پورے طور پر نہیں پاتا اور جس طاقت کے وہ زیر پرورش تھے اس سے بھی وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جد و جہد کی صلاحیت ساکن ہو گئی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ حصول معاش کی قوتیں جن کی متحرک نہ رہی ہوں۔ اب خواہ یہ سکون اس لئے ہو کہ ابھی ان کی حرکت کا وقت نہیں آیا یا متحرک ہو کر ساکن ہو گئی ہوں۔ بہر حال ان سب پر "المسکین" کا لفظ بولا جاتا ہے جو سکون سے ماخوذ ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی انتہائی سکون کی حالت میں جس کی معاشی قوتیں ہوں، المسکین کے ذیل میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں،

من السکون کان العجز	مسکین کا لفظ "سکون" سے ماخوذ ہے
اسکنه.	گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عجز و بیچارگی

نے اس کو ٹھنڈا اور غیر متحرک ساکن بنا دیا۔

یا حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود ہو گئے ہوں۔ لیکن کچھ حالات اتفاق کے شکار ہو کر

---

[1] آگے جو کچھ بیان کیا جائے گا دراصل وہ قرآن کی مشہور آیت صدقہ کی تفسیر ہوگی۔ یعنی انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل (توبہ) یہ ہے کہ یہ الصدقات کا مصرف کردہ فقراء و مساکین کو دیا جائے اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو [illegible] (غلاموں کے آزاد کرانے میں) اور قرضداروں (تاوان زدہ) لوگوں پر اور اللہ کی راہ میں اور مسافر پر ہے اس کا فلسفہ اسلامی نظام مصارف زکوٰۃ و صدقات ہے آئندہ اسی آیت کی تفصیل کی گئی ہے لیکن بیان میں ترتیب وہ نہیں ہے جو قرآن میں آپ پا رہے ہیں ۱۲

[2] یہ فہرست یہی آیت ہے ۱۲

معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں۔ مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج و معالجہ میں
کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا بیوپار کھیتی میں اسے نقصان پہنچا ہو یا اسی قسم کے دوسرے
حوادث کے جو شکار ہو گئے ہوں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں کا حال تھا جو
مہاجرین کے نام سے موسوم ہیں کہ گھربار جائداد چھوڑنے پر ان کو مکہ کے حالات نے مجبور
کیا اور مدینہ منورہ میں آکر انھوں نے پناہ لی۔ حوادث روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے والے ناداروں کو
اضطرار کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید میں "مہاجرین" کے ساتھ فقراء کی صفت کا استعمال کیا گیا ہے
حالانکہ حصول معاش کے لئے جن جسمانی و عقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں
خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکروں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری
کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ
زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتوں کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے دوسروں کو حیرت
ہوتی ہے کہ ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے چاق چوبند ہوتے ہوئے پڑھے لکھے والوں کا گروہ آخر
معاشی پریشانیوں میں کیوں مبتلا ہے کہ معمولی ان پڑھ جاہلوں سے زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لئے
پیچیدہ بنا ہوا ہے مجھے اس وقت تعلیم یافتوں کے اس قابل رحم گروہ سے بحث نہیں اور نہ اس سے کہ
ان کی شکایت بجا ہے یا بیجا۔ بلکہ صرف ایک واقعہ کو بتانا ہے کہ باوجود سب کچھ ہوتے اور سب کچھ
رکھنے کے معاشی ذرائع ان پر بند ہیں۔ یہ سب کا مشاہدہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ بظاہر حالات
کسی کے کیسے کچھ ہی ہوں۔ لیکن اس کے واقعی حال کا وہ کوئی صحیح معیار نہیں ہو سکتا۔ حضرت
اکبر مرحوم کا شعر اس موقعہ پر یاد آتا ہے فرماتے ہیں ؎

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

اسی لئے اسلام نے جہاں ایک طرف مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام قرار دیا
جب تک بالکل مخمصہ اور اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم
دیا گیا ہے جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
للسائل حق وان جاء علی فرس	کہ مانگنے والے کا حق ہے خواہ گھوڑے
(بیہقی فی سنن)[1]	ہی پر کیوں مانگنے نہ آیا ہو۔

کیا معلوم کہ گھوڑے سوار کی حالت کیا ہے اور وہ بیچارہ کس حال میں مبتلا ہے جب کہ اس زمانے کے
زیادہ تر سائیکل سواروں کے حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس فہرست
میں قرآن نے پہلے تو "الفقراء والمساکین" کا ذکر کیا اور دونوں الفاظ ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو
مندرجہ بالا صفات سے موصوف ہوں۔ جریر بن عباس فاتح مصر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے ان

الفاظ کی تفسیر میں بطور مثال کے ان چند طبقات،

العمیان والعرجان والکمسان (؟)	اندھے لنگڑے اپاہج اور قیدیوں۔

کا ذکر کرکے فرمایا

کل منقطع به۔	ہر وہ شخص (جو وجہ معاش) سے چھڑا ہو گیا ہو۔

اور واقعہ یہ ہے کہ حاجتمندوں کے ان طبقات پر قریب قریب ہر قوم کی نظر پڑتی ہے۔ ہر قوم اور ملک کے
ارباب ثروت و حیثیت ان کی امداد کو ایک اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں۔ اگرچہ حکومتوں نے اپنی
آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے۔ لیکن یوں بے قاعدہ طور پر غیر منظم شکلوں میں مختلف
تقریبات کے سلسلہ میں یا یوں بھی ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا ہے۔ خوشی اور مسرت
کے مواقع میں اندھوں لنگڑوں غریبوں کو جمع کرکے کھانا کھلا دیا جاتا ہے یا کچھ پیسے بانٹ دیئے
جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی نظر اس سے بھی آگے پہنچی۔ آج ابراہیم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد
کرانے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کے راجواڑوں نے غلاموں کے آزاد
کرنے کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب ترکوں اور عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلہ
میں ان کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضا مند نہ
ہوں گے بحری اور بری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام اور لونڈی بنانے کے طریقہ کو
مسلمان نہ چھوڑیں گے۔ آخر اس پر اتفاق ہوا۔ مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا شیخ الاسلام نے
محض احق بمکارم الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام میں لبیک کہا خلیفہ کے دستخط ہو گئے۔ کیونکہ
ظاہر ہے غلام بنانا اسلام میں نہ فرض تھا نہ واجب نہ سنت نہ مستحب بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی مجبوری کی

---

[1] سنن بیہقی ص ۔۔ ج ۔۔ کتاب الصدقات ۱۲

[2] واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑی جنگ میں قیدیوں کی ہزاروں بلکہ لاکھوں تعداد گرفتار رہتی ہے [illegible]
[illegible]

بناء پر قیدیوں کے قتل کرنے سے ان کو غلام بنا لینا نسبتاً آسان خیال کیا جاتا۔ البتہ چونکہ غلام ہمیشہ دشمن قوموں کے افراد ہوتے تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ شاذ ہی کیا جاتا تھا جس کی داستان درد سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس جنگی صورت کی بناء پر اسلام نے بھی دیکھا کہ جب دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کو غلام بنا لیتی ہیں تو اس نے بھی دشمن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیتے ہوئے اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک ان کو غلام بنا کر رکھا جائے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے اور جب امن کا زمانہ آ جائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں کہ بیسیوں شکلیں قانونی اور مذہبی۔ مثلاً کفارات وغیرہ کے ذرائع سے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بڑی اہم مد "فک رقبۃ" (غلام کا آزاد کرنا) بھی قرار دیا۔ پھر معاوضے کر کے بھی غلاموں کے آزاد کرنے کی ایک صورت جو عرب میں جاری تھی یعنی کتابت اس کی بھی اسلام نے بہت افزائی کی اور عام مسلمانوں کو ان مکاتب غلاموں کی امداد پر ابھارا۔ خیر یہ سب تو غلامی کی راہ میں اسلام کی غیر متعین کوششیں ہیں لیکن آخر میں تو وہ یہ بھی کر گذرا کہ جس فہرست میں اس نے "الفقراء والمساکین" کو رکھا تھا بانا بطہ اسی فہرست میں "فی الرقاب" کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ "الرقاب" کے نیچے ایسے غلام داخل ہیں جن کے آقاؤں نے معاوضے کر ان کے آزاد کرنے کا معاہدہ کیا ہو۔ اور جس وقت قرآن میں یہ فہرست نازل ہوئی اس وقت نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں آبادکاروں کے ساتھ انسانوں کا یہ گروہ بہ تعداد کثیر پایا جاتا تھا جن کے مالکوں نے کہہ رکھا تھا کہ اتنی رقم اگر تم ادا کر دو تو تمہاری گلو خلاصی ہو جائے گی مگر ان بیکسوں کے مددگار بہت کم تھے تا آنکہ اسلامی حکومت نے ان کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بہر حال "الرقاب" کا لفظ اگرچہ ہر قسم کے غلاموں کے لئے عام ہے۔ لیکن عموماً فقہاء امت نے "مکاتب" والی قسم ہی مراد لی ہے مگر امام مالک کا خیال ہے کہ

انھا من قاب یشاءون — "الرقاب" سے وہ غلام مراد ہیں جنہیں
من الزکوٰۃ فیعتقون۔ — الزکوٰۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور
اس کے بعد آزاد کئے جاتے ہیں۔

گویا غیر مکاتب "غلام" بھی اس کے نیچے داخل ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف مکاتب غلاموں کے مسئلہ کو نہیں بلکہ اس عہد کے اس پورے طبقہ کو جو "غلام" طبقہ خیال کیا جاتا تھا قرآن نے اپنی اس مہم میں داخل کر لیا ہے اور اس وقت داخل کیا جب یورپ کی حکومتیں غلاموں کو بیسیوں سے پچھڑوا کر اور ان کی جھاڑیوں کو ٹھا کر تڑپتی ہوئی لاشوں سے اپنی دعوتوں کی رونق بڑھاتے تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ اخلاق یورپ اڈورڈ ہارٹ لیکی)

خیر اس وقت نہیں بلکہ کسی ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے یا واقعی انسانی ہمدردی کے تحت غلاموں کی طرف حکومتوں کی توجہ مبذول ضرور ہوئی لیکن ہر ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی

بدتر حال میں ایک اور طبقہ رہتا ہے یہ اس لئے زیادہ قابل رحم ہے کہ اوروں کے ساتھ حکومت نہیں عوام انفرادی طور پر حسن سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اب انسانیت کے جس طبقہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ وہ بیکس مرحوم طبقہ ہے جس کو کسی زمانہ میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں ٹھیرایا گیا اور نہ ان کے ساتھ نیکی کرنی نیکی سمجھی گئی۔ میری مراد مقروضوں سے ہے۔ یہ دنیا کا وہ مظلوم گروہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک تو بڑی بات ہے اس وقت تک دنیا کی حکومتوں نے ان کے ستانے والوں اور ان پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے والوں کی صرف زبانی نہیں بلکہ قانونی امداد و اعانت کو اپنا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ یہ حکومت کی فوجی اور عسکری قوت اس لئے تیار رہتی ہے کہ مقروضوں کے ذمہ قرض خواہوں کا جو دین اور مطالبہ ہے صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرا دیا جائے خواہ اس راہ میں اس کی ساری جائداد گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ نیلام ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے اور تمدن و تہذیب کی ترقی اور روشنیوں میں یہ اندھیر کھلا اور دم چھائے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا فہرست کی کہ تمام مدوں کے ساتھ دنیا کی حکومتوں نے اب تک کسی باضابطہ نیکی کا ارادہ نہیں کیا لیکن باضابطہ ظلم بھی ان حکومتوں نے روا نہ رکھا تھا۔ الا ایک یہ بیچارہ مقروضوں کا طبقہ ہے کہ خدا جانے کن مشکلات میں مبتلا ہو کر وہ قرض کے بوجھ کو لادنے پر آمادہ ہوتا ہے اور پھر ان مشکلات سے نکلنے کیلئے کوششیں ہوتا ہے سود در سود کی زنجیروں میں بندھا اس کو جکڑ کر چلا جاتا ہے اور حکومتوں کے سامنے سوار و پیادے توپ اور بندوق سے ہر زنجیر کے بچاتے ہیں اس کے معاون و مددگار بنے ہوئے ہیں۔ حکومت پبلک کے لئے ہے بلکہ پبلک ہی کے لئے ہے اس دعوی کے دعویوں کا پبلک ہی کے ایک طبقہ کے ساتھ یہ طرز عمل قابل غور ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے قرآن نے قرض کو دنیاوی کاروبار یا معاملہ کی حد سے نکال کر ایک قربانی اس کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا اور بجائے مقروض کے قرض دینے والے کے سامنے خدا نے خود اپنا ہاتھ پیش کیا جس سے اس نیکی کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ بالآخر اسی فہرست میں "الغارمین" کے لفظ کے ساتھ ملک کے قرضدار طبقہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اکثر کا اتفاق ہے کہ "الغارمین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مقروض ہوں یا زراعت و تجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں ان کو نقصان پہنچ گیا ہو۔ بیت المال میں ایک مد ہر سال الغارمین کی بھی رکھی جاتی تھی، خصوصاً مقروضوں کے متعلق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے زمانے ہی میں یہ اعلان فرما دیا تھا

من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک — جو کوئی مرنے کے بعد مال چھوڑ کر مرے وہ اس کے

كلاً فالينا . (البخاری)

(وارثوں کا حق ہے۔ لیکن کوئی بوجھ (قرض وغیرہ) کا چھوڑ کر مرا ہو تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے (مراد حکومت پر ہے)

صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دوسری روایت یہ بھی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من حمل من امتي دينا ثم جهد في قضائه فمات قبل ان يقضيه فانا وليه
(البیہقی فی سنن ص ۲۲ ج ۶)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے کسی آدمی پر اگر قرض چڑھ جائے اور وہ اس قرض کے ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن ادا کرنے سے پہلے مر گیا۔ تو اس قرض کا ذمہ دار میں ہوں (یعنی میں ادا کروں گا)

ان چند اہم مدات کے علاوہ ہر شہر اور ہر آبادی میں ایک اور واقعہ بھی پیش آتا ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب مواصلات کے ذرائع اتنے وسیع اور سہل نہ تھے۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو مختلف کاروبار کے سلسلے میں اپنے ملک یا شہر یا گاؤں سے پردیس جاتے ہیں ان لوگوں میں بسا اوقات مختلف حالات کے تحت کبھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ وطن میں خواہ کتنے ہی بڑے امیر ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن پردیس میں وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چونکہ پردیسی ہوتے ہیں اس لئے کسی سے نہ ان کی جان ہوتی ہے نہ پہچان، ایسی صورت میں ان کی حالت نہایت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ یوں تو پہلے زمانہ میں لوگ ایسے پردیسیوں کے ساتھ انفرادی طور پر اچھا سلوک کرتے تھے۔ خصوصاً بعض قوموں میں اس نیکی اور ہمدردی کا خاص ذوق تھا۔ جن میں عرب کا بھی نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے لیکن جن اقوام و ممالک میں ذات پات یا قومیت و وطنیت کا مرض شدت پذیر ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں تو اس غریب مسافر کی سخت درگت بنتی ہے۔ بھلا جہاں اپنے ملک اپنے وطن اپنی نسل اپنے رنگ کے سوا ہر دوسرے آدمی کو بجائے آدمی کے کسی جانور کا ہم خیال کیا جاتا ہو، وہاں کے باشندوں سے کوئی پردیسی کیا توقع رکھ سکتا ہے اور یہ مرض گو موجودہ مغربی تمدن کی راہ سے بہت عام اور مہلک ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قومیں اس کا شکار رہی ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک ہندوستان ہی کی حالت پہلے کیا تھی بلکہ اب بھی یہی ہے کہ اس ملک کے بعض طبقے اپنے سوا دوسروں کو کتوں سے بھی زیادہ ناپاک قرار دیتے ہیں جن بستیوں اور گاؤں میں صرف اس قوم کے لوگ آباد ہیں اب بھی جا کر جس کا جی چاہے تجربہ کر سکتا ہے کہ مسافر کی

گاؤں میں شام ہو جاتی ہے کسی درخت کے نیچے بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے لیکن گاؤں والوں میں کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ ایک لوٹا پانی یا ایک لقمہ کھانے سے اس کی تواضع کریں۔ بہر حال انسانی برادری کا یہ طبقہ بھی ہر ملک اور ہر قوم میں قابل توجہ تھا۔ اسی لئے قرآن کی فہرست میں "ابن السبیل" (راہ والے) یعنی مسافر کے نام سے ان کا بھی اضافہ کیا گیا اور اسلامی حکومت نے ان کی خبرگیری و پرسش کو بھی حکومت کا ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔

الحاصل خراج و جزیہ وغیرہ کی آمدنی تو کشوری و فوجی مزدوروں اور رفاہیات عامہ کے لئے تھی لیکن جب اسلام نے انسانیت کے مصالح عامہ اور ضروریات مشترکہ کے ساتھ بنی آدم کے ان قابل رحم طبقات یعنی "الفقراء والمساکین والغارمین وابن السبیل" کے معاشی مشکلات کے مسئلہ کو بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور اسلامی حکومت کے بجٹ (موازنہ) میں مصارف کی فہرست میں ان کا بھی اضافہ کیا تو ظاہر ہے کہ مصارف کی پابجائی کس مد سے ہوگی۔ اس کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہئے تھا سو ہوا۔

مگر جب حال یہ ہے کہ دنیا کی حکومتوں کی آمدنیاں فوجی اور کشوری (سول) اور فوری مزدوروں کے لئے بھی بسا اوقات ناکافی ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ مصالح عامہ کی مد کا اضافہ جب سے حکومتوں نے اپنے مصارف میں کیا ہے۔ اس وقت سے نئے نئے ناموں اور نئی نئی تدبیروں سے رعایا پر محصول بھی عائد ہونے لگے اور تجربہ بتاتا ہے کہ ان جدید محصولوں اور مطالبات کا خواہ کچھ بھی نام رکھ دیا جائے لوگ آسانی سے دینے پر آمادہ نہیں ہوتے عموماً جو بھی دیتے ہیں جبراً قہراً حکومت کے خوف سے دیتے ہیں۔ لیکن اکثریت خوش دلی سے ان کی ادائی پر آمادہ نہیں ہوتی صفائی، حفظان صحت، تعلیم عامہ وغیرہ کے فوائد کا لاکھ فلسفہ پروفیسروں، اخبار نویسوں کتب سازوں کے ذریعہ سے بیان کرایا جائے۔ لیکن عام طور پر بھی اکثریت ان کو حکومت کا جبر ہی قرار دیتی ہے۔ اس تجربہ کے ہوتے ہوئے مذکورہ بالا طبقات کی امداد کے نام سے پبلک پر اگر کوئی جدید ٹیکس عائد کیا جائے گا تو کوئی تعجب نہیں کہ باشندوں کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑے اور خود حکومت کی جان کے لالے پڑ جائیں۔

اسلام کے سامنے بھی یہ ساری مشکلات تھیں پھر اس نے ان کے حل کی راہ کیا پیدا کی اب میں اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ حکومت کی آمدنی میں اسلام نے مالکانہ قوتوں کا حصہ قدر ضرورت سے زیادہ نہیں رکھا۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی حکومت کے پہلے امام اور امیر تھے جیسا کہ بیان کر آیا ہوں، حکومت کی پہلی آمدنی سے بحیثیت امام یا امیر آپ کو خمس کے نام سے جو حصہ ملا اس خمس سے بھی تین ثلث کو خداوند تعالیٰ نے قرآن میں "الیتامیٰ والمساکین وابن السبیل" کے لئے مخصوص فرما دیا باقی دو حصوں میں سے ایک حصہ آپ کے اقربا کا تھا اور اس خمس کا خمس

یعنی پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ) صرف یہ ؐ صرف خاص مبارک ؐ کے لئے مخصوص تھا لیکن اس کا حال بھی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ضروریات سے جو کچھ بچ جاتا تھا اور آپ کی ذاتی ضرورتوں کا معیار ہی کیا تھا جو نہ بچتا اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے، علانیہ بھرے مجمعوں میں اعلان فرماتے کہ

ما یحل لی مما افاء اللہ علیکم مثل ھذہ الا الخمس۔ — خدا نے جو آمدنی اے مسلمانو تم کو واپس کی ہے (یعنی جن کا مصرف تم ہو) اس میں خود میرے لئے بجز اس خمس (پانچویں حصہ) کے اور کچھ لینا جائز نہیں۔

جب پیغمبر کے لئے خمس ؐ کے سوا کچھ حلال نہ تھا تو اسی سے دوسرے امراء و ولاۃ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے اور

والخمس مردود فیکم — اور پھر یہ خمس (پانچواں حصہ) بھی تم ہی لوگوں پر واپس کر دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ اس پانچویں حصہ کی بڑی مقدار مسلمانوں کی عام ضرورتوں میں صرف ہو جاتی ہے۔
اس فقرہ کی تخریج امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول ہے،

یعنی بالخمس حقہ من الخمس — یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس سے آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔

بعد کو آپ کے راشدین خلفاء نے جو عملی ثبوت خود اپنی اور اپنے عیال کی زندگی کی شانوں سے پیش کی ہیں، تاریخ کے اوراق ان واقعات سے لبریز ہیں اور اجمالاً بعض چیزوں کا ذکر آچکا ہے اور اسی کو میں اسلام کا ایک جدید اقدامی کارنامہ خیال کرتا ہوں بنی آدم کے اس کسمپرس پسماندہ طبقے جو ہمیشہ دوسروں کے سینے کے بوجھ بنے رہے بلکہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام میں حتیٰ کہ کہیں کہیں قانوناً بھی افلاس، غربت، معذوری، ضعیف، دائم المریض، فالج وغیرہ اتفاقی غیر اختیاری مصائب کو جرم اور سرمایۂ صد رسوائی و خواری قرار دیا گیا[1]۔ حقارت و ذلت کے بدترین سلوکوں کے جو ہمیشہ مستحق ٹھیرائے گئے ان کی باضابطہ منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لئے حکومت کا اپنی تمام عسکری اور فوجی قوتوں کے ساتھ کمربستہ ہو جانا اور اس کو عملاً گذشتہ غائب انسانیت کی تاریخ کیا دنیا کی حکومتیں اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی بجٹ (موازنہ) میں جدید مصارف کی ان غیر معمولی مدوں کی تکمیل و پابجائی کے لئے علاوہ خمس کے محصول کے آمدنی کے جو ذرائع اسلام نے اختیار کئے اور

[1] جیسا کہ اسپارٹا یونانی اداروں کے قوانین کے متعلق مؤرخین ذکر کرتے ہیں ۱۲

محصول اندازی کے اس سلسلہ میں جن حکیمانہ نزاکتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ بھی بجائے خود کچھ کم تعجب انگیز نہیں بلکہ اسلام کی صداقت یا قدرتی قانون ہونے کی وہ ایک بین دلیل ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ موازنہ میں مصارف کی متعدد مدوں کا جو اضافہ کیا گیا یہ محصول در حقیقت ہے۔ مذکورہ بالا طبقات میں سے تقریباً ہر ملک میں ہر طبقہ کے ہزاروں اور لاکھوں افراد رہتے بستے ہیں ان کی انفرادی مالی اعانت کا بیڑہ اٹھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ محصولی رقوم سے مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا ضرورت مزید آمدنی کی تھی۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے یوں تو سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن شاید ان کی طرف غور نہیں کیا گیا میں ان میں سے بعض نکات اور مصالح کو نمبروار بیان کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ موازنہ کے ان مصارف کی تکمیل کے لئے اسلام جن لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا تھا ان کے لئے اس نے اس عجیب و غریب رعایت کا اعلان کیا کہ جو لوگ اس محصول کے ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو ان تمام مالی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا جو عموماً دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ ایک تو اسلام نے یوں ہی اپنی رعایا کو رومی و عجمی سلاطین کے ناجائز مطالبات سے سبکدوش کر ہی دیا تھا لیکن ان لوگوں کے ساتھ رعایت کی حد کر دی گئی یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا ایک قانونی اور فطری حق ہے اس سے بھی اس مد کے محصول ادا کرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

(۲) حکم دیا گیا کہ جس طرح ہر قوم و ملک کے لوگ خصوصاً جو کسی نہ کسی قسم کا مذہب رکھتے ہیں، منجملہ دیگر مذہبی امور کے آخر خیر و خیرات بھی ضرور کرتے ہیں یا یوں خیر و خیرات کی مد جسے ہر حال ہر مذہبی زندگی رکھنے والا آدمی اپنی آمدنی سے ضرور نکالتا ہے۔ لیکن اب تک اس کو لوگوں نے مبہم غیر متعین شکل میں رکھا ہے۔ آمدنی سے نکالی ہوئی اسی رقم کو اسلام ذرا متعین و مشخص شکل دے کر لوگوں سے وصول کرے گا اور بجائے اس کے کہ جا بجا چند دنوں تک اپنی آمدنی سے بچائی ہوئی اس رقم کو لوگ انفرادی طریقہ سے پہنچاتے تھے۔ حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اپنے صوابدید سے مستحقین تک پہنچا دے گی جس کے معنی یہی ہوئے کہ ایک طرف حکومت کے تمام مطالبوں سے سبکدوشی بھی ہوئی اور لوگوں کی مالیات اور آمدنی پر مزید کوئی بار بھی نہ پڑا۔ بلکہ وہی چیز جسے مبہم شکلوں میں لوگ ادھر ادھر بانٹ دیا کرتے تھے اب منظم شکل میں تقسیم ہوگی۔

(۳) آمدنیوں سے پس انداز ہونے والی اس رقم سے چونکہ ملک کے مذکورہ بالا اتفاقی آفات و مصائب کے شکار طبقات کی امداد کی جائے گی۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ خود ان رقوم کے جمع کرنے والے یا ان کے خاندان میں سے کوئی آدمی کسی وقت خدانخواستہ ان مصائب و آفات کا شکار ہو تو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے گویا جن اتفاقی مصائب و آفات کی تصویر کھینچ کر بیمہ کمپنی والوں کے ایجنٹ یہ حکم دیتے ہیں کہ ان کا خیال کر کے اپنی آمدنی سے فی صدی کچھ رقم ان کی کمپنیوں میں جمع کی جائے یا انجمن ہائے اتحاد باہمی کے مبلغین جن اتفاقی ضرورتوں کے لئے

قرضہ وو، م و غیرہ کا بوجھ دل میں پیدا کرکے انجمن کی کسی شاخ سے متعلق ہونے کی تلقین کرتے پھرتے ہیں۔ ان ساری ضرورتوں کی کفالت خود بخود ہو جاتی ہے۔ ملک کے یتامیٰ، فقراء، مساکین، بیوگان، مسافر جب سب ہی کا اس میں حق ہے تو خزانہ کا روپیہ ان تمام خطرات کے وقت جیسے دوسروں کی مدد کرے گا، خدانخواستہ اگر دینے والوں پر یا ان کے خاندان والوں پر کسی وقت وہی مصیبت آجائے تو اس کی اعانت سے کیسے گریز کیا جا سکتا ہے۔ البتہ فرق صرف اس قدر ہے کہ بیمہ یا کسی اتحاد باہمی یا دوسری امدادی یونینیں جو ان ہی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر قائم ہوتی ہیں، ان کی جمع شدہ رقوم سے اتفاقی حوادثات کی صورت میں جمع کرنے والے یا ان کے خاندان والوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور اسلامی تنظیم کی شکل میں اگر ان پر ان کے خاندان پر کوئی حادثہ پیش آئے تو ان کی امداد بھی وہ کرے گا اور اگر ان کے سوا ملک کے دوسرے باشندوں کو اگر ان حادثات میں مبتلا ہونا پڑے تو ان کی بھی وقت پر مدد کی جائے گی۔

علاوہ اس کے پہلی صورت میں ایک بڑی خرابی یہی ہے کہ آمدنیوں سے رقم اس لئے پس انداز کرائی جاتی ہے کہ اتفاقی حوادث کے موقع پر کام آئے گی۔ لیکن اگر اتفاقاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان رقوم کے جمع کرانے والے ان مزعومہ خوفناک حوادث سے محفوظ رہتے ہیں اور خواہ ان کا پڑوسی بلکہ حقیقی بھائی بھی کسی اتفاقی حادثہ میں مبتلا ہو گیا تھا اس کی کوئی امداد ان رقوم سے نہیں ہو سکتی گویا ملک کی یہ رقم جو باشندگان ملک کے ان حوادث کو پیش نظر رکھ کر جمع کرائی جاتی ہے عموماً ان اغراض میں بہت کم کام آتی ہے اور جمع کرنے والے ان کو بہ مدد کے عموماً غیر ضروری مصارف میں پھونک دیتے ہیں۔ گویا بیمہ ہو یا کبھی باہمی اتحاد باہمی یا اس قبیل دوسرے ادارہ جات ان سب کا قرآنی الفاظ میں

دولة بين الاغنياء منكم — تونگروں ہی میں چکر کھاتی ہے

(وہ دولت)

ہی کی شکل میں زیادہ تر انجام ہوتا ہے یعنی گھوم گھما کر اور پھر پھرا کر امیروں ہی کے دائرے میں وہ گشت کرتا رہتا ہے۔ غریبوں کے منہ میں اگر اس کی ایک کھیل بھی نہیں پہنچ سکتی ہے۔ وہی جو حال ملک کے اس سرمایہ کا ہوتا ہے جسے گو ملک کے افراد میں بظاہر پھیلا دیا جاتا ہے۔ لیکن گھوم پھر کر بالآخر اصل سے اپنے تمام بیٹوں پوتوں پڑپوتوں کے "الاغنیاء" یا سرمایہ داروں کے جیبوں میں اپنا آخری ٹھکانا بناتا ہے۔ میرا اشارہ سود اور بیاج کی طرف ہے۔

لیکن اسلام ملک کی آمدنیوں سے جو کچھ پس انداز کراتا ہے وہ بہرحال ان ہی اغراض میں خرچ ہوتا ہے جس کے لئے وہ جمع کیا جاتا ہے خواہ ان اغراض کے لئے خود جمع کرانے والے اور اس کے خاندان کو ضرورت پیش آئے خواہ ملک کے کسی اور دوسرے باشندے کو ان کی ضرورت ہو۔

(۴) اسلام یہ محصول ملک کے ہر باشندے پر عائد نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تمام مطالبات محض ان لوگوں تک محدود رکھے گئے ہیں جو اپنی اور اپنے زیر پرورش متعلقین کے روزمرہ معمولی مصارف کی

تکمیل کے بعد اپنے پاس کچھ پس انداز کر سکتے ہوں۔ اصطلاحاً اسی کا نام نصاب ہے اور ہر چیز کا نصاب اسلام نے جدا جدا مقرر کیا ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں پڑھی جا سکتی ہے، عموماً لوگوں کو معلوم بھی ہے۔

(۵) اس کے بعد بھی یہ مطالبات ہر قسم کے مملوکات پر عائد نہیں ہوتے بلکہ صرف ان چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جن میں عموماً بڑھنے بڑھانے کی صلاحیت ہو۔ مثلاً تجارت، زراعت، بغرض افزائش نسل جن مویشیوں کی پرورش کی جاتی ہے یا نقد سرمایہ۔ بہ شکل سونا چاندی، ظاہر ہے کہ آدمی ان کو بڑھا سکتا ہے اور ان سے آمدنی پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ آمدنی پیدا کرنے کے عام ذرائع دنیا میں عموماً یہی تقریباً (سونا چاندی) اور ان کے سکے ہیں۔

(۶) اس محصول کا اندازی میں اس کا بھی خاص طور پر ذہنی احتیاط سے خیال کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں زیادہ محنت اور کد و کاوش ہوتی ہو۔ اسی نسبت سے مطالبہ میں تخفیف کی جائے اور جس حد تک اس کی پیدائش میں محنت کم اور قدرتی وسائل کو زیادہ دخل ہو، محصول میں اضافہ ہو گا یعنی تجارتی اموال یا سونا چاندی یا ان کے سکے چونکہ ان سے آمدنی حاصل کرنے میں پورا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ نیز سرمایہ کے سارا یا رہنا جوکھوں پر پڑتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے اموال سے چالیس روپے میں ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ بخلاف کاشت کے کہ اگر اس کی سیرابی وغیرہ میں مصنوعی ذرائع مثلاً رہٹ چرس وغیرہ سے کام لینا نہیں پڑتا بلکہ قدرتی بارش یا نہروں کے پانی سے سیرابی ہوتی ہے تو پیداوار میں سے ایک من یعنی دسواں حصہ اور اگر آبپاشی کے مصنوعی ذرائع رہٹ، موٹ، چرس وغیرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے تو بیسواں حصہ۔ اسی طرح اگر کسی کو خزانہ مل جائے (جس کی مختلف شکلیں ہیں) بہرحال خزانہ پانے کی جن صورتوں میں پانے والا قانونی طور پر اس کا مالک قرار دیا گیا ہے چونکہ یہ ایک غیر مترقبہ نفع اس طور پر حاصل ہوتی ہے کہ اس میں محنت کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ اس لئے حکومت پانچواں حصہ اس سے لے لیگی۔ اور یہی حکم سونے چاندی لوہے، پیتل وغیرہ کے معدنیات کا ہے یعنی حکومت پانچواں حصہ لیگی۔ البتہ ایسے مویشی (مثلاً اونٹ، گائے، بکریاں وغیرہ) جن کا زیادہ وقت چراگاہ اور جنگل میں گذرتا ہو یعنی عموماً جن سے افزائش نسل کا کام لیا جاتا ہے اصطلاحاً انھیں "اسوائم" کہتے ہیں، اور دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگ اس کو مستقل روزگار کرتے ہیں، ہندوستان کے آباد علاقوں میں اس کا رواج کم ہے ورنہ صحرائی علاقوں کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کی گذر اوقات مویشیوں کی اسی قسم کی پرورش سے ہوتی ہے اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں، ان میں ہر قسم یعنی اونٹ کا الگ، گائے بیل کا الگ، بکریوں دنبوں بھیڑوں کا الگ الگ نصاب اور جو کچھ محصول ان سے لیا جائے اس کی تعداد مقرر فرما دی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی وہی چالیسویں حصہ کا عمل ہوا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ

عرب میں زیادہ تر مذکورہ بالا جانوروں ہی کی پرورش بطور ذریعہ معاش کے گلوں اور ریوڑوں کی شکل میں کی جاتی تھی۔ لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں یہی کاروبار گھوڑوں کا بھی جاری تھا جیسا کہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں،

لم يكن اصحاب الخيل السائمة من المسلمين بل اهل الابل وما تقدم اذ اصحاب هذا انما هم اهل المدائن والشام والترك وانما فتحت بلادهم في زمن عمر وعثمان۔
(ص ۱۵۰ ج ۱)

(عہد نبوت میں) مسلمانوں کے کسی طبقہ میں گھوڑوں کی پرورش کا (افزائش نسل کی غرض سے) عام رواج نہ تھا بلکہ اونٹوں (اور جن اور کا ذکر ہوا) ہی کی پرورش کا رواج تھا کیونکہ گھوڑوں کی پرورش کرنے والے اس زمانہ میں یا مدائن کے رہنے والے ہیں یا دمشق کے یا ترکانی خرگاہوں والوں میں اس کا رواج ہے اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد میں ہوا۔

بہر حال جب گھوڑوں والی رعایا بھی اسلامی محروسہ میں داخل ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ ان گھوڑوں پر بھی محصول عائد کیا جائے جیسا کہ دوسرے جانوروں پر ہے۔ لیکن محصول کی مقدار کیا ہو تو حنفی فقہاء لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا۔

صاحبها بالخيار ان شاء اعطى من كل فرس دينارا وان شاء قومها واعطى من كل مائتي درهم خمسة دراهم (ہدایہ)

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو اختیار ہے چاہیں ہر گھوڑے کی زکوٰۃ ایک دینار (اشرفی) ادا کریں اور چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت لگا کر ہر دو سو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ ادا کریں۔

جب دو سو درہم کی قیمت سے پانچ درہم کا یہاں بھی حضرت عمرؓ نے حکم دیا تو وہی چالیسواں حصہ اس میں بھی ہوا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً مویشیوں میں بھی چالیسویں حصہ کے اصول کو محفوظ رکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۷) عام طور سے جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے۔ عموماً محصول اسی وقت ان کا وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آئی ہو بلکہ مالک ہونے کے کامل ایک سال (حولان حول) گذرنے کی ضرورت ہے یہ عام دستور ہے۔ زراعت میں کچھ ترمیم بھی ہوئی ہے۔

(۸) نہایت شدید تاکیدی احکام اس باب میں بھی ہیں کہ حکومت کی خرابی وغیرہ مدوں کی آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے۔ یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد

کے لئے جو آمدنی حاصل کی جاتی ہے اس کا خاص نام "الصدقات" ہے اور الصدقات کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس فنڈ کی رقم کو حکومت کی دوسری آمدنیوں میں نہ ملایا جائے اور نہ ان خزانی مصارف پر اس آمدنی کا کوئی حصہ (بجز خاص صورتوں کے) ایک حبہ خرچ ہو سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سخت تحدیدی لہجے میں بار بار پلٹ پلٹ کر یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ

لا ينبغي ان يجمع مال الخراج الى مال الصدقات والعشور لان الخراج فيئ لجميع المسلمين والصدقات لمن سمى الله عز وجل في كتابه۔
(الخراج ص ۴۶)

جائز نہیں کہ خراج کی آمدنی صدقات اور عشور کی آمدنی کے ساتھ جمع کی جائے کیونکہ خراج تو ہر قسم کے مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے اور الصدقات تو صرف انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کے نام کا ذکر حق تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

حتیٰ کہ انھوں نے تو یہاں تک تاکید کی ہے کہ دونوں مدوں (خراج و صدقات) کے تحصیلدار بھی الگ الگ ہونے چاہئیں فرماتے ہیں،

ولا يتولاها عمال الخراج فان مال الصدقة لا ينبغي ان يدخل في مال الخراج
(کتاب الخراج ص ۴۶)

بلکہ خراج کے کلکٹروں اور تحصیلداروں کے ہاتھ میں صدقات کی آمدنی کے وصول کا سلسلہ سپرد کیا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ الصدقات کی آمدنی خراج کی آمدنی میں شریک کی جائے۔

(۹) جس علاقہ یا ضلع یا تعلقہ سے الصدقات کی آمدنی وصول کی جائے سب سے پہلے ان صدقات کے مستحق اسی علاقہ کے مذکورہ بالا طبقات کے اہل حاجت ہیں۔ ہدایہ میں ہے،

ويكره نقل الزكوة من بلد الى بلد وانما تفرق صدقة كل فريق فيهم (۲۲۵)

ایک شہر سے دوسرے شہر میں صدقہ کو منتقل کرنا مکروہ ہے بلکہ ہر فریق کا صدقہ انہی لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔

ابن ہمام نے مزید لکھا ہے کہ

والمعتبر في الزكوة مكان المال۔

زکوٰۃ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی کس جگہ سے وصول ہوئی ہے یعنی جس مقام سے وصول ہوتی ہے اسی مقام کے مستحقوں پر تقسیم ہوگی۔

اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث مشہور ہے کہ

تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔
(بخاری و مسلم)

جس علاقے کے تونگروں اور سرمایہ داروں سے الصدقات وصول کئے جائیں اسی علاقہ کے فقراء میں وہ تقسیم کی جائے۔

حضرت عمران ابن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کسی جگہ وہ الصدقات کے تحصیلدار بنا کر بھیجے گئے، کچھ دن کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے پوچھا "این المال" (مال کہاں ہے) بولے

للمال ارسلتمونی اخذناھا من حیث کنا ناخذھا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووضعناھا حیث کنا نضعھا۔
(سنن بیہقی)

کیا آمدنی لانے کے لئے تم نے ہمیں بھیجا تھا، ہم نے اس کو ان ہی مقامات سے وصول کیا جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جہاں اس کو تقسیم کرتے تھے وہیں ہم نے اسے بانٹ دیا۔

البتہ اگر وہاں کی ضروریات سے بچ جائے تو پھر باقی ماندہ حصہ کو "مرکز" کے خزانے میں جمع کر دیا جائے اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یمن اور قبیلۂ طے "تمیم" تک کے صدقات آتے تھے، بہرحال کلیہ یہی ہے کہ "الصدقات" پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے جہاں کے ارباب حیثیت سے وصول کیا گیا ہو خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ بعض فقہاء نے تو مختلف حدیثوں کی بنا پر اس قانون میں یہاں تک تفصیل کی ہے کہ

الافضل ان یصرفھا الی اخوتہ الفقراء ثم الی اولادھم ثم اعمامہ الفقراء ثم اخوالہ ثم ذوی ارحامہ ثم جیرانہ ثم اھل سکتہ ثم اھل مصرہ
(فتح القدیر ص ۳۹ ج ۲)

یہ زیادہ بہتر ہے کہ "الصدقات" کی آمدنی صدقہ ادا کرنے والوں کے محتاج بھائیوں میں تقسیم کی جائے، پھر ان کے بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کو پھر محتاج چچاؤں کا حق ہے پھر ماموؤں کا پھر عام رشتہ دار پھر پڑوسی پھر جو لوگ اس سڑک پر رہتے ہوں جس پر صدقہ ادا کرنے والا رہتا ہو، پھر اس کے شہر والے۔

جس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف مقام ہی کو ترجیح حاصل نہیں ہے بلکہ دینے والوں کے رشتہ داروں کو غیر رشتہ داروں پر اور رشتہ داروں میں بھی جو جتنا زیادہ رشتہ میں قریب ہو وہ اگر گویا بالا مصائب و آفات میں گرفتار ہو گیا ہے تو اس مال کا وہ زیادہ مستحق ہے۔

الصدقات کے متعلق ان نازک حکیمانہ اصولوں کے ساتھ یہ اعلان کہ جو مسلمان اس

محصول کو ادا کرے گا، اس کو دوسرے حکومتی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا، اس کا قدرتی اثر یہ تھا کہ برضا و رغبت لوگ اسی الصدقاتی مطالبہ کو قبول کر رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی عربوں کو مخاطب فرما کر ارشاد فرماتے

یا معشر العرب احمدوا اللہ اذ رفع عنکم العشور۔
(الطحاوی ص ۳۱۲)

عرب کے لوگو خدا کا شکر کرو کہ تم سے اس نے حکومتی عشور (ٹیکس) کو اٹھوا دیا۔

لوگوں کو اس حدیث کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ حالانکہ صاف مطلب یہی تھا کہ حکومتیں اپنی رعایا پر جو ٹیکس (عشر) وغیرہ کے نام سے ٹیکس اور رقم عائد کرتی تھیں، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے معاف فرما دیا ہے اس لئے آپ کبھی یہ فرماتے کہ

لیس علی المسلمین عشور انما العشور علی اھل الذمۃ۔
(طحاوی ص ۳۱۲)

اہل اسلام پر عشور (حکومتی ٹیکس) نہیں ہیں، بلکہ العشور صرف اہل ذمہ پر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام چونکہ "الصدقات" ادا کرتے ہیں اس لئے حکومتی ٹیکس، باج و خراج وغیرہ سے وہ مستثنیٰ ہیں اور اب یہ خراجی آمدنی صرف اہل ذمہ پر رہ جاتی ہے، حکومتی ٹیکسوں سے استثناء ہی کا شرف تھا جسے بعض مسلمان کھونا نہیں چاہتے تھے اور اسلام کے اس قانون کی بنیاد پر یعنی غیر مسلم رعایا کی مملوکہ خراجی زمین اگر مسلمان بھی خریدے گا تو اس سے بھی خراج ہی لیا جائے گا۔ بہت سے مسلمان ابتداء میں خراج کی اس ذلت کو برداشت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی کتاب الخراج میں یہ سوال اٹھا کر کہ خراجی زمین خرید کر کیا اس کا خراج اپنے ذمہ کوئی مسلمان لے سکتا ہے۔ مختلف اکابر اسلام کا یہ فتویٰ جواب میں نقل کیا ہے۔

لا تجعل فی عنقک صغاراً۔
(کتاب الخراج قرشی ص ۵۵)

اپنی گردن میں ذلت کا طوق کیوں ڈالتے ہو (یعنی بلاوجہ خراج) کی ذلت کیوں برداشت کرتے ہو۔

الغرض الصدقات کے خفیف محصول کو قبول کر لینے کے بعد اتنی قیمتی آزادی کا حصول، پھر "الصدقات" کے نام سے مسلمانوں کے مال و جائداد و مویشی پر جو محصول عائد کیا گیا وہ کوئی نئی چیز کبھی بھی نہیں ہے، ہر مذہب والے اپنی آمدنی کا ایک حصہ خیر و خیرات میں صرف ہی کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسی مبہم غیر منظم خیرات کو صرف منظم اور باقاعدہ شکل میں تبدیل کر دیا اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے اگر نسبتاً عام خیرات سے کچھ رقم بڑھ بھی گئی ہو، جب بھی ہر قسم کے مطالبات سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سے الصدقات کے فنڈ میں شریک ہونے والے قطعاً نفع ہی میں رہتے ہیں۔ کہاں پیداوار کا نصف حصہ کہاں دسواں اور بیسواں حصہ دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ جس

علاقوں کے لوگوں سے لیا جاتا تھا زیادہ تر اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اسی علاقہ کے حاجتمندوں میں تقسیم کر دیا جائے جو ان اتفاقی مصائب کے شکار ہو گئے ہوں، بلکہ ان کے اعزہ و اقربا خاندان والوں کو جب ترجیح دی جاتی تھی تو گویا قریب قریب الصدقات میں شریک ہونے سے وہی غرض حاصل ہوتی جس غرض سے آدمی آج کل بیمہ کمپنیوں یا انجمن ہائے امداد باہمی میں شریک ہوتا ہے پھر محصول عائد کرنے میں اتنی نرمیاں کہ اپنے اور خاندان بھر کے روز مرہ مصارف سے بچانے اور فارغ البالی کے ایک خاص معیار کے بعد اس محصول کا مطالبہ کیا جاتا ہے، وقت رسی کے تمام اصولوں محنت و جانکاہی کی تمام نزاکتوں کا خیال کرتے ہوئے سال بھر کے استفادہ کا موقع دینے کے بعد ان کو وصول کرنا اور مزید یہی نہیں بلکہ اس کو خدا کی خوشنودی کا ایک بہترین ذریعہ قرار دینا قرآن و حدیث جن کے فضائل سے معمور ہیں! اس کے بعد ملک کے ان واقعی حاجتمندوں کی اعانت کا ارادہ کر کے حکومت کا اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تمام فوجی و عسکری قوتوں کو اس کی وصولی کے لئے مختص کر دینا حتیٰ کہ ایسے خطرناک وقت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کے ایک بڑے حصہ میں بغاوت پھیل گئی ہو، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکومت کے خراج کے لئے نہیں جیسا کہ اکثر مغربی مورخین کو دھوکا ہوا ہے بلکہ غریبوں کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی آخری قوت تک مقابلہ کا چیلنج دینا کہ

لو منعوني عقالا مما
اعطوه رسول الله صلى الله
عليه وسلم لجاهدتهم

اگر صدقات کے سلسلہ میں کسی ایسی ڈوری کے ادا کرنے سے انکار کریں گے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو ان سے میں جہاد کروں گا۔

جیسا کہ صحاح کی ہر کتاب میں مذکور ہے، حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود اس پر اصرار کرنا اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حکومت کے موازنہ میں جہاں ان جدید مصارف کا اضافہ کیا ہے وہیں اس کی وصولی کی کتنی آسان اور کتنی قطعی و یقینی راہیں اس نے اختیار کی تھیں خود الصدقات کا ایک مذہبی فریضہ ہونا اور کیسا مذہبی فریضہ کہ صحابہؓ میں بعضوں کا خیال تھا،

ما مانع الزكوة بمسلم ومن
لم يودها فلا صلوة له.
(الترغيب لابن يوسف ص)

زکوٰۃ کا نہ ادا کرنے والا مسلمان ہی نہیں ہے اور جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

قرآن اور صحیح حدیثوں میں اس مطالبہ کے نہ ادا کرنے والوں کے متعلق اتنی شدید تاکیدیں مثلاً اس کی پیشانی اس کے پہلو قیامت میں داغ دیئے جائیں گے (قرآن) قیامت کے دن اس کا مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوئی ہو اس شخص کے سر پر بشکل اژدر پاپیچتے ہوئے اونٹ اور بکریوں کی شکل میں آنا اور ان سب پر مزید برآں حکومت کی تلوار کا اس کی وصولی کی ضمانت لینا کون

کہہ سکتا ہے کہ دینے والے کے پاس اس مد کا ایک پیسہ بھی باقی رہ سکتا ہوگا۔ پھر سوچنا چاہئے کہ جس حکومت کے خزانے میں ملک کے ان پریشان حال طبقات کے لئے ایسا انتظام کیا گیا ہو اس ملک کی امن و عافیت کیا حال ہو سکتا ہے۔ نہ کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوف زدہ رہ سکتا ہے کہ اس کے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ بیوی بیوہ ہو کر لاوارث ہو جائے گی۔ نہ کسی کو اس کا خطرہ رہ سکتا ہے کہ میں اگر اتفاقی طور پر کسی مصیبت یا مرض کا شکار ہوا اور میرا ہاتھ خالی ہو گیا تو علاج کون کرائے گا میرے بچے کیا کھائیں گے۔ اگر کسی تاجر کو تجارت میں خسارہ آ جائے۔ کسان کو زراعت میں نقصان پہنچے۔ کوئی لنگڑا ہو جائے، اندھا ہو جائے، بڈھا ہو جائے سب کو اطمینان ہے کہ میری امداد کے لئے سرکاری خزانہ میں مستقل کافی رقم موجود ہے جس ملک کے مقروضوں کو قرض توڑنے کے لئے سودی قرض کی حاجت نہ جانئے بنیا دیجئے کی ضرورت کہ ان کے قرض کی ادائی کا سامان حکومت کے خزانے میں موجود ہے۔ بیوپار کاروبار کرنے والے مسافر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے ہیں، نہ ان کو اس کی فکر کہ کسی جگہ جا کر میرا ہاتھ خالی ہو جائے گا کہ ہر ضلع ہر علاقہ کے مقامی خزانہ میں اس کی امداد کا فنڈ موجود ہے۔ شاید صاحب حیثیت مسافروں کو شبہ ہو کہ اس مد کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر مطلق کر دیا کہ

لا تحل صدقة الا في سبيل الله
وابن السبيل (سنن بیہقی)

صدقہ کا مال جائز نہیں بجز مستحق لوگوں کے لئے لیکن مجاہد اور مسافر کے لئے۔

بلکہ مسافروں کے لئے تو اسلام نے ایک جدید سہولت کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ یوں تو ہر مسلمان پر واجب قرار دیا کہ

ان نزلتم بقوم فامر لكم
بما ينبغي للضيف فاقبلوا فان لم
يفعلوا فخذوا منهم حق الضيف
الذي ينبغي لهم.
(رواه البخاري)

تم کسی کے یہاں مہمان ہو کر جب اترو اور میزبان اگر مہمان کے لئے مناسب انتظام کرے تو اس کی مہمانی کو قبول کر لیا کرو اور اگر میزبان انکار کرے تو پھر ان سے مہمانی کا حق جو میزبان کی آمدنی کے مناسب حال ہو وصول کر لیا کرو۔

اسی طرح غیر اقوام جب اسلامی حکومت کی رعایا بننے پر آمادہ ہوتی تھیں تو اس وقت ان سے جو معاہدہ لیا جاتا تھا اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ

ضيافة من مر بهم من
المسلمين (بیہقی)

مسلمانوں کا جو آدمی ان پر گزرے اس کی مہمانی کریں گے۔

اگرچہ فقہاء نے اب ضیافت کے مسئلہ کو بجائے واجب کے مستحب قرار دیا ہے۔ لیکن جب بکثرت حدیثوں میں،

من اجمع الضيف بفنائه فهو عليه حق او قال دين ان شاء اقتضاه ان شاء تركه۔ (بیہقی)

جس کے گھر کی انگنائی میں مہمان پہنچے تو مہمان کا اس پر حق قائم ہو جاتا ہے (بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزبان پر وہ دین ہے) چاہے اس دین کو مہمان وصول کرے چاہے چھوڑ دے۔

وغیرہ الفاظ میں آئے ہیں تو مسافروں کے لئے اسلام کی مہیا کردہ سہولت کو آسان کیوں نہ کیا جائے گھر میں رہنے والے کے لئے کسی باہر سے آنے والے مسافر کا کھانا غالباً باعث مشقت نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے ابتدا میں جو نقشہ قائم کیا تھا کاش کچھ دن بھی مسلمان اس نقشہ کو باقی رکھتے تو آج گھبرا گھبرا کر زندگی بیمہ اور دانشوروں کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی نہ غریب مخلوق اور کاشتکاروں کی مشکلات کا حل باہمی امداد والی سود خوار انجمنوں میں سوچا جاتا گویا "پنجہ گرگ" (ساہوکار) سے نکال کر اس کے حلق پر ان انجمنوں کی چھری چلائی جاتی ہے۔ مسلمان علماء کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ سود اور بیمہ وغیرہ کی شکلوں کے جواز کی صورت پیدا کریں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام میں ان مشکلات کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی اور گویا اب یورپ کا ذہن پہلی دفعہ ان مسائل کی طرف منتقل ہوا۔ لیکن کیا کیجئے کہ کسی تصویر کے کسی ایک حصہ کے دیکھنے سے پوری تصویر کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ صرف زندگی کا بھی ایک شعبہ ہے جس میں اسلام کی ان نکتہ نوازیوں کا کوئی شکار نہ ہے۔ ابھی یورپ اور اس قسم کے دوسرے مفکروں کو مدت چاہیئے جو اللہ کے بتائے ہوئے نظام حیات کو خود تو کیا بنا سکیں گے سمجھ ہی لیں تو غنیمت ہے۔

الصدقات کے متعلق ایک تاریخی تغیر

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدید اسلامی نظام زندگی کی جو شادابی و تازگی عہد نبوت اور عہد صحابہ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی۔ لیکن اس معاشی نظام کی پہلی اینٹ گرا جانے کن اسباب کے تحت کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں اپنی جگہ سے سرک گئی آپ نے "الصدقات" کی اور تمام مدات (یعنی مویشی کاشت کردہ [illegible]) کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی ان کو تو باقی رکھا۔ لیکن روپیہ اور اشرفی سونا چاندی کی شکل میں اندوختہ مسلمانوں کے پاس تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کے سپرد کرنے کے انفرادی طور پر دینے کی اجازت دیدی۔ امام ابوبکر جصاص رازی اپنی تفسیر میں ناقل ہیں،

ان زكوة الاموال كلها كانت تحمل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم و ابى بكر و عمر و عثمان ثم خطب عثمان فقال هذا

اموال (سونا چاندی) کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد تک ان ہی بزرگوں تک پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی (حکومت میں یہ آمدنی داخل ہوتی تھی

شهر زكوتكم فمن كان عليه دين فليؤده ثم ليترك بقية ماله۔
(احکام القرآن جصاص ص ۱۵۵ ج ۳)

پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن خطبہ دیا اور فرمایا کہ (رمضان کا) یہ مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا ہے پھر جس پر کچھ دین (باقی ہو) وہ ادا کر دے اور اپنے باقی مال کو چھوڑ دے۔

جصاص لکھتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے،

فجعل لهم اداءها الى المساكين وسقط من اجل ذلك حق الامام في اخذها

حضرت عثمان نے زکوٰۃ دینے والوں کو اختیار دیدیا کہ خود براہ راست مسکینوں کو دے دیا کریں، اس وجہ سے امام (حکومت) کا جو حق اس مد کی وصولی کا تھا وہ ساقط ہو گیا۔

حالانکہ چند سطر پہلے جصاص ہی نے آیت قرآنی،

خذ من اموالهم صدقة — ان کے مال سے اے پیغمبر صدقہ لیا کرو۔

کے تحت یہ لکھا تھا کہ،

يدل على ان اخذ الصدقات الى الامام وانه متى اداها من وجبت عليه الى المساكين لم يجزه لان حق الامام قائم في اخذها فلا سبيل الى اسقاطه۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ "الصدقات" کی وصولی امام (حکومت) کے سپرد ہے اور وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر خود مسکین کو براہ راست ادا کر دے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہو گی کیونکہ زکوٰۃ کی وصولی کا جو حق امام (حکومت) کو حاصل تھا وہ اب تک باقی ہے اور اس کے ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے

جب یہ قرآنی قانون ہے اور حکیم جس کا قرآن نے ارادہ کیا تھا اس کا اقتضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے یہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے قول سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس سال حضرت نے کسی خاص وجہ سے "اموال" کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا کر دیا تھا اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمانؓ کے بعد ہر امام سے اس حق کو چھین لینا جو قرآن کا عطا کیا ہوا حق بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے۔ آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔ گویا باوجود اس ایک مد کے انفرادی ہونے کے "الصدقات" کی اور دوسری مدیں جو کم نہ تھیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خلافت عباسیہ تک ان مدوں کی آمدنی کروڑوں سے متجاوز ہو گی جو بھی بعد ان کے

دور میں دیکھی گئی ہے کہ ہر قسم کا پیشہ ور، ہر صنعت پیشہ، ہر مقروض، ہر تاوان رسیدہ تاجر، مصیبت زدہ کسان سب اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ ان کے انجمن امداد باہمی اور بیمہ کمپنی میں ان کا کثیر سرمایہ جمع شدہ ہے خصوصاً کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی دلچسپیاں اس حد تک بڑھی ہوئی تھیں کہ زمین اور آبپاشی کے انتظامات کے ساتھ ساتھ مسلم ہی نہیں بلکہ غیر مسلم کاشتکاروں تک کے لئے یہ حکم تھا کہ اگر تخم اور بیل وغیرہ کے لئے ان کے پاس سرمایہ نہ ہو تو

ان یدفع للعاجز کفایته من بیت المال قرضا لیعمل فیها	جو کسان تخم وغیرہ کے مہیا کرنے سے معذور ہو اسے سرکاری خزانے سے بطور قرض کے اتنا سرمایہ دیا جائے
(فتح القدیر ص [illegible] ج ۴)	

جس سے اپنے کاروبار کو جاری کر سکے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ تقاوی کی رسم مسلمانوں ہی کی نکالی ہوئی ہے یا ہندوستان میں اب تک اس کا رواج ان ہی کی بدولت باقی ہے۔

کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ کس حد تک خراج کے لینے میں نرمی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کا اندازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب جنہیں اپنی خلافت کے عہد میں، مالگذاری کی تحصیل کے لئے حضرت والا نے روانہ کیا تھا ان ہی کا بیان ہے کہ

استعملنی علی بن ابی طالب علی بزرج سابور فقال لا تضربن رجلا سوطا فی جبایة درهم ولا تبیعن رزقا ولا کسوة شتاء ولا صیف ولا دابة یعتملون علیها ولا تقیمن رجلا قائما فی طلب درهم قال قلت یا امیر المومنین اذا ارجع الیک کما ذهبت من عندک قال ویحک انما امرنا ان ناخذ منهم العفو یعنی الفضل۔ (سنن بیہقی ص ۲۰۵ ج ۹)	مجھے حضرت علی بن ابی طالب نے بزرج سابور (نامی تحصیل) کا تحصیلدار مقرر فرمایا جب روانہ کرنے لگے تو فرمایا، دیکھو روپے (درہم) کی تحصیل میں کسی کو کوڑے سے نہ مارنا اور نہ کسی کی خوراک کو بیچنا اور نہ سرما و گرما کے کپڑے ان کے نیلام کرنا اور نہ ان کے ان جانوروں (بیل وغیرہ) کو نیلام کرنا جس سے وہ کام کرتے ہیں اور روپے کی تحصیل میں کسی کو ایک ٹانگ پر کھڑا بھی نہ کرنا (تحصیلدار نے کہا) کہ ایسی صورت میں تو حضور میں اسی طرح واپس آجاؤں گا جیسے گیا تھا یعنی خالی ہاتھ آنا

پڑے گا تب حضرت علیؓ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہے ہمیں حکم ہی یہ دیا گیا ہے کہ العفو سے وصول کریں یعنی جو ضرورت سے زائد بچا ہوا ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسانوں کے ساتھ اسلام کا صحیح نقطہ نظر کیا تھا۔ العفو کی شرح میں نے کسی اور

تو قدر پیری کی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی پر دست درازی نہیں کرنا چاہیے آمدنی سے مال گذاری وصول کرنا چاہیے۔ جب بیل وغیرہ تک کو نیلام کرنے کی اجازت حضرت نہیں دے رہے تھے۔ تو اس سے اندازہ کرنا چاہیے، اور چیزوں کے متعلق ان کا کیا خیال ہوگا اس سلسلہ میں خیال کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ معاہدے کے بعد کسانوں کو جو زمین اسلامی حکومت بندوبست کر دیتی تھی تو جو مالگذاری معاہدے کے وقت طے ہو جاتی تھی اس پر اضافہ کا استحقاق بھی آئندہ حکومت کو نہیں رہتا تھا۔ اس باب میں متعدد روایتیں ہیں جن میں ایک روایت حضرت عمرؓ کی ہے ابراہیم نخعی اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں،

جاء رجل الی عمر فقال ان ارض کذا وکذا یطیقون من الخراج اکثر مما علیهم فقال لا سبیل الیهم انما صالحناهم صلحا۔ (البیہقی ص [illegible] ج ۹)	ایک آدمی حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا اس نے خبر دی کہ فلاں فلاں اراضی کو اتنا اس وقت وصول ہوتا ہے اس کو زیادہ مالگذاری ادا کرنے کی اس میں صلاحیت ہے، تب حضرت عمرؓ نے فرمایا

ان لوگوں پر اضافہ کی راہ بند ہے جو مالگذاری اس وقت لی جا رہی ہے اسی پر ان سے صلح ہوئی ہے۔

بہرحال اسلامی حکومت کے خزانے میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اس کے جو اغراض تھے یا ان کو ہونا چاہیے غالباً اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی جن لوگوں کے سامنے معاش کا یہ نظام پیش کیا گیا ہے وہ اب فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بیت المال کے اس عجیب و غریب نظام کے بعد پھر کیا دنیا کو بیمہ انشورنس انجمن ہائے امداد باہمی جیسی سطحی اور وقتی معالجوں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ بے روزگاری کی جو عام شکایت پھیل گئی ہے کیا اس کا احتمال اس وقت بھی باقی رہ سکتا ہے جب حکومت اپنی رعایا کے بے سرمایوں کو سرمایہ دینے کے لئے اپنے پاس مستقل بیش قرار رقم رکھتی ہو، بخشش دینے کے لئے تیار رہو اور قرضہ بھی۔

"الصدقات" کی "وصولی" اور "صرف" کے متعلق اسلام نے جن نکات کو اپنے پیش نظر رکھا ہے اگرچہ موٹی موٹی باتیں اس سلسلے میں جو یہاں قابل اندراج ہو سکتی تھیں ان کا بیان گذر چکا۔ لیکن اسی ذیل کی دو چیزیں چھوٹ گئی تھیں مناسب ہے کہ آخر میں ان کا بھی اضافہ کر دیا جائے میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ گذشتہ بالا امور کے "الصدقات" کے متعلق اسلام نے ان دو شرطوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ جس طرح الصدقات کے مد کی آمدنی کو الخراج والجزیہ وغیرہ کی آمدنیوں سے بالکل جدا رکھنے کا حکم ہے اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا ایک حبہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا جو اسلامی نقطہ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ اس

"غنی" سے مراد نہیں ہے کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کا مالک ہو، بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے مساوی کسی سرمایہ کا مالک ہو اس کے لئے اس آمدنی کا ایک حبہ تک حرام ہے۔ اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک آدمی آیا جس کے مشکیزے میں دودھ تھا۔ حضرت عمرؓ کو بھی ایک پیالہ اس دودھ کا ملا دودھ کچھ مزیدار تھا آپ نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے لائے ہو بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر میرا گذر ہوا وہاں "الصدقات" کے اونٹ چر رہے تھے ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے میں نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنے چھاگل میں رکھ لیا۔ سننا تھا کہ حضرت عمرؓ پر عجیب حالت طاری ہو گئی، راوی کا بیان ہے،

فادخل اصبعه فی فیه واستقاء	اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور قے کرتے جاتے تھے
(بیہقی)	

بہرحال قانونی "الغنی" کے لئے تو قطعاً اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو قانونی غنا رکھتا ہو بلکہ شب و روز کی خوراک سے زیادہ اس کے پاس سامان ہو، ایسے آدمیوں کے لئے یہ حرام تو نہیں ہے لیکن "الصدقات" کے شعبہ سے مانگنا اس کے لئے بھی ناجائز ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ملک کے ان مصیبت زدہ طبقات کے لئے اسلامی حکومت نے اپنے خزانے میں اگرچہ یہ سارا انتظام بڑی طاقت سے کر رکھا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مد پر بھروسہ کر کے ایتھنز کے خوش باشوں کی طرح بے کاری اور بیکار وقت گذاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی کسی مد سے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف الفاظ میں ان کو سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتی الوسع "الصدقات" کے مال سے صاحب استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت میں بڑی تنگی پیدا ہو گئی مجبوراً میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا کہ الصدقات کی رقم کچھ میری بھی مدد فرمائی جائے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے عرض کرتے ہی ارشاد فرمایا،

من استغنی اغناہ اللہ ومن	جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا، خدا
استعف اعفه اللہ۔	اسے بے نیاز رکھے گا اور جو دوسروں سے
	لینے میں احتیاط برتے گا، خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا۔

ملہ یہ ہندوستان کے قدیم فقہاء کے حساب کا نتیجہ ہے۔ اسی زمانے میں ساڑھے چھتیس تولہ کو نصاب قرار دیا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک پہلی صورت زیادہ درست ہے ۱۲

حضرت ابو سعید پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ

لاستعفن فیعفنی اللہ و	میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط
لاستغنین فیغنینی اللہ۔	کروں گا خدا میری آبرو بچائے گا۔
	اور میں اپنے کو مخلوقوں سے بے نیاز رکھوں گا خدا مجھے بے نیاز رکھے گا۔

کہتے ہوئے واپس ہوئے ان کا بیان ہے کہ پھر اسی استعفاف و استغناء کے نتائج کو بالآخر میں نے اپنی آنکھوں سے اس شکل میں دیکھا کہ

سالت علینا الدنیا فغرقتنا	ہم پر دنیا کا سیلاب چھا گیا اور
الا من عصمه اللہ۔	اور ہم سب اس نے ڈبو دیا۔ لیکن وہ
(طحاوی)	جنہیں اللہ نے محفوظ رکھا ہو۔

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لئے تقریباً عام مجلسوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چند اور باتیں فرماتے ان میں ایک فقرہ عموماً یہ بھی ہوتا تھا،

الید العلیا خیر من الید	اوپر والا ہاتھ دینے والا ہاتھ نیچے والے
السفلی (صحاح)	ہاتھ سے بہتر ہے۔

یہ بھی ارشاد ہوتا

الایدی ثلث فید اللہ العلیا	ہاتھ تین ہیں، تو سب سے اونچا ہاتھ
وید المعطی التی تلیها وید	خدا کا ہے اور دینے والے کا ہاتھ
السائل السفلی الی یوم القیمة	(خدا کے ہاتھ کے بعد ہے) اور مانگنے والے
فاستعفف ما استطعت	کا تو سب سے نیچا ہاتھ ہے اور یہ
ولا تعجز عن نفسک ولا تلام	نسبت قیامت تک قائم رہے گی اپس
علی کفاف واذا اتاک اللہ	جہاں تک مانگنے سے بچ سکتے ہو بچو اور
خیرا فلیر علیک۔ (طحاوی)	خود کمانے سے نہ تھکو اور بقدر کفایت

اگر تمہارے پاس ہو تو پھر تم قابل ملامت نہ ہو اور خدا تمہیں جب کچھ خیر (مال) دے تو چاہیئے کہ اس کو اپنے اوپر نمایاں کرو،

حتی الوسع لوگوں کو واقعی مستحقین کے اس "حق" سے بچنے اور کنارہ کش رہنے کا حکم دیا جاتا تھا اور اس پر کیا جاتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خداداد قوتوں سے روزی حاصل کرنے میں کوشش کی جائے (لا تعجز عن نفسک کا یہی مطلب ہے) اور زیادہ امیر نہ ہونے کو کوئی جرم نہ خیال کرے اور اس جرم سے بری ہونے کے لئے "الصدقات" کی رقم سے امیری نہ پیدا کی جائے (مثلاً عموماً اپنی لڑکیوں کی شادی میں نمائشی مصارف کے لئے لوگ کنیا دان مانگا کرتے ہیں کہ سوسائٹی میں ورنہ بے عزتی ہو گی)

(۲) دوسری بات اس سلسلہ میں جو یہاں قابل ذکر ہے وہ "الصدقات" کی ایک خصوصیت بھی ہے

مقصد یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں سے "الصدقات" کا مطالبہ کیا گیا۔ بدگمانوں کو خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) خود اپنی اور اپنے اہل خاندان کی معاشی مشکلات کے حل کی یہ راہ تو نہیں بنائی ہے۔ خصوصاً جب اس زمانے میں بھی اکثر ممالک میں اس وقت تک خیر و خیرات کی رقوم یا مصارف دعوت وغیرہ کا استحقاق انھیں لوگوں کے ساتھ زیادہ مخصوص سمجھا جاتا ہے جن کی زندگی مذہبی ہو اور جو مذہب کی نمائندگی کرتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی نمائندہ ہونا اس بنا پر آپ کے بعد مسلمانوں میں مذہبی نمائندگی کا قدرتاً زیادہ استحقاق آپ کی آل اور آپ کے خاندان والوں ہی کو ہو سکتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ عموماً اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لیے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو عموماً دخیل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان ہی میں یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں اور یہی حال تقریباً اکثر غیر اسلامی سوسائٹیوں کا ہے میرا خیال ہے کہ غالباً یہی ایک مصلحت تھی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اور اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں "الصدقات" کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا نازک احساس رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے سامنے "الصدقات" کے مد کی کھجوروں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ سرکتے ہوئے ڈھیر کے پاس پہنچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ میں اٹھا کر ڈال دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑ گئی جھپٹ کر دوڑے اور بے قرار ہو کر فرمانے لگے۔

کخ کخ ارم بھا۔ — تھو تھو اسے پھینک دو۔

اور فرمانے لگے۔

اما شعرت انا لا ناکل الصدقة (رواہ البخاری) — تم نہیں سمجھتے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے۔

بعض روایتوں کے الفاظ ہیں،

انا لا تحل لنا الصدقة — ہم لوگوں کے لیے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے

اسی بنا پر فقہائے اسلام نے بھی بالاتفاق اپنی قانونی کتابوں میں اس دفعہ کو قانون کی شکل میں داخل فرمایا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ سادات اور آل فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ داروں پر الصدقات کی آمدنی حرام ہے۔

آخر میں ایک شبہ کا ازالہ باقی رہ جاتا ہے میں نے کہا تھا کہ "الصدقات" کے مطالبوں کو ادا کرنے والوں کو اسلام ہر قسم کے حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی رعایا مسلمان ہو کر اس طرح اپنے آپ کو حکومتی مطالبات سے مستثنیٰ کراتے رہے تو پھر حکومت کی کشوری و دفتری و رفاہیات عامہ کے مصارف کے لیے کہاں سے رقم آئے گی۔

لیکن اس کا پہلا جواب تو یہی ہے جو گزر چکا کہ اسلامی حکومت کی ہر وہ اراضی جو غیر مسلم رعایا کے قبضہ میں ہو خراجی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کو خرید بھی لے گا اور اس کے سوا اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوئی دوسری قانونی شکل نہیں جب بھی وہ خراجی ہی باقی رہتی ہے البتہ جزیہ کی تعلق مسلمان ہونے سے ساقط ہو جاتی ہے اگرچہ بنی امیہ کے حریص امراء نے مسلموں پر جزیہ باقی رکھا تھا لیکن بہت جلد حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانے میں اس غلط قانون کی اصلاح ہو گئی۔

بہر حال خراج کی وصولی کے لیے خراجی زمینیں پہلے تو کافی ہیں نیز "الصدقات" کے مصارف میں مذکورہ بالا طبقات کے لوگ قرآن نے بتائے ہیں ان ہی کے ساتھ اس آمدنی کو خود مکتفی بنانے کے خروج سے ایک اور مد کا "الصدقات" کے مصارف میں قرآن ہی نے اضافہ کر دیا ہے یعنی العاملین علیہا یعنی جو لوگ صدقات کے تحصیل وصول کا کام کرتے ہیں وہ بھی خواہ امیر ہوں یا غریب اپنی تنخواہ "الصدقات" کے مد سے بے تکلفی لے سکتے ہیں اس لیے محکمہ مال کے مصارف کی ادائیگی کی گنجائش تو خود "الصدقات" میں ہے۔ نیز ایک مد اس میں "فی سبیل اللہ" کی بھی ہے یعنی تبلیغی و دفاعی قوتوں پر بھی یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے علاوہ بریں محکمہ عدلیہ سو اسلام میں قضا کا کام دراصل ایک قسم کی عبادت ہے اگر قاضی غیر مستطیع ہے تو اس کو بھی تنخواہ اس مد سے دلائی جا سکتی ہے اور محکمہ تعلیمات کے لوگوں کو بھی فقہاء نے بصورت احتیاج اس آمدنی کے مصارف میں شریک کیا ہے۔ بیضاوی نے سبیل اللہ کے ذیل میں القناطر والمصانع بھی لکھا ہے گویا اس بنا پر مواصلات پر جو مصالح مسلمین ہی کی ایک چیز ہے یہ آمدنی خرچ ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے "الصدقات" کے مصارف ایک تو وہ رکھے ہیں جن کا تعلق مصیبت زدہ طبقات سے ہے۔ لیکن اس لیے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت کے پاس بجز "الصدقات" کی مد کے اور کوئی آمدنی نہ رہ جائے تو چند ایسے مصارف کا اس کی ذیل میں اضافہ کیا ہے جن کے بعد ایک حکومت کے قیام کے لیے جن امور کی ضرورت ہے سب کی تکمیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ان ہی مصارف میں ایک مد ان لوگوں کی بھی ہے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کی یہی حالت ہے ان لوگوں کو چپ کرنے کے لیے بھی "الصدقات" کے مصارف میں قرآن نے "مؤلفة القلوب" کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہاء کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتدائے اسلام کی حد تک محدود تھا اور اب ساقط ہو گیا۔ دلیل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اثر پیش کیا جاتا ہے کہ آپ نے مؤلفة القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت نہ رہی۔ حالانکہ قصہ صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمرؓ نے دینے سے یہ فرماتے ہوئے انکار کر دیا تھا کہ

ان اللہ اعز الاسلام و اغنی عنکما فاذھبا — اب خدا نے اسلام کو عزت و شوکت عطا کی پس تم دونوں جاؤ ...

لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لئے حضرت عمرؓ نے اس مد کو ساقط کردیا میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اولاً حضرت عمرؓ منسوخ ہی کیسے کرسکتے ہیں نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خط نسخ نہیں پھیرا جاسکتا بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کے صوابدید پر ہے جس وقت جن لوگوں کے لئے اس کی ضرورت سمجھے دے جن کے لئے ضرورت نہ سمجھے نہ دے۔ آخر میں اس سلسلہ میں قارئین کے اس مذکورہ بالا مسئلہ کو بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ واقعی ضرورتوں کے لئے اسلامی حکومت رعایا پر بقدر ضرورت جدید محصول عائد کرنے کا بھی اختیار رکھتی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میں نہیں خیال کرتا کہ ان امور کے ہوتے ہوئے اسلامی حکومت کو کسی دشواری کا سامنا ہوگا۔ [1]

قبل اس کے کہ اسلام کے معاشی مداخل (آمدنیوں) کا باب ختم کیا جائے چند اور ذیلی امور کا تذکرہ بھی کم از کم اجمالی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ "زر" یا "سکہ" کا بھی ہے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اس سلسلہ کی جو اہم ترین امتیازی چیز ہے وہ "توحید سکہ" کا مسئلہ ہے جس کا ذکر ربا "سود" کے باب میں گذر چکا ہے۔ بتایا گیا تھا کہ مختلف ممالک و اقالیم کے مختلف سکوں کے مبادلہ میں جو بٹہ دن کا رواج ہے یا اسلام کے اس قانون کی بنا پر کہ چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے جب تبادلہ کیا جائے خواہ سکہ کی شکل میں ہو یا زیور یا تبر (پترا) کی شکل میں ہو، برابر برابر ہونا چاہیئے اور بٹہ دن لگانے کی صورت میں چونکہ یہ مدعا فوت ہوجاتا ہے جس کے حل کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے اپنے نقرئی او طلائی سکوں کو ہم وزن کردیں اور جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہیں ہر جگہ

---

[1] مضمون [illegible] ایک کمزور پہلو [illegible] قارئین کرام کے لئے اس کو یہیں نقل کردوں [illegible] ترجمہ [illegible] ہوگا۔

[2] [illegible]

سات دن ہی کا ہفتہ اور بارہ مہینے ہی کا سال ہوتا ہے جس سے بین الاقوامی تعلقات میں بے شمار سہولتیں ہیں، اسی طرح کچھ حرج نہ ہوگا اگر سکوں کے وزن کو بھی ساری دنیا میں برابر کردیا جائے۔ اور بٹہ دن کے رواج کو مسدود کردیا جائے۔ اکسچینج کے مناقشوں سے جو نتائج کاروباری دنیا کو آئے دن بھگتنے پڑتے ہیں خصوصاً محکوم قوموں کے ساتھ حاکم قومیں اس باب میں جو سلوک کررہی ہیں وہ علمائے معاشیات سے مخفی نہیں ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ حیثیت پیغمبر عالم ہونے کے دنیا سے آپ کا یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ علمائے معاشیات اس کے فوائد و ثمرات اور اس کی موجودہ شکل کے نقصانات واضح کریں۔

اس مسئلہ کے سوا بھی فقہائے اسلام کو تجارت، اجارہ وغیرہ کے ابواب میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے اور اور اسلامی قانون کے بعض دقیق پہلوؤں سے ان کا تعلق ہے۔ اگر تفصیل کی جائیگی تو چھوٹی سی ایک مستقل کتاب اس کے لئے درکار ہوگی۔ اس لئے چند اشارات پر کفایت کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے ذیل میں ان مسئلوں کی تحقیق آپ کو اسلامی قانون کے مباحث میں ملیں گے

(۱) فطری اور مصنوعی سکوں میں کیا فرق ہے۔ یہ مانا گیا ہے کہ سونا اور چاندی یہی دھات ہے جسے قدرت نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مبادلات کے معیار کو قائم رکھے بعض وجوہ بھی اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان دونوں دھاتوں کے سوا اور بھی دوسری چیزوں کو بطور سکہ کے استعمال کیا جاسکتا ہے مثلاً فلوس (یعنی تانبے کے پیسے) لیکن ان کے سکہ ہونے کی حیثیت آیا پبلک کے ہاتھ میں ہے یا معاملہ کے فریقین پر اس کا دارومدار ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے۔ اس کی بحث کچھ آئندہ بھی آرہی ہے۔

(۲) ہر وہ چیز جو بطور سکہ استعمال ہوتی ہو غیر متعین ہوجاتی ہے یعنی معاملہ میں اگر خاص سکہ کو دکھا کر معاملہ کیا جائے لیکن ادا کرنے کے وقت بجائے اس کے دوسرا سکہ دیا جائے تو جائز ہے۔ اس کلیہ کا یعنی سکہ غیر متعین ہوتا ہے بے شمار تجارتی مسائل پر ان کا اثر پڑتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۳) سکوں کے متعلقات یعنی (ریزگاری، اٹھنی، چونّی، دونّی) جس کو اصطلاحاً دراہم "مکسّرہ" کہتے ہیں مسئلوں کی جو ایک مستقل بحث ہے۔ چیز کا دام مثلاً سو روپیہ طے ہوا اور کوئی شخص سو روپے کے پیسے یا اکنیاں دونیاں دے تو کیا یہ جائز ہوسکتا ہے۔

(۴) چاندی سونے کے ایسے سکے جن میں کسی دوسری دھات کی آمیزش ہو ان کے احکام کا بھی ایک سلسلہ ان کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ الغطارفہ والعدالیہ اسی قسم کے سکوں کے نام ہیں۔ سود کے باب میں بعض عجیب نتائج ان سکوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں صاحب ہدایہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ومشائخنا رحمهم الله لم يفتوا بجواز ذلك (كتاب الصرف)

ہمارے بزرگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا

وجہ یہ لکھی ہے کہ

فلو ابيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا۔ (كتاب الصرف)

اگر ان معاملات میں زیادہ گیری کی اجازت دیدی جائے گی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ "جواز" کی بعض قانونی شکلیں پیدا ہورہی ہیں۔ لیکن اس خوف سے کہ سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ علماء ان سوراخوں کو بھی بند کرتے تھے، جن سے معاشی رگوں میں ایسے زہریلے خون کے داخل ہو جانے کا اندیشہ ہوتا، آج یہ حال ہے کہ ربوا کی صریح اور واضح بلکہ بین الاقوامی شکلوں تک کے متعلق بعض علماء نے جواز کی کوشش کی حد یہ ہوگئی کہ قرض ہی کے سود کے متعلق ایک بڑے عالم صاحب نے فتویٰ دیا کہ قرآن نے اس کو حرام نہیں کیا ہے بلکہ عرب کے کسی گمنام مبادلے سے اس حکم کا تعلق ہے۔ عربی میں کتاب لکھی گئی اور علماء کی خدمت میں پیش ہوئی، فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۵) کھوٹے کھرے اور آمیزش کے اعتبار سے سکوں کے متعلق ایک اور اصطلاح بھی ہے یعنی بعضوں کو زیوف (یہ خاص کر ان کھوٹے سکوں کو کہتے ہیں جنھیں حکومت کا خزانہ مسترد کرتے) البہرجہ (ایسے سکے جنھیں کاروباری لوگ بیوپار میں لینے سے انکار کرتے ہوں) اسی نوعیت کے سکوں میں ایک قسم کا سکہ "الستوق" بھی تھا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ فارسی کے "سہ طاقہ" کا معرب ہے اوپر نیچے تو چاندی کا پتر چڑھایا جاتا تھا اور بیچ میں تانبا بھر دیا جاتا تھا، یہ المموہ (قلعی کئے ہوئے سکوں) سے ایک الگ چیز تھی۔ مختلف قانونی ابواب میں ان کے نام آتے ہیں اور معاملات کے لحاظ سے ان پر حکم لگایا گیا ہے۔

باقی اس زمانے میں معنوی زر کی ایک شکل جو نوٹ کی پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مغربی تمدن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے لیکن جہاں تک تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ابن بطوطہ نے

؎ جیسے ستوق کو سہ طاقہ کا معرب کہتے ہیں "تہبرجہ" بھی کیا ہندوستان کے "نبھرجا" لفظ کی کوئی بگڑی ہوئی صورت ہے کیونکہ "نبھنے" کی اصلی ہندی شکل "نبھنا" اور "جیلانا" ہے۔ تحقیقت کے معنی میں اس وقت اصل ہندی [illegible] مادہ اب تک باقی ہے، ہندوستان اور قدیم عرب کے تجارتی تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب [illegible] اسلام کے بعد عربی سندھ کا نام ہی باب الہند تھا اور دارمی جو حدیث کی معتبر کتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں ایک محلہ ہی دار الہند کے نام سے موسوم تھا ۱۲

لکھا ہے؎ میں بجنسہ اس کے الفاظ ترجمہ کے ساتھ نقل کرتا ہوں،

واهل الصين لا يتبايعون بدينار ولا درهم وجميع ما يتحصل ببلادهم من ذلك يسكبونه قطعا كما ذكرنا وانما بيعهم وشراءهم بقطع كاغذ كل قطعة منها بقدر الكف مطبوعة بطابع السلطان وتسمى الخمس والعشرون قطعة منها "بالشت" وهي بمعنى الدينار عندنا واذا تمزقت تلك الكواغذ في يد انسان حملها الى دار كدار السكة عندنا فاخذ عوضها جددا ودفع تلك ولا يعطي على ذلك اجرة ولا سواها لان الذين يتولون عملها لهم الارزاق الجارية من السلطان وقد وكل بتلك الدار امير من كبار الامراء واذا مضى الانسان الى السوق بدرهم فضة او دينار يريد شراء شيء لم يؤخذ منه ولا يلتفت اليه حتى يصرفه

اور چین کے لوگ خرید و فروخت نہ اشرفیوں سے کرتے ہیں اور نہ درہم سے اور اس ملک میں جب یہ چیزیں آتی ہیں (یعنی درہم یا اشرفیاں) تو اسے پگھلا کر ٹکڑے بنا لیتے ہیں، ان لوگوں میں باہم خرید و فروخت کا ذریعہ کاغذ کے ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑا اس کاغذ کا کف دست کے برابر ہوتا ہے اور اس پر حکومت کی مہر ہوتی ہے، ان ٹکڑوں کے پچیس کاغذوں کے مجموعہ کو بالشت کہتے ہیں، بالشت ہمارے یہاں کی اشرفی کے برابر ہے۔ جب یہ کاغذ پھٹ جاتے ہیں تو جس کے ہاتھ میں یہ پھٹا ہوا کاغذ ہوتا ہے اسے لیکر وہ ایک کوٹھی میں لے جاتا ہے یہ کسی قسم کی کوٹھی ہوتی ہے، جیسے ٹکسال ہمارے یہاں ہے اور ان پھٹے ہوئے کاغذوں کو داخل کر دیتا ہے۔ سلطنت کی طرف سے اس کو نئے کاغذ مل جاتے ہیں۔ اور اس کی کوئی اجرت اسے نہیں ادا کرنی پڑتی ہے کیونکہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہے وہ حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان مقامات کا

؎ چین کے متعلق اسی موقع پر ابن بطوطہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سونا کی اور چین والے ایندھن کا کام ایک خاص قسم کی مٹی سے لیتے ہیں جو ہاتھیوں پر لاد لاد کر شہروں میں وہ لائی جاتی ہے اسے توڑ کر کوئلے کے برابر کے ٹکڑے دیتے ہیں اور یہ جب [illegible] اتنی تیز آگ اس سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئلے کی آگ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں پھر جل جانے کے بعد بھی اس کو [illegible] لکھا ہے کہ اس کی راکھ میں [illegible] دوسرے پتھروں کا [illegible]
[illegible]

"بالشت" و يشترى به ما اراد۔	جہاں یہ کاغذ بنتا ہے اور دیا جاتا ہے تعلق بڑے بڑے امرا و حکومت سے ہے
(سفرنامہ ص ۱۹۵ ج ۲)	آدمی اگر چین کے بازار میں چاندی یا

سونے کے سکے سے کچھ خریدنا چاہے تو لوگ ان سکوں کو نہیں لیتے ہیں۔ نہ ان کی طرف توجہ کرتے ہیں جب تک کہ "بالشت" سے ان کو بدل نہ لے۔ تب جس چیز کے خریدنے کا ارادہ کرے خرید سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ابن بطوطہ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور آج کل کے نوٹوں میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے ابن بطوطہ جس زمانے کا حال چین کے متعلق بیان کر رہا ہے۔ اس وقت وہاں چنگیز خاں کی اولاد کی حکومت تھی۔ تاتاریوں کی تمام تاریخوں میں اسی بالشت کا ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل اور تاتاریوں میں زیادہ تر اسی کاغذی سکے کا رواج تھا۔

محمد تغلق کے متعلق بھی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے چمڑی سکے کو ہندوستان میں اس بادشاہ نے مروج کیا تھا۔ کیا تعجب ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں ہی سے اس خیال کو اس نے اخذ کیا ہو،

لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے جسے الکتانی نے بعض کتابوں سے نقل کیا ہے۔

ان عمر بن الخطاب كان يستعمل الورق والجلود مكان النقود المطبوعة (کتاب التراتیب الاداریہ ص ۱۲۱ ج ۱)	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورق اور چمڑے کو نقود کی جگہ ڈھلے ہوئے دھات استعمال کرتے تھے۔

پھر مشہور اسلامی شاعر ابو تمام کا ایک شعر بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے جو یہ ہے۔

الصونتاب عمر لا بل یجعل من جلودها النقد حين عز الذهب (کتاب التراتیب الاداریہ ص ۱۲۱)	کیا حضرت عمر نے اس کا حکم نہیں دیا تھا کہ اونٹ کے چمڑے کو نقدی کی جگہ استعمال کیا جائے جب سونا نایاب ہو گیا تھا۔

واللہ علم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن ویسے میرے نزدیک یہ بات محل تعجب نہیں ہو سکتی۔ چین میں جب اس کا رواج عام طور پر پایا جاتا ہے اور عرب و چین میں جو تجارتی تعلقات تھے۔ کیا بعید ہے کہ انہی تاجروں سے یہ خبر حضرت عمر تک پہنچی ہو اور بضرورت آپ نے کسی وقت اس طریقہ کو اختیار کیا ہو۔ ابو تمام کے شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت ہی کے موقعہ پر حضرت عمر نے اس کو اختیار فرمایا تھا۔ بہر حال چونکہ اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا اور نہ اس عبارت کے سوا اور کسی دوسری چیز سے اس کی تائید ہوتی ہے ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کر سکتے۔

چک کا رواج البتہ نوٹ ہی کے قریب قریب بینکوں کے چک کی جو کیفیت ہے یہ تو ابتداء اسلام یعنی عہد صحابہ و تابعین کی عام بات معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ چک دکھا کر عام بینکوں یا

سرکاری خزانے سے روپیہ برآمد کرانے کا عام رواج معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جاری تھا بلکہ خود چک کا یہ لفظ عربی کے صک کے لفظ ہی سے بنا ہے۔ اس موقعہ پر البیہقی کی ایک دلچسپ روایت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مشہور و جلیل القدر تابعی حضرت ابو وائل اس قصہ کے راوی ہیں، فرماتے ہیں۔

استعملنی ابن زیاد علی بیت المال فاتانی رجل بصك فيه أعط صاحب المطبخ ثمانمائة درهم فقلت مكانك ودخلت على ابن زياد فحدثته۔	مجھے بیت المال پر ابن زیاد (ابن ابیہ کا کوئی گورنر حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت میں مشہور نام آدمی) اس نے مقرر کیا تو میرے پاس ایک آدمی چک لے کر پہنچا جس میں تھا "باورچی خانہ کے داروغہ کو آٹھ سو درہم ادا کر دو"

میں نے اس شخص سے کہا ذرا اپنی جگہ ٹھہر جا اور میں ابن زیاد کے پاس پہنچا اس سے گفتگو کی۔

اس کے بعد اپنی پوری گفتگو انھوں نے نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں تین افسروں کے درمیان روزانہ صرف ایک بکرے کا راشن مقرر تھا اس پر بھی حضرت عمر فرماتے تھے کہ "جس مال سے روزانہ ایک بکرا لیا جائے گا وہ جلد ختم ہو جائے گا۔" ابو وائل کا مطلب یہ تھا کہ تم آٹھ سو روپے خزانے سے صرف مطبخ کے داروغہ کو دلاؤ گے تو بیت المال کا آخر انجام کیا ہوگا۔ ابو وائل فرماتے ہیں میں جب یہ کہہ چکا تو دیکھا کہ ابن زیاد مجھ سے کہہ رہا ہے۔

ضع المفاتيح واذهب حيث شئت (سنن بیہقی ص ۳۵۵ ج ۱۰)	خزانے کی کنجی رکھ دو اور جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

میری غرض اس قصے کے نقل کرنے سے "چک" کے رواج کو بتانا تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانے کے چکوں اور اس زمانے کے "چک" میں کسی قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے۔

(۶) جیسا کہ میں نے عرض کیا زر خلقی و فطری اور زر مصنوعی کی اصطلاح تو ہمارے فقہاء کے ہاں بھی مروج ہے، ہدایہ وغیرہ عام فقہ کی کتابوں میں سونے اور چاندی کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں یعنی لکونه ثمنا خلقة (فتح القدیر ص ۲۶۰ ج ۵ کتاب الصرف) جس کا مطلب یہی ہے کہ دھات کی ان دونوں قسموں کے متعلق یہی طے کیا گیا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو ثمن (دام اور قیمت ہی) بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ابن ہمام اسی کتاب الصرف میں ایک موقعہ پر لکھتے ہیں،

واعلم ان الاموال انقسم الى ثمن على كل حال وهو الدراهم والدنانير	معلوم ہونا چاہئے کہ اموال کی چند قسمیں ہیں جن میں ایک قسم تو مال کی وہ ہے جو ہر حال میں ثمن (دام) ہی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ درہم و دنانیر ہیں۔

الدراہم سے مراد چاندی کے سکے ہیں اور الدنانیر سے سونے کے، پھر آگے چل کر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

وینقسم باعتبار الاصطلاح على الثمنية وهو في الاصل سلعة فان كانت سلعة بجبلة فهي ثمن لا تتعين بالتعيين وان كانت كانت سلعة فهي سلعة كالفلوس۔ (ص ۱۱)

پھر مال کی وہی قسم جو ثمن (یعنی دام اور قیمت) کی حیثیت رکھتی ہے اس کی ایک قسم وہ بھی ہے کہ فی الحقیقت ہے تو سلعہ[1] لیکن لوگوں نے بطور ثمن اور دام کے اس کو چلانا شروع کیا ہیں جب تک وہ رائج رہتا ہے تو اس وقت وہ ثمن ہی سمجھا جائے گا یعنی معین کرنے سے معین نہ ہوگا۔ لیکن اگر رواج بند ہو جائے تو پھر وہ اصلی سلعہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جیسے الفلوس (یعنی پیسوں کا) یہی حال ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ الدراہم والدنانیر کے سوا اور جن چیزوں کو بطور سکے کے لوگ چلاتے ہیں ان کی حیثیت مصنوعی زر کی ہے۔ البتہ ایک سوال ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کو تو پبلک بطور سکے کے چلا دیتی ہے مثلاً کوڑیوں کا رواج ہندوستان میں کچھ دن پہلے اسی حیثیت سے تھا یعنی حکومت کی طرف سے یہ مقررہ سکے کی حیثیت کوڑیوں کو نہیں دی گئی تھی اور غالباً تانبے کے چوکور ٹکڑے جو انہی کوڑیوں کے ساتھ ہندوستان میں مروج تھے۔ ان کی حیثیت بھی یہی تھی یعنی حکومت سے ان کا تعلق نہیں تھا ہمارے فقہا بھی ان کو پبلک ہی کی چلائی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ شرح ہدایہ ہی میں ایک موقع پر الفلوس کے بعض احکام کا ذکر کرتے ہوئے امام محمدؒ کی طرف ان الفاظ کو منسوب کیا گیا ہے۔

الثمنية في الفلوس تثبت باصطلاح الكل۔ (ص ۲۰۰)

پیسے میں ثمن (دام) ہونے کی حیثیت کل (عام مخلوق) کی اصطلاح سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن حکومت اگر کسی سکے کو الدراہم والدنانیر کے سوا مروج کر دے تو یہ تیسری قسم سکے کی ہوگی گویا زر مصنوعی و وضعی کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تو وہ جنہیں لوگ بالخود بطور سکے کے چلاتے ہوں۔ اور دوسری قسم ان سکوں کی ہوگی جو سونے چاندی کے تو نہ ہوں لیکن حکومت نے ان کو چلایا ہو۔ بہر حال ان کی حیثیت وضعی اور مصنوعی سکے ہی کی ہوگی۔ بلکہ امام نے الفلوس کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ

۱؎ سکے سے جو چیزیں خریدی جاتی ہیں، عربی میں ان کو سلعہ کہتے ہیں مثلاً کپڑے گھوڑے وغیرہ، اردو میں کوئی خاص لفظ اس کے لئے نہیں ملا۔ اپنے درس میں طلبہ کو اس کا ترجمہ سودا یا کرتا ہوں۔ یعنی جو چیز بطور سودے کے بکتی ہے لیکن پھر بھی دل اس ترجمے سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لئے اصل عربی لفظ ترجمے میں رکھ دیا گیا۔ سلعہ ہی کو فقہا کبھی عروض کہتے ہیں یعنی علاوہ سکے کے عام طور پر استعمال اور برتنے کی چیزیں ۱۲

الفلوس في الاصل عرض وسلعة۔ (فتح القدیر ص ۲۰۰)

پیسے اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے عروض ہی ہیں (یعنی سکے ہونے کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں)

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز کا پتہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں دیا ہے یعنی لکھتا ہے

وكثيرا ما يستغنون عن جواهر الا من الكثيرة فاذا حمل احدهم على سفر طويل يستغرق نفقته عشرة الاف دينار مثلا بدلا من ان يحمل ذلك ذهبا او فضة استبدله بجوهرة او عدة جواهر ليسهل حملها في الجيب فاذا وصل الى البلد المقصود باع الجواهر وانفق ثمنها

بسا اوقات بڑی رقموں کی جگہ لوگ جواہرات سے کام لیتے تھے مثلاً کسی طویل سفر پر جاتا ہے جہاں دس ہزار رقم کے مصارف کی ضرورت ہوتی تو سونا یا چاندی کی جگہ ایک یا چند عدد جواہرات رکھ لیتے اور مقام مقصود پر پہنچ کر اسے فروخت کر کے پھر اس رقم کو صرف کرتے۔

مسلمانوں کے اس طرز عمل کو بیان کرنے کے بعد پھر خود لکھتا ہے کہ

كما يفعل الناس اليوم بحوالات المالية او البنك نوط (التمدن الاسلامی ص ۱۱۵)

جیسا کہ اس زمانے میں لوگ مالی ہنڈیاں چیکوں اور بینک کے نوٹوں سے کام چلاتے ہیں۔

لیکن اس تدبیر کے سوا بھی ایک اور طریقہ مسلمانوں میں جاری تھا جو دوسری قوموں کے میل جول سے انہوں نے بھی قبول کر لیا تھا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو سفتجہ[1] کہتے ہیں، جس کی جمع السفاتج ہے۔ غالباً یہ کسی فارسی لفظ کا معرب ہے۔ چونکہ یہ تجارتی کاروبار کی چیز تھی۔ اس لئے سفاتج التجار کے نام سے بھی اس کو موسوم کرتے ہیں اور یہ وہی ہنڈی ہے جو اب بھی دنیا میں اس لئے مروج ہے کہ روپیہ کی منتقلی میں اس سے آسانی بھی ہوتی ہے۔ نیز راستے کے خطرات سے بھی مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ ہی میں اس کا رواج ہو گیا تھا۔ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ اثر نقل کیا ہے کہ

ان عبد الله بن الزبير كان يأخذ من قوم بمكة دراهم ثم يكتب بها الى مصعب بن الزبير بالعراق فياخذونها

عبداللہ بن زبیر لوگوں سے مکہ میں درم لیتے اور مصعب بن الزبیر کے نام اس کی چٹھی لکھ کر دیتے جو عراق کے گورنر تھے اور وہ شخص اتنی رقم مصعب سے عراق پہنچ کر وصول کر لیا کرتا تھا۔

۱؎ سفتہ دراصل فارسی لفظ ہے۔ شاید ہنڈی کے کاغذ کو تہ کر کے رکھتے ہوں اس لئے سفتجہ نام ہوا۔

اسی طرح ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ درج کی ہے کہ

سئل ابن عباس عن ذلک فلم یر به باسا۔	ابن عباس سے ہنڈی کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

وروی فی ذلک ایضا عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنه (سنن بیہقی کتاب البیوع)	ہنڈی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت بیان کی گئی ہے۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے فقہاء عموماً اور حنفی فقہاء خصوصاً کیوں اس شکل کے متعلق تذبذب کا اظہار کرتے رہے؟ تذبذب کے اسباب کیا تھے؟ کیا ان کو اس کا اندیشہ تھا کہ بتدریج ہنڈی کی یہ شکل نوٹ کی صورت شاید نہ اختیار کرلے اور نوٹ کے جن نقصانات کو باوجود منافع کے آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کیا یہ خطرات ان کے سامنے آگئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ جہاں تک کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ہنڈی میں ان کو گونہ "ربوا" کی بو آتی تھی کیونکہ پہلے زمانے میں بلکہ شاید اب بھی اس میں زیادہ تر یہ کیا جاتا تھا کہ لوگ ایک شہر میں روپیہ بطور قرض کے لیتے تھے اور ہنڈی لکھ کر قرض خواہ کو دیدیتے تھے کہ وہ دوسرے شہر میں ان کے نمائندے سے وصول کرلے۔ قرض دینے والا اس ذریعے سے اپنے روپیوں کو راہ کے خطرات اور باربرداری کے مصارف سے محفوظ کرلیتا تھا گویا قرض دے کر مقروض سے نفع اٹھاتا تھا۔ گو حقیقی سود کی تو یہ شکل نہیں ہے لیکن ایک قسم کا خطراوی نفع قرض دینے والے کو ضرور پہنچتا ہے۔ چونکہ فقہاء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مشہور ہے کہ

کل قرض جر نفعا فهو ربا	ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ سود ہے۔

اس حدیث کی بناء پر "سفتجہ" کو بھی انھوں نے مکروہ قرار دیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث خواہ فقہاء میں جس درجہ بھی مشہور ہو مگر محدثین کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ اس کے راویوں میں سوار بن مصعب ایک ایسا شخص ہے جس سے حدیث روایت کرنی محدثین نے ترک کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور روایت بھی ہے جسے مشہور صحابی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے سے بیان کیا جاتا ہے یعنی حضرت سمرہ بن جندب کہتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

السفتجات حرام	ہنڈیاں حرام ہیں۔

ابن جوزی نے اس روایت کا شمار "موضوعات" میں کیا ہے اور واقعہ بھی کچھ یہی معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوت میں "سفتجہ" کے لفظ کا سراغ نہیں ملتا۔ نیز اس کے راویوں میں عمر بن موسیٰ انتہا درجہ کا غیر معتبر آدمی ہے اور یہ کرامت ان ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال روایات کی بناء پر سفتجہ کی حرمت

روایت تک کا فیصلہ مشکل ہے البتہ ربوا کے کلی قواعد کے تحت چونکہ "کل قرض جر نفعا فهو حرام" کے اصول کو عہد تابعین میں تسلیم کرلیا گیا تھا۔ جیسا کہ مشہور تابعی حضرت عطاء سے مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔ اس لئے ایسے "سفتجے" جو قرض لینے کے بعد کسی کو دیئے گئے ہوں ان کو مکروہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اپنا روپیہ کسی بینک یا سیٹھ ساہوکار کی دوکان میں جمع کردے اور بینک سے چیک لے کر یا ساہوکار سے ہنڈی لے کر دوسرے شہر میں وصول کرے یا جیسے آج کل "منی آرڈر" کا اصول ہے کہ آدمی ڈاکخانے میں روپیہ جمع کرا دیتا ہے ڈاک والے اس کے اس "منی آرڈر" کو مقام مطلوب میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کا ڈاک خانہ روپیہ ادا کردیتا ہے۔ بظاہر اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

فقہاء حتیٰ کہ حنفی فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قرض ہی روپیہ دیا جائے لیکن قرض دینے میں ہنڈی کی شرط نہ ہو اور بعد کو ہنڈی لکھدی جائے کہ اس قرض کو فلاں شہر میں فلاں شخص کو دکھا کر وصول کرلیا تو جائز ہے۔

ابن ہمام نے "الواقعات" وغیرہ فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ

ان اقرضه بغیر شرط وکتب جاز (فتح القدیر ص ۲۵۰ ج ۵)	اگر بغیر کسی شرط کے قرض دے پھر ہنڈی لکھدی جائے تو جائز ہے۔

"کفایۃ البیہقی" سے ابن ہمام ہی نے یہ جزئیہ بھی نقل کیا ہے۔

ان اقرض مطلقا ثم کتب السفتجه فلا باس به۔	اگر مطلقاً قرض دے پھر ہنڈی لکھ کردے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور جب قرض کی صورت میں بھی غیر مشروط ہونے کے بعد "سفتجہ" جائز ہے تو جہاں قرض نہ ہو وہاں اسے بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

* * *

ذیلی مباحث میں جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ "عشر" یا "چنگی" یا ہماری حکومت کی اصطلاح میں جس کا نام "کروڑگیری" ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے لیکن جرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں اس مسئلہ میں ایسا طرز تعبیر اختیار کیا ہے جس سے مغالطہ کا اندیشہ ہے مسئلہ کو صاف کرنے کے لئے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

جرجی زیدان نے اسلامی حکومتوں کی آمدنیوں کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا داخل کے سوا چند جدید چیزوں کا اضافہ "توابع الخراج" کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں اس نے معدنیات آجامات (نیستان) وغیرہ کے محصولوں کے ساتھ جن کا ذکر اپنے اپنے موقعہ پر میں کرچکا ہوں اعشار السفن (جہازوں کی چنگی) اعشار المراصد (ناکوں کی چنگی) کو بھی درج کیا ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ عام عشر کے سوا تاجر مسافروں پر اسلامی حکومتیں کوئی جدید قسم کے ٹکس

عائد کرتی تھیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہی عشر ہے جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ مسلمانوں سے دوسری چیزوں یعنی مویشی و کاشت سے "الصدقات" کے مد کا محصول بنام زکوۃ و عشر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح تجارتی اموال سے زکوۃ بحساب چالیس فی صدی وصول کی جاتی تھی۔ پھر کبھی یہ زکوۃ دکانوں سے وصول ہوتی تھی اور کبھی بری یا بحری گذرگاہوں سے۔ جب کوئی تجارتی مال گذرتا تھا اس سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اور پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلم کی دوکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے تو ان سے بجائے زکوۃ کے چالیس فی صدی کے حساب سے خراج کے طور پر محصول لیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تجار جب اسلامی علاقوں میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو قاعدہ یہ مقرر تھا جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہیں لیتی ہے۔ البتہ اگر ان کی حکومت کا طرز عمل معلوم نہ ہوتا تھا۔ مثلاً وہاں مسلمان تجارت کے لئے کبھی نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ کسی نوعیت کے ہوں، دس فی صدی کے حساب سے محصول کیا جاتا تھا لیکن غیر مسلموں سے جو یہ آمدنی ہوتی تھی اس کو خزانے میں خراج کے تنخواہ میں جمع کیا جاتا تھا۔ بخلاف مسلمانوں کے تجارتی اموال کی آمدنی "الصدقات" کے مد میں جمع ہوتی تھی کیونکہ یہ دراصل ان کے تجارتی مال کی زکوۃ ہوتی تھی قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں۔

وکل ما اخذ من المسلمین	مسلمانوں سے اعشور (کروڑگیری)
من العشور فسبیلہ سبیل	کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے
الصدقۃ وسبیل	اس کا شمار زکوۃ کی مد میں ہوگا اور
ما یوخذ من اهل الذمۃ	اسلامی حکومت کی غیر مسلم ذمی رعایا کے
واهل الحرب جمیعا سبیل	مال سے اعشور جو وصول کیا جاتا ہے
الخراج (ص ۲۰۰)	یا (غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا)

یعنی حربیوں سے جو اعشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج کی مد میں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ اموال تجارت اسلامی ملک میں کسی راستے سے آئیں بری ہوں یا بحری ان سے وہی ایک عشر جالیہ کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا جرجی زیدان کا عشر السفن عشر المراصد وغیرہ کو الگ الگ کر کے بیان کرنا ایک قسم کا مغالطہ ہے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اس کا خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ سال بھر میں ایک ہی مال پر دو دفعہ محصول وصول نہ کیا جائے مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے کروڑگیری کے عامل نے دو دفعہ محصول وصول کر لیا

عیسائی حضرت عمرؓ کے پاس سیدھا دوڑا ہوا پہنچا۔ آپؓ اس وقت بہ تقریب حج مکہ میں تھے مل کر شکایت کی۔ اس وقت آپ نے عامل کو سخت ڈانٹ کہلا بھیجی اور اس کا مال واپس دلا دیا گیا۔ مدت کے بعد یہی عیسائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا کہ

انا الشیخ النصرانی الذی	میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے
کلمتک فی زیاد۔	تم سے زیاد (عشار) کے متعلق بات کی تھی

حضرت عمرؓ نے اسی لہجے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

وانا الشیخ الحنیفی الذی	میں بھی تو وہی حنیفی بوڑھا ہوں جس نے
قضیت حاجتک (کتاب الخراج)	تیری ضرورت پوری کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ غیر ممالک کے تاجروں کے ساتھ اسلامی حکومت رواداری اور انصاف کا ایسا برتاؤ کرتی تھی کہ دور دراز ممالک کے باشندے خصوصاً سمندر پار ممالک جاتے ہوئے اب تک گھبراتے تھے عدل فاروقی کا شہرہ سن کر انہوں نے اسلامی ممالک میں پہنچ کر تجارت کرنے کی خود درخواست کی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ

ان اهل منبج قوم من اهل	منبج کے لوگ جو غیر اسلامی قلمرو کے
الحرب وراء البحر کتبوا الی عمر	باشندے تھے انہوں نے سمندر پار سے
بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ	حضرت عمرؓ کے پاس درخواست بھیجی کہ اجازت
دعنا ندخل ارضک تجارا	دیجئے کہ آپ کے ملک میں سوداگر کی حیثیت سے
وتعشرنا۔	داخل ہوں اور ہم سے بھی عشر وصول کیجئے

جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ

فقد کان عمال الیمن یاخذون	یمن کے عامل (کروڑگیری) وہاں اس
ضریبۃ من السفن التی	محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے
تمر بسواحلهم قادمۃ من الهند	جو ان کے ساحلوں پر ہندوستان سے
تحمل الاعواد المختلفۃ والمسک	آتے ہوئے گذرتے جن پر خوشبودار
والکافور والعنبر والصندل	لکڑیاں مختلف قسم کی مشک کافور
والصینی (ج ۲ ص ۱۶)	عنبر، صندل، چینی وغیرہ ہوتے۔

میرا خیال ہے کہ جرجی زیدان کو یہ مغالطہ ہوا کہ معمولی محصول "جو تجارتی اموال پر مسلم غیر مسلم ہر قسم کے سوداگروں سے لیا جاتا تھا" عشر السفن "کوئی الگ چیز تھی اس کا منشاء یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں امن و امان کی فراوانی، عام فارغ البالی و ثروت کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کے طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تجار مسلمانوں کے ملکوں میں تجارت کے لئے آتے جاتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں بڑی کافی آمدنی حکومت کو ہو جاتی تھی۔ جرجی زیدان ہی کا بیان ہے کہ

قد بلغت اعشار السفن (۱)
الواثق باللہ مالا کثیرا۔

واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں کے
محصول کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی۔

بلکہ زیدان کا خیال تو یہ ہے کہ یورپین ممالک کے تجار ابنائے جبل الطارق پر بکثرت اس محصول کے ادا کرنے کے لئے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں TARIF کا جو لفظ مغربی زبانوں میں تجارتی محصول کے لئے مستعمل ہے یہ عربی کے لفظ "طریف" جو جبل الطارق کے کسی کروڑ گیری کی چوکی کا نام تھا اس کی بگڑی ہوئی شکل ہے یا "تعریفہ" سے بگڑ بنا ہے۔ بہرحال "عشور" کے متعلق اس علم فہمی کا مجھے ازالہ مقصود تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں جرجی زیدان نے بعض نئے ناموں کے محاصل کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام "غلہ دار الضرب" ہے یعنی سرکاری ٹکسالوں میں لوگ اپنی اپنی چاندی یا سونا بھیج کر سکوں کی شکل میں ڈھلواتے تھے اور لکڑی آگ محنت وغیرہ کے معاوضہ میں فی صد ایک درہم دیا جاتا تھا جرجی زیدان کا بیان ہے کہ یہ بھی اسلامی حکومتوں کے مداخل کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ بہر صوبہ جاتی اصلاحی مرکزوں میں ٹکسال بنے ہوئے تھے مخلوق ان میں اپنے سکے ڈھلواتی تھی۔ چونکہ بمقدار کثیر سکے ڈھلتے تھے حتیٰ کہ صرف ایک شہر اندلس کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ کسی کسی سال میں ایک ایک کروڑ طلائی گنی ڈھالی جاتی تھی۔

جرجی کے قلم سے اضطراراً یہاں یہ الفاظ ٹپک پڑے ہیں،

وذلک نحو ضعفی ما تضربه دولة
الانکلیز الیوم مع ما هی فی
ابان مجدها۔

انگریزی حکومت جو اس وقت اپنی
عنفوانِ شباب میں ہے وہ سال میں جتنے
سکے ڈھالتی ہے یہ اس کا دوگنا ہے

اور پھر حیرت سے پوچھتا ہے کہ جب ایک اندلس کا یہ حال تھا تو مصر و بغداد وغیرہ امہات المدن الاسلامیہ کا اس باب میں کیا حال ہوگا۔

ظاہر ہے کہ دار الضرب کی بنیاد خلافتِ بنی امیہ کے زمانے میں باضابطہ شکل میں قائم ہوئی ورنہ اس سے پہلے عموماً اسلامی ممالک میں رومی و ایرانی سکے چلتے تھے جنہیں دینار قلہ اور درہم کسرویہ بھی کہتے تھے۔ اس لئے رعایا پر اس مزید محصول کا اضافہ عہدِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کی بات تو نہیں ہو سکتی۔

اب تک اس محصول کے متعلق کوئی تصریح مجھے اسلام کی قانونی کتابوں میں نہیں ملی البتہ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفہ کا ایک مکتوب نقل کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے والی (گورنر) عبد الحمید بن عبد الرحمٰن کو خراج کے وصول کرنے میں رعایا کے ساتھ ملائمت و نرمی کی تاکید کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ خراج کی مدمیں مندرجہ ذیل مدوں کو ہرگز رعایا سے نہ لینا

اجور الضرابین ولا اذابة الفضة

سکہ ڈھالنے والوں اور چاندی کے

ولا هدیة النیروز والمهرجان
ولا ثمن الصحف ولا اجور
الفتوح ولا اجور البیوت ولا
دراهم النکاح ولا خراج علی
علی من اسلم من اهل الارض
(کتاب الخراج ص ۸۶)

پگھلانے کی مزدوری نہ لی جائے اور نوروز
و مہرجان (غیر اسلامی تہواروں) کا ہدیہ
بھی نہ لیا جائے اور نہ کاغذ کے دام
لئے جائیں اور نہ گھروں کا ٹیکس اور نکاح
کا محاصل اسی طرح باشندوں میں جو مسلمان
ہوں ان پر بھی خراج نہ عائد ہوگا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پیشتر کے خلفاء بنی امیہ کے زمانے میں کچھ اس قسم کے نئے مصرفوں کا گذشتہ حکومتوں کی تقلید میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ "ثمن الصحف" کے مستثنیٰ کرنے کا کچھ واضح مطلب سمجھ میں نہیں آتا کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول نہ لیا جائے جیسا کہ ہماری حکومتِ آصفیہ میں اس کا اب تک رواج ہے کہ کروڑ گیری سے احتراماً علم کتابوں کی درآمد برآمد پر محصول معاف ہے یا حکومت میں جو مقدمات کا غذی مصارف کا مرافعہ رعایا سے وصول کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں عدالت کے کاغذ کی شکل میں کورٹ فیس بیچارے بے پرواہ خواہ سے وصول کی جاتی ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے اسی محصول کو معاف کر دیا تھا۔

بہرحال حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس مکتوب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناجائز ابواب میں "اجور الضرابین واجور اذابة الفضة" بھی ہے۔ اگرچہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ کاغذ سکہ بنا کر توڑنے کی بار بار جھنجھٹ سے اور کانٹے گھٹانے بدلنے وغیرہ کے دخل و فصل سے حکومت لوگوں کو مطمئن کر دیتی ہے اور اس کے صلہ میں ایک فی صدی اگر اجرت لیتی ہے تو اس کو بجائے جبایات ظلم کے "اقتراضات" میں کیوں شریک نہ کیا جائے جس کے عائد کرنے کا ذکر گذر چکا کہ حکومت کو قانوناً اختیار ہے

صرفِ دولت

حدیث من ابتغی الکسبہ کی تشریح کے بعد فیہ الفقہ کے ٹکڑے کی باب توضیح باقی رہ جاتی ہے اور اب آئندہ صفحات میں ہم اسی کے متعلق مختصر الفاظ میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گو عام مذاہب و ادیان میں مال و دولت کی بہت کچھ مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مذہب اور دنیا کی تعبیر دونوں تقریباً جیسے ایک دوسرے کے بالمقابل ہو گئے ہیں اور اسلامی مستندات میں بھی اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن مولانا روم کے مشہور شعر چیست دنیا والے نے فکر بنا پر پڑھے لکھے مسلمانوں تک اس دنیا کا صحیح مطلب پہنچا دیا ہے جس کی اسلام نے مذمت کی ہے اور وہ یہی ہے کہ اگر دولت کمانے میں آدمی خدا سے غافل نہ ہو اور اکتساب دولت کے جو قوانین کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے لگر ان قانونی جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے اور خدا کے قائم کئے ہوئے حدود سے لاپروائی نہ برتی جائے تو صرف حدیثوں میں نہیں بلکہ قرآن میں بھی

اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما۔	تمہارا مال جسے خدا نے تمہارے گزارے اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

کے عجیب و غریب جامع مانع الفاظ میں مالی قوت کی حقیقت بیان کی گئی ہے گویا حق تعالیٰ کی ذات جس طرح سموات و ارض کی قیوم ہے اسی قیومیت اور گزارے کا ایک حصہ اس عالم مجازی میں مال کو دیا گیا ہے یعنی بنی آدم کے گزارے اور قیام کا ذریعہ مال ہے، یہ قرآن کا فقرہ ہے۔

انسانیت کی ہر آرزو اور اس کی تمنائیں زیادہ تر مالی قوت ہی کے ساتھ وابستہ ہیں اس لئے بعض روایتوں میں آیا ہے کہ

الدراہم والدنانیر خواتیم اللہ فی ارضہ من جاء بخاتم مولاہ قضیت حاجتہ۔ طبرانی فی الاوسط	درہم و دنانیر (روپیہ خرچی) اللہ کی مہریں ہیں، جو اپنے مالک کی مہر لے کر آئے گا اس کی حاجت پوری ہوگی۔

قدرت کی ایک ایسی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے کہ ہم اس کے صرف کرنے میں پوری احتیاط اور بیداری سے کام لیں، اگرچہ یوں بھی قدرت نے انسانی فطرت میں مال کی حفاظت و صیانت کا جذبہ محفوظ کر دیا ہے قرآن ہی میں ہے،

واحضرت الانفس الشح	نفوس انسانی لالچ کے سامنے حاضر کی گئی ہیں۔

انسان کا یہی فطری شح (اور دولت کی لو) ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ صرفِ دولت میں لوگ اتنی لاپروائی نہیں برتتے جتنی حصولِ دولت میں عموماً برتی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ صرفِ دولت پر اسلام نے اتنی پابندیاں نہیں عائد کی ہیں جتنی حصولِ دولت میں عائد کی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی صرفِ دولت کے سلسلے میں اسلام کا جو ہدایت نامہ ہے گو وہ مختصر ہی سہی۔ تاہم جو کچھ بھی اس باب میں ہدایتیں دی گئی ہیں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عقل کی راہ سے آدمی اس وقت تک ان نکات تک نہیں پہنچا ہے۔

"صرفِ دولت" کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے چند سوالات کو رکھ لینا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس جب جائز اور قانونی ذریعے سے دولت جمع ہو گئی تو قدرتاً اس کے سامنے دو سوالات آتے ہیں یا ان کو آنا چاہئے۔

کن کن چیزوں پر اس دولت کو نہ صرف ہونا چاہئے۔ جب اس سوال کا جواب معلوم ہو جائے تب اس کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر کن چیزوں پر اس کو صرف کرنا چاہئے، اور یہی دوسرا سوال ہے گویا پہلے سلب پھر ایجاب کی تحقیق ہونی چاہئے۔

پہلے ہم سوالِ اول کو لیتے ہیں یعنی اسلام کن چیزوں پر صرفِ دولت سے آدمی کو منع کرتا ہے

تبذیر: ظاہر ہے کہ جب ہر جائز و ناجائز ذرائع سے اسلام دولت کمانے کی اجازت نہیں دیتا تو پھر ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں بھی صرفِ دولت کی وہ کیسے اجازت دے سکتا ہے بالخصوص قانوناً جن افعال و اعمال سے اسلام نے روکا ہے۔ ان راہوں پر صرفِ دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے، قرآنی آیت،

ولا تبذر تبذیرا۔	اور غلط مصارف پر ہرگز خرچ نہ کرو۔

میں صرفِ دولت کے اساسی امتناعی قانون کا اعلان کیا گیا ہے، اگرچہ عام طور پر "تبذیر" اور "اسراف" کو لوگ ہم معنی خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں لیکن جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ صرفِ دولت کے یہ دو مستقل دفعات ہیں۔ فضول خرچی کے معنی تو یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے گیہوں کی روٹی کھانا اس کے لئے بایں معنی فضول خرچی ہوئی۔ پھر کیا اسلام میں یہ جرم ہے؟ گذر چکا کہ اسلام جب زیب و زینت و رہائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے جو گیہوں کی روٹی کھاتا ہے اس کو مبذر کیسے اسلام میں قرار دیا جا سکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا

تبذیر کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

قرار دیا ہے۔ شیطان کا بھائی ہونا اور اس کی صفت کفوریت میں مبذرین کو شریک کرنا، بھلا کیا اس شخص کی قرآن منطبق کر سکتا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تبذیر کا مادہ "بذر" ہے، بذر کے معنی تخم کے ہیں، تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن صرف یہی نہیں اس کی یہ مدعا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کیا جائے بلکہ ایسی خواہشوں پر خرچ کیا جاتا ہے جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے یہاں تک تو مبذر کسان کی تشبیہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور شر کے حصول میں صرف کرتا ہے اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا قرار پایا یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل تبذیر کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسان کو دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کرنا، مثلاً شراب خوری، قمار بازی، حرام کاری، خراج ادائی وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے۔ پس تبذیر کے حقیقی معنی یہی ہیں اور اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے اپنے محل پر اس کا ذکر آئے گا عجب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں تبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے اگر دونوں ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہوتی۔ جب تبذیر کی حقیقت واضح ہو گئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت میں داخل ہے اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ ان جرائم میں سے ہر جرم پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے

ولو مدا انفقه[1] — اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے بھی

[1] تفسیر ابن عباس ص ۱۷۵ جلد ۳ بر حاشیہ در منثور ۱۲

یہیں معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے۔ حالانکہ ایسا دنیا میں کون ہے۔

تبذیر کے بعد صرفِ دولت کے متعلق اسلام میں اور بھی دو امتناعی قانون ہیں جن میں ایک کی تعبیر اسراف سے اور دوسری کی تعبیر بالباطل سے کی جاتی ہے۔ طبعی ترتیب کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ان دونوں قانونوں کی تشریح بھی اسی وقت کر دی جائے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ان دونوں قانونوں کی صحیح حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب ہم پہلے صرفِ دولت کے ایجابی سوال کے جواب کو سمجھ لیں اس لئے خلافِ ترتیب میں اس وقت ان دونوں سے الگ ہو کر دوسرے سوال کو چھیڑ دیتا ہوں جیسا کہ میں نے کہا تھا سلبی سوال کے بعد دوسرا مرتبہ ایجابی سوال کا ہے۔

کن چیزوں پر دولت کو صرف کرنا چاہئے

اسلام کے لئے یہ بڑا دلچسپ سوال ہے یعنی اس باب میں دنیا کے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے اپنے خاص نقطۂ نظر پیش کئے ہیں۔ پہلی خصوصیت تو اسلام کی اس باب میں وہی ہے جس کا ذکر مختلف طریقوں سے پہلے بھی ہو چکا ہے یعنی اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے حتیٰ کہ کھانا پینا جو آدمی چھوڑ سکتا ہو چھوڑ دے، پانی ترک کر دے، سانس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک ممکن ہو اتار سکتا ہو اتار دے گویا ان ہی چیزوں کو مذہبی جذبے کے اظہار کا ثبوت قرار دیا گیا ہے لیکن جیسا کہ میں بار بار دہراتا چلا آ رہا ہوں کہ ضرورت تو بہر حال ضرورت ہے اسلام زینت و آرائش کے حدود تک بھی جانے والوں کو مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لئے تیار ہے، ایمانی تخت پر بھی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک مل سکتی ہے۔ رسول علیہ السلام کے خلیفہ برحق بھی "الغنی" کے لقب کو اپنے لئے باعثِ فخر قرار دیتے ہیں اور یہ بات اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں، جو کچھ اب تک اس سلسلے میں کہا جا چکا ہے وہی کافی ہے۔

دوسری خصوصیت اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے بھی دو حصے کر دیئے ہیں، ایک دینی مصارف دوسرے دنیوی مصارف۔ لیکن اسلام نے اس تقسیم کو بھی حذف کر دیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جنہیں عام طور پر دنیوی مصارف میں شمار کیا جاتا ہے وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں، اسی طرح ایسے تمام مصارف جنہیں عام طور پر دینی مصارف خیال کیا جاتا ہے دنیوی بن سکتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرفِ دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ

لوگوں نے دو دفعہ ماذا ینفقون (کیا خرچ کریں) کے الفاظ میں استفسار کیا۔ اس سوال کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن نے دیا ہے وہ یہ ہے

قل ما انفقتم من خیر	کہو "خیر" سے جو کچھ تم خرچ کرو۔

یعنی "خیر" اور "نیکی" کی راہ جسے عموماً دینی مصارف بھی کہتے ہیں، اگر اس کے متعلق تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا یہ "خیر" اور خیرات ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا یہ بھی دینی خرچ ہے اور اپنے خاندان والوں مثلاً والدین یا اقربا وغیرہ پر خرچ کرنا یہ بھی "خیر" ہے۔ "خیر" کے معنی عربی میں "مال" کے بھی آتے ہیں، اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں بھی اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے،

وما تنفقوا من خیر فان الله به علیم۔	اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ کرو گے تو خدا اس سے باخبر ہے۔

یہاں "خیر" کے جو معنی یہاں مراد ہیں اس کو متعین کر دیا گیا ہے کہ "خیریت" اور "نیکی" کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے متعلق کیا جانتے ہیں، یعنی اگر تم نے اپنے اقربا اور خاندان والوں پر اس لئے خرچ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ جو بظاہر دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے دینی خرچ ہے اور یتامیٰ و مساکین پر جو تم صرف کر رہے ہو اگر اس سے خدا کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے تو گو بظاہر وہ کتنا ہی بڑا دینی صرف سمجھا جائے لیکن پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہی ہے قرآن میں تو اس کی طرف کلیاتی رنگ میں اشارہ کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر جو تفصیلات اس باب میں ارشاد فرمائے ہیں حدیث کی کتابوں میں ان کا ایک ذخیرہ پایا جاتا ہے۔

اس اصول کی تشریح میں کہ عام طور پر جسے دنیوی خرچ سمجھا جاتا ہے صرف نیت اور قصد الٰہی کی شمول سے وہ بھی دینی خرچ بن جاتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ان المسلم اذا انفق علی اهله نفقة وهو یحتسبها کانت له صدقة (بخاری و مسلم)	اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے رکھ کر خرچ کرتا ہے یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ دینی خرچ بن جاتا ہے بلکہ تمام دینی مصارف میں اس دنیوی خرچ کو برتری حاصل ہے، فرمایا جاتا ہے،

دینار انفقته فی سبیل الله ودینار انفقته فی رقبة ودینار تصدقت به علی مسکین ودینار انفقته علی اهلک اعظمها اجرا الذی انفقته علی اهلک۔ (مسلم)	وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں صرف کی اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے صدقہ کیا اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی بیوی پر صرف کی، ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر کے حساب سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا

اور بیوی بچوں کو تو خیر ایک حد تک غیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی آگے بڑھ کر ارشاد فرمایا کہ آدمی خود اپنی ذات پر جو دولت صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے،

ما اطعمت نفسک فهو لک صدقة ما اطعمت ولدک فهو لک صدقة ما اطعمت زوجک فهو لک صدقة ما اطعمت خادمک فهو لک صدقة۔	تم نے خود اپنے کو جو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے جو بیٹے اولاد کو کھلایا یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور اپنی بیوی کو جو کھلاؤ یہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "احتساب" (یعنی حق تعالیٰ کی مرضی مبارک کو اپنے دھیان میں سامنے رکھ کر) تبذیر کے سوا دولت کے تمام مصارف "صدقہ" اور دینی خرچ ہیں، گویا مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا ایک مصداق یہ بھی ہے لیکن "صدقہ" کے باب میں "احتساب" کا مفہوم کتنا وسیع ہے اس کے سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے مسند احمد کی اس حدیث کو رکھ لینا چاہیے جس میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ

مباضعتک اهلک صدقة	تیرا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونا یہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ نے اس پر سوال کیا کہ

انصیب شهوتنا ونوجر	ہم اپنی خواہش بھی پوری کرتے ہیں اور ثواب بھی دیا جائے!

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا

لو وضعته فی غیر حقه کان علیه وزر	تم سمجھتے ہو کہ اگر اس خواہش کو بے موقع تم پوری کرتے تو کیا اس کا گناہ تم کو نہ ہوتا۔

ابوذرؓ نے فرمایا بلی (کیوں نہیں)، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "احتساب" کے اس

معنی کو بیان فرمایا جس کے بعد تقریباً ہر مسلمان کا جائز فعل صدقہ بن جاتا ہے ارشاد ہوا کہ

تحتسبون بالسیئة ولا تحتسبون بالخیر۔
تم لوگ برائی کا احتساب کرتے ہو لیکن نیکی کا احتساب نہیں کرتے۔

"الغرض" اپنے مال کو حرام میں نہ استعمال کرکے جو خود اپنے اور اپنے عیال یا خاندان پر خرچ کرے گا یہ سارے مصارف "صدقہ" اور دینی مصارف میں شمار ہوں گے۔

ریاء الناس: لیکن ٹھیک جس طرح دنیوی مصارف "احتساب" کے قانون کی بنا پر دینی مصارف بن جاتے ہیں، بجنسہ ہمارے تمام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنی "تبذیر" کے تحت داخل ہو جاتے ہیں، یہ کیسے ہوتا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

والذین ینفقون اموالھم رئاء الناس ولا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا۔
جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو دکھا کر اور نہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا بہت برا ساتھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے۔ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ "الناس" (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روز جزا ہے بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، ٹولے، بستی یا شہر، ملک یا دنیا میں نام آوری حاصل کرنا، اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا اس شخص کے ساتھ وہی بربود غلط طاقت یعنی شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر اسی طریقے سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ اسی ریاء الناس والے خرچ کے متعلق ارشاد ہے کہ

مثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدا لا یقدرون علی شیء مما کسبوا واللہ لا یھدی القوم الکافرین
(آل عمران)
اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر گرد ہو، اور اس پر بارش برسے پھر اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر قابو نہیں رکھتے اور ناشکروں کو خدا ہدایت نہیں کرتا

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات بڑے پیمانے پر منانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی نمود و نمائش کا

اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گزوں اور ناشیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو اپنے لڑکے کی ختنہ یا شادی کی یاد شو نستا چاہتے ہیں، خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے، تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل "الناس" کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یا اپنے تمام مصارف خواہ بظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک ورکس میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کی رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی مصارف کی ان دو قسموں کو ختم کرکے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے، اسلام نے جہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف و میلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جاتا ہے۔ یہی "ریاء الناس" والا قانون ہے، عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان میں دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں، اسی جذبہ کی رعایت ہے جس کا سراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دولت مندوں کو پھٹے اور برے حال میں دیکھ کر دریافت فرمایا کہ

الک مال (کیا تمہارے پاس مال ہے) جواب میں کہا گیا نعم (ہاں) آپ نے فرمایا من ای المال (کس قسم کے اموال تمہارے پاس) جواب ملا من کل المال (ہر قسم کا مال، مثلاً اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سب ہی کچھ ہیں) اس شخص نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

فاذا اتاک اللہ مالا فلیر اثر نعمة اللہ علیک وکرامتہ
(نسائی)
جب خدا نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور جو تمہیں سرفراز کیا ہے وہ دکھایا جائے۔

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو انسان ہی کو دکھایا جائے گا جس کے معنی یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیئے اس کا حکم ہے، لیکن برائی کی تصحیح کے لئے احتساب کا ایک پہلو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت و نعمت کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمائش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور ریا ان میں بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا، اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا اسی نقطہ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ

ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ۔ (ترمذی) — اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے بندے پر دیکھیں۔

گویا انسان کو یہ دکھانا، انسان کو دکھانا نہیں ہے بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے کہ وہی اس کو پسند فرماتا ہے کہ جن پر اپنی نعمتیں نازل کروں وہ دوسروں کو یہ دکھائیں کہ ہمارے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ وہی انما الاعمال بالنیات کے قانون سے "ریا" انسان میں جیسا [illegible] شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور اندر سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ یوم تبلی السرائر[1] ہی کے دن ہوگا کیا اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

خیرات اور صدقات | بہر حال دولت کے مصارف میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہی ہے کہ اس نے دینی و دنیوی دو قسم کے مصارف کا باب حذف کر دیا، اور اب باب صرف دنیوی مصرف دولت کا رہ گیا ہے یا صرف دینی کا اور "صدقہ" کی وسعت دامانی کا حال جب یہ ہے کہ ناجائز مصارف سے بچا کر جائز مصارف میں خرچ کرنا بھی اسلام میں خیرات اور صدقہ ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان کا شاید کوئی جائز خرچ ایسا نہیں نکل سکتا جو خیرات اور صدقہ کی مد میں داخل ہو کر دینی خرچ نہ بن جاتا ہو البتہ ان دینی مصارف میں پھر اسلام نے ایک ترتیب قائم کی ہے۔

سب سے پہلا حق تو آدمی کو خود اپنا ہے اور اسی لئے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی اپنے کو قتل کر دے یا اپنے کسی عضو کو ضائع کرے یا بگاڑ دے حتیٰ کہ اسلامی قانون کی رو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا پینا اس حد تک چھوڑ بیٹھے کہ اس کی جان باقی نہ رہے یا اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے زیلعی میں ہے،

ھلاک النفس او العضو — جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی

[1] جس دن دلوں کے بھید نمایاں کئے جائیں گے ۱۲

بالامتناع عن المباح حرام۔ (شامی ص ۲۱۶ ج ۵) — جان ضائع کرنی یا کسی عضو کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

بہر حال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مروی ہے۔

اذا کان احدکم فقیرا فلیبدأ بنفسہ (مغنی ص ۲۰۰) — تم میں جو کوئی نادار مفلس ہو تو چاہیئے کہ خرچ کی ابتدا خود اپنی ذات سے کرے۔

دوسری حدیث ہے۔

ابدأ بنفسک ثم بمن تعول۔ (المغنی ص) — پہلے اپنی ذات سے شروع کرو پھر ان پر جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ میرے پاس ایک اشرفی ہے کیا کروں، پہلا جواب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ

تصدق بہ علی نفسک۔ — اپنی ذات پر اسے خیرات کرو یعنی خرچ کرو۔

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے اس کے بعد ان لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے مشہور حدیث ہے

وابدأ بمن تعول۔ (صحاح ستہ) — شروع کرو خرچ کرنا ان لوگوں سے جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔

فقہا نے اس سلسلہ میں بیوی بچے اور ان کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

ان لوگوں کے بعد پھر ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو فقیر ہوں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ

اجمع اھل العلم علی ان نفقۃ الوالدین الفقیرین الذین لا کسب لھما ولا مال واجبۃ فی مال الولد۔ — علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے نادار والدین جن کی نہ کمائی ہو اور نہ ان کے پاس مال ہو، ان کا خرچ اولاد کے مال پر واجب ہے۔

والدین کے مصارف قانونی طور پر تو اسی وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں یعنی حکومت مجبور کر کے لڑکے کے مال سے والدین کے مصارف کی پابجائی کرے گی۔

لیکن غیر قانونی طور پر بھی حکومت جبر تو نہیں کر سکتی لیکن اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے۔ خصوصاً اس سلسلہ میں ماں کے حق کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ حسن سلوک کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امک امک امک ثم الاقرب فالاقرب۔ (ابوداؤد)

ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ ماں کے ساتھ پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو اور جو اس کے بعد۔

پھر آپؐ نے خود ہی تشریح بھی فرمائی

امک واباک واختک واخاک وادناک فادناک (حاکم)

ماں کو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو قریبی رشتہ دار کو پھر جو ان کے بعد قریب ہوں

رشتہ داروں کو غیروں پر اسلام نے کیوں ترجیح دی، اس کی وجہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر بیان فرمائی کہ ایسی صورت میں

له اجران اجر القرابة واجر الصدقة۔ (بخاری ومسلم)

دینے والے کو دو ثواب حاصل ہوتے ہیں رشتہ داری کا ثواب اور صدقہ کا ثواب۔

الغرض یوں ہی درجہ بدرجہ مصارف کا استحقاق آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس میں بھی اسلام نے انسان کی فطرت کے ایک خاص میلان کا لحاظ رکھا ہے۔ یوں تو لوگ دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں لیکن مختلف تعلقات اور مؤثرات کے تحت آدمی کا میلان زیادہ تر اپنے رشتہ داروں ہی کی طرف ہوتا ہے۔ مگر خدا جانے دنیا والوں نے یہ کیسے سمجھ رکھا تھا کہ اپنوں پر خرچ کرنا تو خود غرضی ہوئی اور خود غرضی کے بعد نیکی کہاں؟

اسلام نے صلہ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا تھا، نقطۂ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات وصدقات میں شریک کر دیا۔ اور یہ ایسا نظم ہے کہ ہر شخص بآسانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ان اسلامی ذمہ داریوں کا احساس اگر کرنے لگیں تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔

بہر کیف یہ تو صرف دولت کی ایک تنظیمی ترتیب ہے، اس سلسلہ میں بعض مصارف تو فرض ہیں جیسے اپنے بیوی بچوں اور والدین کے مصارف جب وہ فقیر ہوں۔ اس طرح قریبی بھائی بہن وغیرہ بلکہ دور کے رشتہ داروں کے مصارف بھی بعض حالات میں آدمی پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر نصاب کا آدمی مالک ہو تو پھر اسلام نے ہر شخص کے مال میں فقراء، غرباء، غارمین، مقروضین وغیرہ کا جو حق قائم کیا ہے جس کی تفصیل حکومت کی آمدنی میں گزر چکی ہے۔ ان مصارف کا شمار بھی فرائض میں ہے۔ فرائض کے ادا کرنے کے بعد اسلام نے آدمی کو اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنے مال سے اور بھی خرچ کر سکتا ہے، یہی مقام ہے جہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک خرچ کر سکتا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے آدمی کو اس معاملہ میں بہت

دور تک آزادی دے رکھی ہے بلکہ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر کر کے

لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما آتاه الله۔

وسعت وگنجائش والوں کو چاہیے کہ اپنی گنجائش کے لحاظ سے خرچ کریں، اور جس کی روزی تنگ کر دی گئی ہے چاہیے کہ جو کچھ اسے خدا نے دے رکھا ہے اس سے خرچ کرے۔

گویا اس اصول کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اپنے مصارف کے مدارج آمدنی کی حیثیت سے رکھنی چاہیے یہی بات ہے جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا کی نعمت کسی پر ہو تو چاہیے کہ نعمت کے اثر کو اپنے اوپر دکھائے (جیسا کہ گزر چکا) لیکن کیا اس سلسلہ میں اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے کہ کیا ایک مسلمان کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سارے مال و منال زمین و جائداد کو کھا پی کر برابر کر دے۔ گزشتہ ابواب میں اس حدیث کے ایک ٹکڑے کا ذکر آچکا ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی برتتے تھے تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گزر گیا تب مجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ راوی کا بیان ہے،

لو اصابته لاوجعته او لعقرته

اگر اس پر پڑ جاتا تو اسے دکھ پہنچتا یا زخمی ہو جاتا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے وہ مشہور فقرہ استعمال فرمایا

خیر الصدقة ما کان عن ظهر غنی۔

سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات میں کیا گیا ہے۔

میں اپنی اس بحث کو اسی مسئلہ پر ختم کرنا چاہتا ہوں، بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا

ماذا ینفقون

کتنا خرچ کریں مسلمان

کا سوال پوچھا گیا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا

قل العفو

کہہ کہ "العفو"۔

یعنی "عفو" خرچ کریں، یہ "عفو" کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا۔ پہلے دوسری آیتوں کو بھی نقل کر لوں۔ سورۂ اسرائیل میں ارشاد ہے

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی	اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ ڈالو
عنقک ولا تبسطہا کل البسط	اور نہ اس کو ایسا کھول کر بالکل کھل جائے
فتقعد ملوما محسورا۔	کیونکہ اگر ایسا کرو گے تو بیٹھ جاؤ گے اس

حال میں کہ لوگوں کی ملامت کے نشانہ بنے ہوئے ہو اور درماندہ ہو۔

پھر سورۃ الفرقان میں ہے

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا	جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے
ولم یقتروا وکان بین	ہیں اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ ہوتا ہے
ذلک قواما۔	خرچ ان کا درمیان ان دونوں باتوں

کے اندازہ کے ساتھ۔

عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ "العفو" کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو بآسانی ہو سکے اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں "اعتدال" کی فہمائش کی گئی ہے۔ امام رازی اور ان کے سوا بھی عموماً العفو کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق

ما یفضل عن حاجۃ الانسان	آدمی کی ذات اور اہل و عیال کی ضرورت
فی نفسہ وعیالہ۔	سے بچ جائے۔

یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال و زیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کر دو۔

مگر ابھی حدیث گذر چکی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ سونے کے ڈلے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ

خیر الصدقۃ ما کان عن	بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی
ظہر غنی (البخاری)	پشت پناہی میں ہو۔

مشہور شارح حدیث امام خطابی "ظہر غنی" کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں۔

ای عن غنی یعتمد علیہ و	یعنی ایسی تونگری جس پر بھروسہ
یستظہر بہ علی النوائب التی	کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی
تنوبہ۔	حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب

مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں

خیر الصدقۃ ما ابقت	بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی
غنی۔	تونگری کو باقی رکھے۔

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ "صدقہ" یا "انفاق" یا "خرچ" کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصائب پیش آنے میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ یستظہر بہ (یعنی جس سے پشت پناہی حاصل کر سکے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماسوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے کہ آدمی کل البسط کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں بیٹھ کر ذلیل و رسوا، تنگ و درماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے، حدیث میں بھی حضور نے یہی فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلاتا پھرے۔"

سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی گذر چکی جب ان کو رسول اللہؐ نے کل مال کے صدقہ سے منع فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں کا ذریعہ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت و مزدوری نوکری کر کے زندگی گذارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ اگر روزانہ جو کچھ کمائے خرچ کر دے تو چونکہ دوسرے دن یا دوسرے مہینے اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے اس لئے اس کو تو شاید کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے لیکن اول الذکر طبقہ اگر "العفو" کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا گیا ہے اپنی پونجی یا زمین و مکان و باغ کو بھی ختم کر دے، کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد اس کا سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے تو کیا اس کو دوسرے دن ملوم و محسور ہو کر اسے بیٹھنا نہ پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے "العفو" کا مطلب یہی ہے جو واحدی سے امام رازی نے نقل کیا ہے کہ

اصل العفو فی اللغۃ الزیادۃ	"العفو" کے معنی لغت میں زیادتی کے ہیں
قال اللہ تعالی خذ العفو	اللہ تعالی فرماتا ہے کہ لوگوں سے "العفو"
ای الزیادۃ وقال ایضا حتی	یعنی زیادتی لے، نیز ارشاد باری ہے حتیٰ عفوا
عفوا ای کثروا	یعنی اس قوم کے لوگ جب خوب بڑھ گئے اور بہت ہو گئے

مطلب یہ ہے کہ گذشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گذر بسر کسی "سرمایہ" یا "جائداد" "زمین" "مکانات" وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہیے جو شغل اصل کے منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ "العفو" یا (الزیادۃ) کی حد سے آگے نہ بڑھیں یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں کہ ان کا یہی خرچ عن ظہر غنی ہو سکتا ہے۔

مشہور امام لغت الفراء سے منقول ہے،

قولہ تعالیٰ قل العفو وھو فضل المال۔ (لسان العرب)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قل العفو اس سے مراد المال (سرمایہ) فضل یا بڑھوتری ہے۔

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "العفو" مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

او اعفی قتل بعد اخذ الدیۃ — دیت (خون بہا) لینے کے بعد لینے والوں نے عفو نہ کیا۔

پھر "اعفیٰ" کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں،

ای الاکثر مالہ ولا استغنی — یعنی اس کا مال زیادہ ہے اور بہت خوشحال ہے

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "سرمایہ" کی آمدنی یا "اصل" کے "منافع" کو "العفو" کہتے ہیں پس اس قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں ادائے فرائض کے بعد عام مصارف و انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ حتی الوسع اصل کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا یبارک فی ثمن ارض ولا دار لا یجعل فی ارض ولا دار (مسند احمد)

برکت دے اللہ اس زمین اور اس گھر کی قیمت میں جو پھر زمین یا گھر ہی میں نہ لگا دی جائے۔

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں،

من باع دارا او عقارا فلم یجعل ثمنہ فی مثلہ کان قمنا ان لا یبارک فیہ۔

جو شخص کوئی گھر یا جائداد جب فروخت کرے اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنی گھر یا جائداد کے خریدنے میں نہ لگا دے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے۔

یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب "الخراج" میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

لا یبارک فی ثمن ارض او دار الا یجعل فی ارض او دار

نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین یا گھر ہی میں لگا دیا جائے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو "اصل" کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہئے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیل مقام یا اور کسی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے بھی تو چاہئے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو "اصل" کا کام دے سکیں۔ یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہوا جن کے مال میں "الاصل" اور "العفو" کی صورت بھی پیدا ہو سکے

باقی جن کی گذر اوقات کسی "اصل" کی آمدنی پر نہیں ہے مثلاً ملازم پیشہ لوگ جیسا مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ان کو اپنے مصارف میں کس قانون کی پابندی کرنی چاہئیے اسی کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی آیت

لا تجعل یدک الیٰ عنقک ولا تبسطھا کل البسط۔

نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن اور نہ کھول اس کو پورے طور پر کھول دینا

اور سورۂ "الفرقان" کی آیت

الذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما۔

جو لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ہوتی ہے (خرچ) ان کے درمیان "قوام"۔

"قواما" کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنی قاف کے زیر کی صورت میں اس کا ترجمہ "وسطاً عدلاً"[1] کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لاستقامۃ الطرفین۔ — چونکہ دونوں پہلو اس میں سیدھے ہوتے ہیں

اور "قوام" قاف کے زیر سے اس کا ترجمہ

مایقام بہ الحاجۃ لا یفضل عنھا۔ — جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور قدر حاجت سے نہ بڑھے۔

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہئیے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر شخص کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے زندگی میں تو یہ کرتے ہیں اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی "اصل" نہیں ہے بجز ان کے اختیار تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے اور یہی کیا گیا ہے۔

—— ✦ ——

[1] ٹیک اور معتدل ۱۲

کتب قصص و اسلامی حکایات وغیرہ

کتاب	تفصیل	مصنف	
قصص القرآن	کامل چار جلد، مولانا حفظ الرحمٰن — تمام قصص اور انبیاء علیہم السلام کی سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مستند تاریخ و تفسیر پر محققانہ کتاب	چار حصے مجلد اعلیٰ	
قصص الانبیاءؑ	حضرت آدم سے لے کر آنحضرتؐ و خلفائے راشدین و ائمہ اربعہ کے حالات		
قصص الانبیاءؑ	(انگریزی) مندرجہ بالا کتاب کا انگریزی ترجمہ		
حیاۃ الصحابہؓ	صحابہؓ کے حالات میں تبلیغی جماعت کی مشہور کتاب		
حضرت تھانویؒ کے پسندیدہ واقعات	حضرت تھانوی کے ہی ارشاد حکایات سے جمع کردہ مولانا محمد عبدالغنی		
لطائف علمیہ ترجمہ کتاب الاذکیا	ذہانت جنگل ... اور ... کی دلچسپ کتاب، امام ابن جوزیؒ		
ارواح ثلاثہ جدید	شاہ ولی اللہ کے خاندان اور علمائے دیوبند کی دلچسپ حکایات۔	مولانا اشرف علیؒ	
حکایات صحابہؓ	صحابہؓ کی سچی اور مستند دلچسپ حکایات۔	مولانا محمد زکریاؒ	
علمی کشکول	علمی اخلاقی تاریخی دلچسپ مضامین۔ مجلد	مفتی محمد شفیعؒ	
فسانۂ آدمؑ	حضرت آدم و حوا علیہ السلام کا سچا دلچسپ قرآنی قصہ	حافظ محمد اسحاق دہلویؒ	
جلوہ طور	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سچا قرآنی دلچسپ قصہ	〃 〃 〃	
داستانِ یوسفؑ	حضرت یوسفؑ اور زلیخا کا سچا قرآنی دلچسپ قصہ	〃 〃 〃	
تاج سلیمانیؑ	مشہور پیغمبر حضرت سلیمانؑ و ملکہ بلقیس کا سچا قصہ	〃 〃 〃	
ملتِ ابراہیمؑ	مشہور پیغمبر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیل کا سچا قصہ	〃 〃 〃	
معجزاتِ مسیحؑ	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سچا قصہ اور معجزات	〃 〃 〃	
معراج رسولؐ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ	〃 〃 〃	
صبرِ ایوبؑ	حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کا دلچسپ سچا قصہ	〃 〃 〃	
طوفانِ نوحؑ	مشہور پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کا دلچسپ سچا قصہ	〃 〃 〃	
قصہ یونسؑ	مشہور پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کا دلچسپ سچا قصہ	〃 〃 〃	
قصہ جرجیسؑ	حضرت جرجیس پیغمبر کا دلچسپ سچا قصہ	〃 〃 〃	
قصہ اصحاب کہف	ان دینداروں کا قصہ جو کئی سو سال تک غار میں سوتے رہے	〃 〃 〃	
موت کا منظر	شداد اور اس کی جنت اور عبرتناک انجام	〃 〃 〃	
بستانِ اولیاء کامل	اولیاء اللہ اور مقبول بندوں کے دلچسپ حالات	〃 〃 〃	
روز محشر	میدان حشر جنت دوزخ حساب کتاب کا قصہ	〃 〃 〃	
شہادت حسنینؓ	حضرت حسین و حسن رضی اللہ عنہم کے حالات	〃 〃 〃	
عشق الٰہی	اللہ تعالیٰ سے عشق کے اولیاء اللہ کے حالات	〃 〃 〃	
نیکی بدی	نیکی و بدی کے متعلق دلچسپ کتاب	〃 〃 〃	
آنحضرتؐ کے تین سو معجزات	آنحضرتؐ کے تین سو معجزات قرآن و حدیث سے۔	مولانا احمد سعید	
مسلمان فاتحین	تاریخ اسلام کے مشہور واقعات	احمد مصطفیٰ صدیقی راہی	

بہت کتب ... کی فہرست طلب فرمائیں — **دارالاشاعت** اردو بازار کراچی؁ فون ۲۱۳۷۶۸